واقعۂ کربلا

اور اس کا پس منظر

ایک نئے مطالعے کی روشنی میں

جدید ایڈیشن اہم اضافوں اور ضروری ترمیمات کے ساتھ

مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی

الفرقان بکڈپو ۳۱۔ نیا گاؤں مغربی (نظیر آباد) لکھنؤ۔ انڈیا ۲۲۶۰۱۸

واقعۂ کربلا

اور اس کا پس منظر

ایک نئے مطالعے کی روشنی میں

جدید ایڈیشن اہم اضافوں اور ضروری ترمیمات کے ساتھ

مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی

الفرقان بکڈپو ۳۱ نیا گاؤں مغربی نظیر آباد لکھنؤ

(حقوق طبع محفوظ ہیں)

پانچواں ایڈیشن ——— ۲۰۰۸ء
صفحات ——— ۳۱۶
کتابت ——— مولانا عبدالسمیع
کمپیوٹر کمپوزنگ ——— پرنٹ لائن کمپیوٹرس، لکھنؤ
طباعت ——— کاکوری آفسیٹ پریس، لکھنؤ
ناشر ——— الفرقان بکڈپو، نظیر آباد لکھنؤ

قیمت: -/۸۵ روپے صرف

یہ کتاب درج ذیل پتہ سے بھی حاصل کی جاسکتی ہے
FURQAN PUBLICATIONS
80B HANLEY ROAD
LONDON N4 3DW (U.K.)

انتساب

والد ماجد حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ کے نام

جن کے

فیضِ قلب و نظر کے لئے

میری ساری زندگی ممنون ہے

اور

اسی فیض کا اثر میری نظر میں یہ کتاب بھی ہے

جو انھیں کے ارشاد کی تعمیل میں لکھی گئی۔

فہرست

واقعہ کربلا اور اس کا پس منظر

عنوانات صفحہ نمبر

دیباچہ طبع سوم ۱
مکاتیب گرامی ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب (پیرس) ۷
دیباچہ طبع دوم ۹
افتتاحیہ از والد ماجد حضرت مولانا نعمانیؒ ۱۱
بچپن کی باتیں ۱۱
سنبھل کے ڈھول ۱۲
عشرۂ محرم کے معمولات ۱۲
ہمارے گھر کی مجلس ۱۳
کچھ اپنا رونا رلانا ۱۳
تبدیلی کا آغاز ۱۴
شہرت عام کی تاثیر ۱۵
الفرقان ۳۷ھ کا مضمون ۱۶
یہ کتاب ۱۷
مقدمہ (از مصنف) ۱۹
تاریخی روایتوں کا حال اور اس کی مثال ۲۱
طبری کا اپنا اعتراف ۲۲
پھر کونسی بات بعید ہے ۲۳
کربلا کے واقعہ میں غلط بیانی کے اسباب ۲۴
کام مشکل بھی اور ضروری بھی ۲۵
ایک ناگزیر ضمنی بحث ۲۶
اصلی بات جو کہنا تھی ۲۹
سنی معاشرے پر شیعیت کے اثرات ۳۰
حضورؐ کی قرابت کا احترام یا عصمت کا عقیدہ ۳۱
بے انصافی کی ایک مثال ۳۲
لکیر کی فقیری یا طلب علم و تحقیق ۳۴
مومن کا معیار اور اس کی ذمہ داری ۳۷
اس کام کی ضرورت ۳۹
کچھ حوالوں کے سلسلہ میں ۴۰
تشکر و امتنان ۴۱

باب اول - ۱

شہادت عثمانؓ - خانہ جنگی - صلح حسنؓ ۴۳
شہادت عثمانؓ اور خانہ جنگی ۴۳
جنگ جمل اور صفین ۴۴
حضرت علیؓ کی شہادت ۴۷
حضرت حسنؓ کی خلافت ۴۷
عالی مقام بیٹا ۴۸
امن و یکجہتی کے بیس سال ۵۲
حضرت معاویہؓ اور حضرات حسنینؓ ۵۳

باب دوم - ۲

کوفی مزاج - ریشہ دوانیاں - اور حضرت حسینؓ ۶۱

اہل کوفہ ۶۱
حضرت حسینؓ کی رائے ۶۵

باب سوم - ۳
یزید کی ولیعہدی کی تجویز اور حضرت مغیرہ بن شعبہؓ ۶۹

ولیعہدی کی تجویز ۷۰
حضرت مغیرہؓ کا مقام صحابیت ۷۰
حضرت مغیرہؓ خلفائے راشدینؓ کے دور میں ۷۲
فاروقی انتظامیہ کا ایک اہم اصول اور حضرت مغیرہؓ ۷۳
حضرت مغیرہؓ کی دوسری عظمت ۷۶
بدنام کن روایت کا متن ۷۷
کچھ اور اس سے بڑھی ہوئی روایتیں ۸۰
حاصل کلام ۸۱
ایک اور پہلو ۸۲
طبری کی روایت کا سقم ۸۳
ایک اور سوال ۸۴
اور اب سند کی بات ۸۶

باب چہارم - ۴
ولیعہدی کی راہ میں زیادہ کا وجود رکاوٹ؟ ۸۷

قرین قیاس بات ۸۹
ایک اور فائدہ - ۹۱

باب پنجم - ۵
ولیعہدی کی بیعت اور مخالفین کا قصہ ۹۳

نہ صرف ابن عباسؓ بلکہ ابن ابو بکرؓ بھی ۹۴
ابن کثیر کا بیان ۹۷
طبری کی روایت ۹۸
ایک سوال اور اس کا حل ۱۰۰
وفود کی کہانی ۱۰۳
سوالیہ نشان ؟
ابن اثیر اور حضرت معاویہؓ کا سفر حجاز ۱۰۹
ایک لمحۂ فکریہ ۱۱۴
واقعہ کی قرین قیاس صورت ۱۱۷
فیصلہ کن بات ۱۲۳

باب ششم - ۶
یزید کی ولیعہدی پر حضرت معاویہ کو اصرار کیوں؟ اور دیگر حضرات کو اس سے اختلاف کیوں؟ ۱۲۵

اصرار اور اس کی بنیاد ۱۲۵
ابن خلدون کا کلام ۱۲۸
اس کلام پر ایک تنقیدی نظر ۱۳۲
اہل اختلاف کے اختلاف کی بنیاد ۱۳۷
یزید اپنے ایک خطبے کے آئینہ میں ۱۴۲
ضمیمہ - ایک اہم فائدہ ۱۴۷

باب ہفتم - ۷
حضرت امیر معاویہ کی وفات - عہد یزید کا آغاز حضرت حسینؓ کی ہجرت ۱۵۱

یزید کو معاویہؓ کی وصیت ۱۵۱
مخالفین سے بیعت کا مطالبہ ۱۵۵

اسی واقعہ کی دوسری روایت ۱۵۲
تنقیدی بحث ۱۵۵
ابو مخنف کی روایت ۱۵۹
کوفہ کو روانگی ۱۶۰
پورے کنبے کے ساتھ ۱۶۱
شاہراہ سے سفر ۱۶۲
خیرخواہوں اور عقیدت مندوں کے مشورے ۱۶۳
ایک اور روایت ۱۶۵
دونوں واقعوں کے نتیجے کا فرق ۱۶۶
باب ہشتم-۸
[illegible] ۱۶۹
مسلم بن عقیل کا مشن ۱۶۹
مسلم بن عقیل کوفہ کو ۱۷۰
والی کوفہ حضرت نعمان بن بشیر کا انجام ۱۷۱
امیر یزید کو شکایت ۱۷۱
عبید اللہ بن زیاد کا تقرر ۱۷۲
کوفے میں تقریر ۱۷۲
عملی کارروائی ۱۷۳
مسلم کی تبدیلی مکان ۱۷۳
ایک سازش ۱۷۴
ایک اور معرکہ ۱۷۵
مزید جرأت ۱۷۵
یہ کیا ہو رہا ہے؟ ۱۷۶
جناب مسلم کا انجام ۱۷۷
ہانی کی پسپائی اور مسلم بن عقیل کی بے بسی ۱۷۸
باب نہم-۹
حضرت حسینؓ کی مکہ سے روانگی ۱۸۲
حج سے ایک دن پہلے روانگی ۱۸۲
خیر خواہ ایک بار پھر روکتے ہیں ۱۸۳
۱- حضرت عبداللہ بن عمر ۱۸۳
۲- ابوبکر بن عبدالرحمٰن ۱۸۴
۳- کئی اور ناصحین ۱۸۷
عبداللہ بن جعفر کا خط ۱۸۸
والی مکہ کی طرف سے پھر روکنے کی روایت ۱۸۹
خوش کرنے کی بات ۱۹۰
ذی الحجہ ۸ ہجری ۶۰ ۱۹۰
کربلا تک کی راہ سفر
اور اہم شہادت کی روایتیں ۱۹۴
فرزدق سے ملاقات ۱۹۵
انجام حضرت مسلم کی خبر ۱۹۷
ساتھیوں کو ہدایت ۱۹۸
واپسی کا مشورہ ۱۹۹
حضرت محمد الباقر کی روایت ۲۰۰
سمت سفر کی تبدیلی اور منزل زبالہ ۲۰۱
باب دہم-۱۰
کربلا کی سرگزشت
عمر بن سعد کی آمد ۲۰۳
صلح کی بات اور ناکامی ۲۰۳

ایک دوسری روایت سے تائید ۲۰۳
جنگ اور شہادت ۲۰۶
حُر بن یزید دوسری روایات میں ۲۰۸
دونوں روایتوں میں تطبیق ۲۱۰
حُر کے کردار کی کچھ اور تفصیلات ۲۱۰
اور یوم عاشورہ کی باقی کہانی ۲۱۳
حضرت حسینؓ اور رفقاء کی تقریریں ۲۱۵
معاملہ کا ایک اور پہلو ۲۲۱
زہیر بن قین کی تقریر ۲۲۴
ایک خاص نکتہ ۲۲۶
کبھی کچھ تصنیف ۲۲۷
مبارزانہ جنگ کے قصے ۲۲۷
صبح سے سہ پہر تک کے معرکے ۲۲۸
لمبے وقت کے دامن میں لپٹے قصے ۲۳۰
دلدادان اہل بیت کے لیے تک ۲۳۲
سب سے بڑی مثال ۲۳۴
ایک تاویل کا قائل ۲۳۴
قصہ مختصر ۲۳۸
بندش آب ۲۳۹
معاملے کے کچھ اور پہلو ۲۴۰
روایت کی اندرونی شہادت ۲۴۲
اور خود راوی کے اوصاف ۲۴۳
خلاصۂ کلام ۲۴۵
روایت حضرت باقرؒ کی خطا ۲۴۶
ناقابل انکار حقیقت ۲۴۸

باب یازدہم
[illegible]

خواتین کی بے حرمتی ۲۵۰
لاش کی بے حرمتی ۲۵۲
سر کی بے حرمتی
اور باقیات قافلہ سے بدسلوکی ۲۵۲
تنقید کی ایک نظر ۲۵۳
حمید بن مسلم کے تضادات ۲۵۴
قصر یزید میں ۲۵۷
حضرت محمد الباقرؒ کی روایت اور یہ قصے ۲۵۹
امام ابن تیمیہ کا ارشاد ۲۶۳

باب دوازدہم
[illegible]

نوشتۂ تقدیر کا کردار؟ ۲۶۸
حضرت حسینؓ کا اقدام اور ابن تیمیہ ۲۶۸
ظلم کی ذمہ داری کس پر؟ ۲۷۳
ابن زیاد کو سزا کیوں نہیں دی؟ ۲۷۴
ابن زیاد کیوں بلند ہوا؟ ۲۷۶
آہ یہ بے توفیقی ۲۷۹
اختتامیہ ۲۸۱
اشاریہ ۲۹۵
کتابیات ۳۰۸

☆☆☆

دیباچہ طبع سوم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن جنوری سنہ ۱۹۹۳ء میں نکلا تھا۔ مصنف کے لیے کوئی سوال اس گمان کا نہ تھا کہ چھ مہینے کے اندر ہی دوسرے ایڈیشن کی ضرورت پیش آجائے گی۔ اس لیے دوسرا ایڈیشن جولائی سنہ ۱۹۹۳ء میں شائع ہوا تو اس میں نظر ثانی کا وہ ضروری کام بالکل نہ ہو سکا جس کے لیے کچھ مناسب مہلت درکار تھی۔ سوچ لیا گیا کہ جو کام رہ گیا ہے وہ انشاء اللہ تیسرے ایڈیشن میں ہو جائے گا جس کی ضرورت پیش آنے میں شاید زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ مگر کتاب کی منجانب اللہ مقبولیت کہ دوسرے ایڈیشن کے ساتھ ہی ساتھ مختلف مقامات پر ـــ خاص طور سے پاکستان میں ـــ لوگوں نے مصنف یا پبلشر کی اجازت کے تکلف میں پڑے بغیر ہی اپنے طور پر اس کے ایڈیشن نکال ڈالے، جن میں سے چار تو خود مصنف تک بھی پہنچے۔ اس کے بعد ظاہر ہے کہ لکھنؤ کے تیسرے ایڈیشن کی نوبت کہاں جلدی آ سکتی تھی۔ تاہم اب وہ ضرورت پیش آچکی ہے اور یہ نیا ایڈیشن اب ان تمام اضافوں اور ترمیموں کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ جن کی ضرورت مصنف نے طبع اول کے بعد کتاب پڑھ کر خود محسوس کی یا بعض حضرات کے خطوط سے یہ ضرورت محسوس ہوئی۔

ترمیمات کا حصہ تو بہت معمولی سا ہے جزوی قسم کا ہے۔ البتہ اضافوں میں ایک تو مستقل ایک باب "اختتامیہ" کے عنوان سے آخر میں بڑھایا گیا ہے۔ اس کے بعد ایک مستقل انڈکس ہے جس کی کمی خاص طور پر کتاب میں دلچسپی لینے والے اہل علم نے محسوس کی۔ ان دو مستقل اضافوں کے علاوہ باب اول اور باب دوم میں کئی صفحات کا اضافہ ہوا ہے۔ اور بعض مقامات پر حواشی

(بقیہ حاشیہ آئندہ صفحہ پر)

بڑھائے گئے ہیں۔

انسان کا کوئی کام نقائص سے سو فی صدی خالی تو کسی منزل پر بھی نہیں ہو پاتا۔ لیکن ان اضافوں اور ترمیموں کے ذریعے کوشش کی گئی ہے کہ کتاب علمی اور تحقیقی حیثیت سے مزید بہتر معیار کو پہنچے اور اپنے موضوع پر زیادہ بہتر علمی و دینی خدمت ثابت ہو۔

* * *

کتاب کی اس پذیرائی کے پہلو بہ پہلو جس کی طرف اوپر کی سطروں میں اشارہ گزرا کچھ دوسرے قسم کے تبصرے اور تاثرات بھی سامنے آئے۔ چند الفاظ اس نئی اشاعت کے موقع پر ان کے بارے میں کہنا بھی مناسب ہوگا۔

یہ کتاب جیسا کہ اس کا نام بتا رہا ہے اس چودہ سو سالہ قدیم واقعے کے بارے میں وہی باتیں دہرانے کے لیے تو ظاہر ہے نہیں لکھی گئی تھی جو باتیں مسلسل لکھی جاتی رہی ہیں اور لوگوں کو ازبر ہیں۔ نام کے اشارے کے علاوہ کتاب کے مقدمے سے اس کی ایک مختلف نوعیت کا بھرپور اظہار بھی ہوتا تھا۔ اس لیے یہ تو یقینی متوقع تھا کہ کتاب کا استدلال اور اس کا علمی اور تحقیقی انداز کتنا بھی مؤثر ہو جائے پھر بھی ایک روایتی تصور پر اگر اس سے کہیں ضرب پڑے گی تو ایسے لوگ ضرور ایک تعداد میں نکلیں گے جو ایک مخالفانہ رد عمل کا اظہار کریں، یا کم از کم کچھ چونکنے کا سا۔ چنانچہ یہ دونوں ہی باتیں سامنے آئیں۔

چونکنے کا سا اظہار کرنے والوں نے یہ تاثر دیا کہ اس میں یزید کی کچھ طرفداری نظر آتی ہے۔ یہ تاثر کتاب کی مجموعی طور پر تحسین کے ساتھ دیا گیا تھا اس لیے کچھ زیادہ ہی قابل توجہ تھا۔ لیکن نظر ثانی

[لہ] اضافہ شدہ موضوع کا خلاصہ اب اول میں دیا گیا ہے، خاص طور سے اہم مطلب تھیں ایک جنگ جمل اور جنگ صفین کا ذکر آیا تھا تفصیل بالکل نہ تھی جنگ کی کوئی تصویر کی گئی۔ دوسرے جو جلیل بڑے صحابہ حضرت علیؓ سے بیعت کر لینے کے باوجود ان جنگوں کے سلسلے میں آپ سے متفق نہ تھے کے مقابلہ میں حضرت علیؓ کے موقف کی جو صحت بالکل مبرہن ہو گئی تھی ان دونوں کو نمایاں کر کے ان اضافوں کے ذریعہ دکھایا گیا ہے اور تفتیش کی گئی ہے۔ بالخصوص میں کربلا کے مزاج کو دکھا کر کچھ تاریخی حوالوں کی روشنی سے اسے زیادہ واضح کیا گیا ہے۔ مختصر یہ کہ کتاب کا مقدمہ اور کچھ مضامین ہیں۔

کے لیے کتاب اول سے آخر تک بغور، بلکہ بار بار پڑھنے کے باوجود ہمیں کوئی لفظ اور کوئی عبارت ایسی نہ مل سکی جس میں اس تاثر کی تصدیق کا پہلو نظر آتا ہو اور اس لیے اس پر نظر ثانی کر لی جائے۔ تاثر دینے والے حضرات بھی کسی خاص مقام کی نشاندہی نہ فرما سکے۔ اس لیے ان کے اس تاثر کی بنیاد سوائے اس کے کچھ نہیں سمجھ میں آتی کہ یزید کے سلسلے میں دو باتیں جو روایتی اور تشیعی تصور کے خلاف کافی صراحت اور وضاحت سے آئی ہیں، بس وہی ان کو یہ تاثر دے گئی ہیں۔ ۱۔ یہ کہ یزید کے خلاف حضرت حسینؓ کے موقف کے سلسلے میں جو یزید کے فسق و فجور کی بات لائی جاتی ہے اس کا کوئی ثبوت حضرت حسینؓ کی زبان سے بھی نہیں ملتا۔ ۲۔ یہ کہ اس کا ثبوت بھی فی الواقع دستیاب نہیں کہ ابن زیاد نے کربلا میں جو رویہ حضرت حسینؓ کے خلاف اختیار کیا جس سے تاریخ میں کربلا کا المیہ ثبت ہو گیا، اس میں یزید کی مرضی بھی شامل تھی اور نہ اس کا کہ اس نے باقیات اہل بیت سے ان کو دمشق پہنچنے پر ناشائستہ برتاؤ بھی کیا۔ اس کی بھی روایتیں ہیں اور اس کے خلاف بھی۔

ان دونوں باتوں کے بارے میں ہم نے اپنے موقف کی ضروری وضاحت اس ایڈیشن کے آخری باب "اختتامیہ" میں کی ہے وہ ان شاء اللہ قارئین کی نظر سے گزرے گی۔ یہاں البتہ اتنی بات یاد دلانی مناسب ہوگی کہ یزید کے بارے میں ایسی عبارات بھی لکھی گئی ہے جس سے اس کی روایتی شبیہ میں فرق پڑتا ہے وہ خود ہی بے دھڑک ہو کر نہیں بلکہ واقعی معنیٰ میں "ڈرتے ڈرتے" لکھی گئی ہے چنانچہ ایسے ایک موقع پر یہ الفاظ بھی قلم سے نکل ہی گئے ہیں کہ :

> "یزید کا معاملہ اتنا نازک ہے کہ اس کے حق میں بالکل سیدھی اور معقول
> بات کہتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے۔" (ص۱۳ طبع اول)

مگر تحقیق واقعہ کی نیت سے کیے جانے والے مطالعے میں جو بات واقعی نظر آتی ہے اسے ایک فریق کے حق میں اس لیے دبا جانا کہ شاید کچھ لوگ ناراض یا بدگمان ہو جائیں، یہ کوئی ایسا معقول بات تو نہیں ہو سکتی۔ اس لیے "ڈرتے ڈرتے" بھی بات تو کہنی لازم ہو جاتی ہے۔ اور نہ ہی حضرت حسینؓ کی عزت اس پر موقوف ہے کہ یزید کے بارے میں ہر برائی آنکھ بند کر کے مان لی جائے۔

جن لوگوں نے مخالفانہ ردِ عمل ظاہر کیا ان میں سے خاص طور سے ایک کا اظہار اس بات کا ایک مثالی نمونہ تھا کہ واقعۂ کربلا کے روایتی تصور سے محبت نے ہمارے خوب اچھے پڑھے لکھے لوگوں کو بھی تبرائی تشیعیت سے کس درجہ ہم آہنگ کر دیا ہے۔ یہ ہماری ایک نامور دینی درسگاہ میں نظامِ تعلیم کی نگرانی کا منصب رکھنے والے ایک عالم و فاضل تھے، جنہوں نے اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے کتاب اور صاحبِ کتاب کو تو جو کچھ کہا وہ اپنی جگہ رہا[1] صاف صاف لکھا کہ واقعۂ کربلا بدر کی شکست کا بدلہ تھا۔ اصلی الفاظ یہ تھے:

> "…. انھوں (مصنف) نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا کہ تاریخ کا کوئی حادثہ یا واقعہ ماضی سے جدا کر کے ایک اکائی کی شکل میں نہیں دیکھا جا سکتا۔ کربلا کا واقعہ بنو امیہ اور بنو ہاشم کی دیرینہ عداوتوں کا ایک منطقی نتیجہ (CONSEQUENCE) تھا۔ وہ عداوتیں جو ظہور اسلام کے بعد بہت خاموش شکل میں ابھر کر سامنے آئیں اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ۲۳ سالہ عرصۂ نبوت میں ۱۳ سال تک جگر ماری سے ۱۰ سال تک شد و مد سے قائم رہیں غزوۂ بدر میں مسلمانوں کی کامرانی نے جس طبقہ کو سب سے زیادہ برافروختہ کیا اس کے سربراہ ابو سفیان تھے اسی طرح غزوۂ احد میں ان کا اور ان کی بیوی جگر خوار حمزہ ہند کا کردار یہ سب وہ باتیں ہیں جن میں مورخین کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔ فتح مکہ کے بعد یہ گروہ اسلام لایا یا بقول سید قطب شہید کے استسلام کیا[2] مگر اس استسلام کے بعد اچانک ایک پل میں ایسی تبدیلی ہو گئی کہ وہ بدر کا غم بھول گئے اپنی انانیت کو بھول گئے عقلاً محال بات ہے اور صحاح کی مستند روایات سے ثابت ہے کہ ہند نے بیعت کے الفاظ دہراتے ہوئے بھی اپنے اندرونی کرب و غم اور غیظ و غضب کا اظہار کیا تھا۔
>
> …………………… اسلام کے پورے طور پر فاتح ہو جانے کے بعد جب مقاومت کی تمام راہیں مسدود ہو گئی تھیں اس عرصۂ مختصر میں اس گروہ کی طرف سے

---

[1] اس کے ایک پہلو کا کچھ تذکرہ "اختتامیہ" میں آیا ہے، وہاں آپ کی نظر سے گزرے گا۔ [2] فی الواقع اسلام نہیں قبول کیا بلکہ شکست مان لی۔

> کسی واضح دشمنی کا ثبوت تاریخ میں نہیں ملتا ہے۔ مگر جس طرح انگریزوں کے دل میں صلیبی جنگوں کا غم و غصہ آج تک موجود ہے اسی طرح اس گروہ میں بدر کے انتقام کا جذبہ سینے کے اندر بھڑکتی ہوئی آگ کی طرح جوش مارتا رہا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی خلافت نے البتہ اسلام کی طرف سے ان کے عناد کو ختم کیا مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے ان کا دل صاف نہیں ہوا۔"[منہ]

اور پھر چند سطروں میں مصنف کو صحیح طریق تحقیق کا مشورہ دیتے ہوئے ان الفاظ پر اسے ختم کیا گیا ہے:

> "اس حادثہ کا سرا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بجائے انہیں غزوۂ بدر کے واقعات سے مربوط کیا جائے تو تاریخی احداث کی کڑیاں ایک دوسرے سے زیادہ پیوست نظر آئیں گی۔"[1]

اگر شیعی تبرائیت دل و دماغ پر حاوی نہ ہو چکی ہو تو آدمی اور بھی کچھ اگر نہ سوچ سکے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں! وہ لوگ جنہیں اہل سنت کے یہاں بلا شک و شبہ صحابہ اور صحابیات کا درجہ حاصل ہے ان کے بارے میں فتویٰ دے رہا ہوں کہ ان کے دل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صاف نہ تھے! کہہ رہا ہوں کہ بدر کے انتقام کی آگ ان کے سینوں میں بھڑکتی رہی تھی اور ان کے اسی جذبۂ انتقام نے کربلا کے حادثے کی شکل اختیار کر لی! ورنہ کچھ بھی آدمی اگر نہ سوچے، تب بھی غزوۂ احد کا نام قلم پر آجانے کے ساتھ تو اسے خیال آ ہی جانا چاہیے تھا کہ بدر کا انتقام تو اس دوسرے غزوے میں ان لوگوں نے حالت کفر ہی میں لے لیا تھا اور اتنا لے لیا تھا کہ کلیجہ ٹھنڈا ہو جائے!

ہم نے کتاب کے مقدمہ میں لکھا تھا کہ

> "واقعۂ کربلا سے اور جو کچھ ہوا ہو یا نہ ہوا ہو شیعیت کو اپنی دوکان چمکانے اور اپنے اثرات پھیلانے کا وہ بے پناہ موقع ملا ہے کہ کچھ کہا نہیں جاتا۔ اور اسی لیے ضرورت ہے کہ نہایت ٹھنڈے دل سے پورے معاملے کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔" (مقدمہ ص۳۲)

[منہ] گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام دو الگ الگ چیزیں ہیں۔

[1] تجلیات۔ لکھنؤ۔ ۱۰ مارچ سنہ ۱۹۹۲ء

لیکن یہ بات کہ غیبیت کے اثرات ہماری بڑی بڑی دینی درس گاہوں تک میں اس حد تک داخل ہو گئے ہیں اس کا اندازہ مقدمہ کی اس تحریر کے وقت بھی نہ تھا۔ فالی اللہ المشتکیٰ۔

* * *

مصنف کے لیے نہایت اطمینان و مسرت کا مقام ہے کہ محترم ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب (پیرس) جیسے صاحب علم و فضل نے کتاب کو اپنی دلچسپی کے اظہار سے نوازا اور بعض گراں قدر مشورے بھی مصنف کو تحریر فرمائے۔

اس قابل مسرت بات کا ذکر بطور شکر نعمت یا تحدیث نعمت طبیعت کا تقاضہ تھا۔ مگر اس کے نتیجے میں ضرور قارئین کی طبیعت کا تقاضہ ہوگا کہ ڈاکٹر صاحب زید لطفہم کی تحریر بھی اُن کے سامنے آئے۔ اس لیے اس سلسلے کے دو خط بھی نذر قارئین ہیں۔ آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیں۔[1]

عتیق الرحمٰن سنبھلی

لندن ۲۱ر اکتوبر ۹۹ء

نوٹ: گذشتہ سال بعض حلقوں میں کسی غلط فہمی سے ڈاکٹر صاحب کی خبر وفات شائع ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب بحمد اللہ تا ایں دم (۱ر۶ر۹۹) حیات ہیں۔ البتہ پیرانہ سالی کے عوارض کے ساتھ۔ قارئین سے دعائے خیر کی درخواست ہے۔

---

[1] ان دونوں خطوط کا بعینہٖ عکس شائع کیا جا رہا ہے مگر ڈاکٹر صاحب کاغذ بھی ہلکا اور بادامی رنگ کا استعمال فرماتے ہیں۔ نتیجے میں عکس اچھا نہ آسکا اسلئے متعدد الفاظ کو پڑھنے کے قابل بنانے کیلئے ہلکا سا ٹچ (TOUCH) بھی دینا پڑا۔ خاص طور سے پہلے خط میں اس کی خاص ضرورت پڑی ہے۔

مکاتیب گرامی

محترم ڈاکٹر حمید اللہ صاحب (پیرس)

(۱)

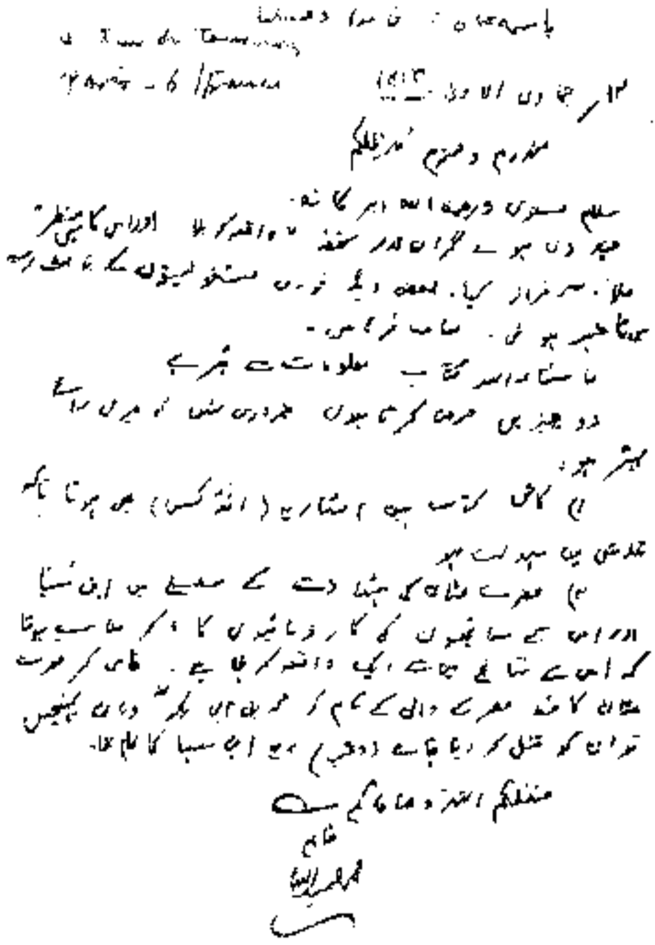

بإسمه سبحانه

4 Rue de Tournon

Paris - 6 / France

۱۴ر جمادی الاولی ۱۴۱۳ھ

مخدوم و محترم مد ظلکم

سلام مسنون و رحمۃ اللہ و برکاتہ۔

چند دن ہوئے گرامی قدر تحفہ "واقعہ کربلا اور اس کا پس منظر" ملا۔ سرفراز کیا۔ بعض دیگر فوری مشغولیتوں کے باعث رسید میں تاخیر ہو گئی۔ معاف فرمائیں۔

ما شاء اللہ بڑی محققانہ کتاب ہے معلومات سے پُر ہے

دو چیزیں عرض کرتا ہوں ممکن ہے دوسرے ایڈیشن میں بہتر ہو:

۱) کاش کتاب میں اشاریہ (انڈکس) بھی ہوتا تاکہ تلاش میں سہولت ہو

۲) حضرت عثمان کی شہادت کے سلسلے میں ابن سبا اور اس جیسے سازشیوں کی کارروائیوں کا ذکر مناسب ہوتا کہ ان سے پتا چلتا ہے ایک واقعہ کربلا ہی۔ ظاہر کرے حضرت عثمان کا خط مصر والوں کے نام کہ محمد بن ابی بکر وہاں پہنچیں تو ان کو قتل کر دیا جائے (وغیرہ) یہ ابن سبا کا کام تھا۔

حفظکم اللہ و علاکم

خادم

محمد حمید اللہ

(۲)

[illegible]

4, Rue de Tournon
Paris-6 / France

١٩٩٣/٨/١٧

مکرم محترم مدظلکم

سلام مسنون و رحمۃ اللہ و برکاتہ۔ کل یہ معلوم ہوا کہ آپ نے [illegible] کر لیا تھا جس کا نسخہ مجھے بھیج کر میری عزت افزائی فرمائی تھی۔ جزاکم اللہ احسن الجزاء۔ اب تو یہ بھی یاد نہیں کہ رسید بھیجی یا نہیں۔ میں بیمار رہا۔ تین ہفتے شفاخانے میں رہا۔ آپریشن ہوا۔ ایک جنوری کو [illegible] کہ گھر آ گیا۔ آج [illegible] ملی لیکن علاج اب تک جاری ہے۔ ان حالات میں ادب سے ملتمس ہے کہ میرا قصور معاف ہو جائے۔ آپ تو ہمیشہ ہمیشہ میرا [illegible] ادا کر رہے ہیں۔ آپ کی اہم کتاب کو بڑی دلچسپی سے شروع کیا ہے۔

کیا آپ میرے رسالے "جنگ جمل و صفین میں یہودیوں کا کردار" سے واقف ہیں؟ اگر ضرورت ہو تو اس کے انگریزی یا کسی اور ایڈیشن کا فوٹو منگا کر روانۂ خدمت کر سکوں گا۔

نیازمند
محمد حمید اللہ

دیباچہ طبعِ دوم

یہ کتاب امسال جنوری میں شائع ہوئی تھی، مصنف کسی بنیاد پر بھی یہ توقع نہیں کر سکتا تھا کہ صرف چھ ماہ کے اندر اس کے دوسرے ایڈیشن کی نوبت آجائے گی۔ یہ محض اللہ رب العزت کا کرم ہے کہ جولائی میں دوبارہ پریس کو جا رہی ہے۔

ناشرین نے مجھ سے چاہا کہ اگر پہلے ایڈیشن کی طباعت میں کچھ غلطیاں رہ گئی ہوں یا کوئی ضروری ترمیم معمولی قسم کی ہو تو اس کی فہرست انھیں مہیا کر دی جائے۔ میری نظر میں جو ایسی چیزیں آئی تھیں ان کی فہرست تیار تھی، وہ ناشرین کے حوالے کی جا رہی ہے۔ امید ہے کہ یہ دوسرا ایڈیشن ان تصحیحات اور ترمیمات کے ساتھ قارئین تک پہنچے گا۔ بعض کچھ ضروری اضافے بھی ذہن میں تھے لیکن اس وقت جو عجلت ناشرین کے پیشِ نظر ہے اس کی بنا پر یہ کام آئندہ کے لیے مؤخر رہے گا۔

شکر اور اعترافِ کرم کے ساتھ اللہ ہی سے شکوہ بھی ہے کہ ایسے لوگوں کی طرف سے کتاب کے خلاف محاذ آرائی ہوئی ہے جن کے بارے میں ادنیٰ تو کیا سادہ سی مخالفت کا اندیشہ بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ چیز جہاں رنج و الم کی ہے وہاں اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کتاب کی جو ضرورت اس کے مقدمے میں بتائی گئی تھی وہ نہ صرف واقعی تھی بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ بڑے اور وسیع درجے کی تھی جس درجے کی مقدمے میں ظاہر کی گئی تھی۔ ان شاء اللہ اس پر مزید روشنی

کتاب کے کسی اگلے ایڈیشن میں ڈالی جاسکے گی۔

والسلام!

عتیق الرحمٰن سنبھلی

یکم محرم الحرام ۱۴۱۳ھ

مطابق ۳ جولائی ۱۹۹۲ء

۱۱/۴۸ حوض رانی ایکسٹینشن۔ نئی دہلی ۱۷

افتتاحیہ

از والد ماجد حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ

یہ کتاب جیسا کہ آئندہ صفحات سے معلوم ہوگا راقم مصنف کے والد ماجد حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کی خواہش کا نتیجہ ہے کہ کتاب مکمل ہو جانے پر راقم نے گزارش کی کہ اگر مناسب خیال فرمایا جائے تو چند دعائیہ کلمات املا فرما دیئے جائیں جن سے کتاب کا آغاز ہو۔ ذیل کی املائی تحریر میری اسی خواہش کا نتیجہ ہے۔ — عتیق الرحمٰن سنبھلی

باسمہٖ سبحانہٗ وتعالیٰ — حامداً ومصلّیاً

اس عاجز (محمد منظور نعمانی) کا وطن سنبھل (مرادآباد یوپی) ہے۔ سنہ ۱۳۲۳ھ (م ۱۹۰۵ء) سن پیدائش ہے۔ سنبھل مسلمانوں کی غالب اکثریت کی بستی ہے اور یہ سب سُنّی حنفی ہیں۔ صرف ایک محلے میں جو شہر کے کسی کنارے پر ہے اور جسے میں نے آج تک دیکھا بھی نہیں ہے شیعہ صاحبان کی بھی کچھ آبادی ہے۔ یوں تو ہندوستان میں کم و بیش سبھی جگہ سُنّیوں کے اندر بھی تعزیہ داری کا رواج سرایت کیے ہوئے ہے۔ لیکن میرا خیال ہے — اور دوسرے لوگوں نے بھی اس کی تصدیق کی ہے — کہ سنبھل کے سُنّیوں میں جس شان سے عزاداری منائی جاتی ہے اس شان کی عزاداری شاید ہی کہیں اور ہوتی ہو۔

بچپن کی باتیں

مجھے ۶-۷ سال کی عمر سے پورا شعور ہو گیا تھا اور اُن چند برسوں کو چھوڑ کر جو تعلیم کے سلسلے میں باہر گزرے تقریباً تیس سال کی عمر تک زیادہ تر قیام وطن ہی میں رہا۔ ہمارا محلہ خالص سُنّی مسلمانوں کا محلہ ہے۔ اس کے اندر ۱۲-۱۵ گھروں میں تعزیے رکھے جاتے تھے، جن پر محرم کی پہلی

سے دسویں تک برابر چڑھاوے چڑھائے جاتے تھے۔ جن گھروں میں بچے کم زندہ رہتے تھے ان گھروں میں امام حسینؑ کا فقیر بنایا جاتا تھا اور ہرے کپڑے پہنائے جاتے تھے، ہمارا ننھیال اس معاملے میں بہت آگے تھا۔ ایک قریبی رشتے کے ماموں فقیرو کے نام سے مشہور تھے۔ میں بڑا ہو کر بھی ایک مدت تک یہ سمجھتا رہا کہ ان کا نام اصل میں فخرالدین یا فخرالحسن ہوگا اور فقیرو کہا جانے لگا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اصل نام تو انوار حسین ہے لیکن بچپن میں امام حسینؑ کے فقیر بنا دیے گئے تھے اسی سے فقیرو کہے جاتے ہیں۔

سنبھل کے ڈھول

سنبھل کی تعزیہ داری کی دو خصوصیتیں شاید اپنا جواب نہ رکھتی ہوں گی۔ ایک تعزیوں کی اونچائی (بعض تو تقریباً چالیس فٹ اونچے ہوتے تھے) اور دوسرے ڈھولوں کا سائز۔ بعض ڈھول تو اتنے بڑے ہوتے تھے کہ ان کے لیے گینڈے یا بھینس کی بہت بڑی کھال تلاش کرنا پڑتی تھی۔ ان میں سے بعض کے اندر سے آدمی کھڑا نکل آتا تھا اور بچے تو تقریباً سبھی ڈھولوں کے اندر سے اسی طرح نکل جاتے تھے۔ ہمارے خاص محلے میں کئی ایسے ڈھول تھے مگر ایک ڈھول جو چوک کا ڈھول کہلاتا تھا وہ ان میں سب سے بڑا تھا اور چونکہ ہمارے نانا کا مکان چوک میں واقع تھا اس لیے اس کو ہم اپنا ڈھول سمجھتے تھے اور اس پر فخر کیا کرتے تھے۔

عشرۂ محرم کے معمولات

محرم کا مہینہ آیا اور ہر ذی استطاعت گھر میں لازم ہو گیا کہ پہلی سے دسویں تک روزانہ کوئی میٹھی چیز پکے۔ عموماً میٹھے چاول یا حلوہ یا ملیدہ۔ اور مغرب کی نماز سے کچھ پہلے یا بعد میں گھر کا کوئی آدمی گھر کے دروازے پر وہ میٹھا پکوان لے کر کھڑا ہوتا اور بچوں میں تقسیم کرتا۔ روزمرہ کے اس دس روزہ عمل سے چند ہی گھر محلے میں مستثنیٰ ہوں گے، انھیں میں سے ایک ہمارا گھر بھی تھا۔ ہمارے

گھر جو کچھ ہوتا تھا اس کا ذکر آگے آئے گا۔

محلے کا ایک گھرانہ رافضیوں کا گھرانہ ہی کہلاتا تھا، اگرچہ تھے وہ سُنّی۔ ان کے یہاں امام باڑہ تھا جس میں ایک کاٹھ کا تعزیہ رہتا تھا۔ ان کے یہاں ان دس دنوں میں رات کو مجلس ہوا کرتی تھی۔ اختتامِ مجلس پر حاضرین کو قیمہ بھری ہوئی ایک (یا دو) تندوری روٹی بطور تبرک ملتی تھی۔ دس دن برابر یہ سلسلہ چلتا تھا۔ اس دس روزہ مجلس کے علاوہ کم از کم ایک دن تو اس طرح کی مجلس اکثر گھروں میں ہی ہوا کرتی تھی۔ خود ہمارے گھر میں بھی یہ مجلس ۹ اور ۱۰ کی درمیانی شب یعنی شبِ شہادت میں ہوتی تھی۔

ہمارے گھر کی مجلس

والد ماجد مرحوم تعزیہ داری کے سلسلے کی چیزوں میں تو شرکت نہیں کرتے تھے بلکہ ایک حد تک اسے صحیح بھی نہیں سمجھتے تھے، مگر ۹ محرم کو شب کی مجلس بڑے اہتمام سے کراتے تھے جیسے کہ ۱۱ یا ۱۲ ربیع الاول کو مجلسِ میلاد شریف اہتمام سے ہوتی تھی۔ میلاد میں تو مٹھائی (جلیبی یا لڈو) گھر ہی پر حلوائی بلوا کر بنوائی جاتی تھی۔ بازار سے اس موقع کے لیے مٹھائی خریدنا والد ماجد پسند نہیں فرماتے تھے اور مجلسِ شہادت کے لیے ایک بکرا خود خرید کر لاتے تھے اور اس کا پلاؤ پکوایا جاتا تھا جو اہلِ مجلس میں تبرکاً تقسیم ہوتا۔ اس ضمن میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ہمارے یہاں بکرے کے گوشت کا رواج شادیوں تک میں بھی نہ تھا، عام طور سے گائے کا گوشت ہی استعمال ہوتا تھا لیکن مجلسِ شہادت کے لیے ہمارے گھر خصوصی اہتمام برتا جاتا تھا۔ ایامِ عزا کی یہ مجلسیں ہمارے حقیقی ماموں حافظ سید احمد مرحوم اپنی پارٹی کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ ان مجلسوں کا ایک شعر اب تک یوں یاد ہے کہ ؎

خدا کے نور سے پیدا ہوئے یہ پنجتن
محمد و علی و فاطمہ حسین و حسن

کچھ اپنا رونا رُلانا

جیسا کہ اوپر عرض کر آیا ہوں، مجھے دو سال کی عمر میں پورا شعور آ گیا تھا، مجلسوں میں جو کچھ

سنتا تھا اسے سمجھتا تھا۔ واقعۂ شہادت کو سن کر خوب رویا کرتا تھا بلکہ اتنی دلچسپی اس واقعہ سے ہو گئی تھی کہ عشرۂ محرم کے علاوہ بھی جو اس دلچسپی کا خاص موسم ہوتا ہے میں نانا کے گھر جاتا اور جس کتاب سے ماموں صاحب شہادت کے واقعات پڑھا کرتے تھے اس کتاب کو لے کر پڑھتا اور روتا جاتا تھا۔

یہ بات ۹/۱۰ سال کی عمر کی ہے۔

جہاں تک یاد کرتا ہوں میرا حال یہ تھا کہ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ وغیرہ صحابہ کرام کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ دنیا کی اور اسلام کی سب سے بڑی شخصیت بس حضرت حسینؓ کو سمجھتا تھا اور سب سے بڑا خبیث یزید کو جانتا تھا۔ اس سلسلے کا ایک لطیفہ بھی ہے۔ غالباً عمر کا آٹھواں سال تھا جبکہ میں قرآن مجید ناظرہ پڑھ رہا تھا، پندرہویں پارہ میں سورۂ بنی اسرائیل کی جب وہ آیت آئی جس میں وَلَا يَزِيدُ الظَّالِمِينَ إِلَّا خَسَارًا آتا ہے تو میں نے دل میں سوچا کہ اوہ! یزید ایسا خبیث تھا کہ اللہ میاں نے اس کو ظالمین ـــــ یعنی بہت بڑا ظالم ـــــ کہا ہے۔ یہ بھی یاد ہے کہ اس پر دل میں یہ شبہ پیدا ہوا کہ حضرت حسینؓ کی شہادت کا واقعہ تو بہت بعد کا ہے قرآن مجید میں اس کا ذکر کیسے آ گیا؟ اور پھر اس کا جواب بھی دل میں یہ آ گیا کہ اللہ میاں تو سب کچھ جانتے ہیں، انھیں خبر تھی کہ یزید اتنا بڑا ظالم ہوگا اس لیے انھوں نے مسلمانوں کو پہلے ہی سے خبردار کر دیا۔

تبدیلی کا آغاز

میرے ایک قریبی رشتے کے نانا حضرت مولانا کریم بخش صاحب سنبھلیؒ تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ کے ممتاز تلامذہ میں سے تھے اور صاحب درس تھے۔ میری عمر جب ۱۵ سال ہوئی تو تعلیم کے سلسلے میں مجھے ان کے سپرد کر دیا گیا اور پھر تین سال تک جہاں وہ اپنی تدریسی ذمہ داری کے سلسلے میں رہے میں ان کے ساتھ ہی رہا۔ یہ پہلی صحبت تھی جس کی بدولت مجھے دین کی کچھ سمجھ آئی اور جو باتیں ماحول کے اثر سے خواہ مخواہ دین بن کر ذہن میں جم گئی تھیں ان کی حقیقت مجھ پر ظاہر ہوئی۔ اس کے بعد تعلیم کی تکمیل کے لیے دو سال دارالعلوم دیوبند میں رہنا نصیب ہوا۔ الحمدللہ کہ میری

تعلیم کے اس پانچ سالہ دور میں والد ماجد کے خیالات میں بہت کافی تبدیلی آ گئی۔ اب ہمارے گھر میں رسمی مجلسِ میلاد کی جگہ بیانِ سیرت آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی مجلس ہوتی تھی اور عاشورہ کی مجلس میں شہادت ناموں کے بجائے ہمارے بڑے بھائی مولوی محمد حسن صاحب مرحوم تاریخ ابن خلدون کے اردو ترجمے[1] سے واقعۂ کربلا کا بیان پڑھتے اور میں کچھ زبانی بیان کیا کرتا تھا — لیکن واقعہ کے سلسلے میں تصور وہی تھا جو سنی سنائی باتوں سے قائم ہو گیا تھا۔ کبھی خود براہِ راست تاریخی کتابوں کا مطالعہ کرکے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی تھی کہ قصے کی واقعی حقیقت کیا تھی۔

شہرتِ عام کی تاثیر

۱۳۵۳ھ (۱۹۳۴ء) میں بریلی میں قیام اختیار کرکے الفرقان جاری کیا۔ الفرقان کے ربیع الاول کے شمارہ میں اکثر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کچھ لکھا جاتا اور اس کے لیے میں سیرت اور احادیث کی کتابوں کا مطالعہ کیا کرتا تھا — لیکن واقعۂ کربلا کے سلسلے میں جہاں تک یاد ہے میرا سب سے بڑا ماخذ بس مولانا آزاد کا مضمون شہیدِ کربلا تھا جو الہلال کے فائل میں میرے پاس موجود تھا۔ اس سے زیادہ تاریخی مطالعہ کی ضرورت کبھی محسوس نہیں کی۔ یا یوں کہیے کہ شہرتِ عام کے اثر سے جو ذہن اس مسئلہ میں بن گیا تھا اُس نے یہ ضرورت محسوس ہی نہ ہونے دی اور واقعہ یہ ہے کہ شہرتِ عام ایسی بڑی طاقتور چیز ہے خواہ وہ کسی کے حق میں ہو یا کسی کے خلاف۔

اس کی ایک بہت قریبی مثال شیخ محمد بن عبد الوہاب نجدی (متوفی سنہ ۱۲۰۶ھ) اور ان کی جماعت کے بارے میں بہت سے نہایت قابلِ احترام اکابر علماءِ حق کا رویہ ہے۔ ان میں سرفہرست

---

[1] میری یاد داشت کے مطابق مترجم الہ آباد کے کوئی صاحب تھے اور انہوں نے لکھا تھا کہ اس واقعے (واقعۂ کربلا) کے بیان میں اصل کتاب (تاریخ ابن خلدون) کے اندر کچھ نہ تھا بلکہ چند صفحات خالی چھوٹے ہوئے تھے اور ترجمہ میں واقعہ کا بیان جو بہت طویل تھا مترجم نے دوسری کتابوں کی مدد سے از خود لکھا ہے۔ اب مولوی عتیق الرحمٰن نے اصل کتاب دیکھ کر بتایا ہے کہ ابن خلدون نے ۱۵ صفحات خالی چھوڑے تھے جن کی کمی کو مترجم نے ۱۵ صفحے لکھ کر پورا کیا ہے اور مترجم کا نام حکیم احمد حسین الہ آبادی مرحوم ہے۔

ہیں مکہ مکرمہ کے مشہور عالم و محدث اور محقق شیخ احمد زینی دحلانؒ۔ نیز خود ہمارے اکابر میں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ ـــ شرک و بدعت کے خلاف شیخ محمد ابن عبدالوہاب کے بے لاگ موحدانہ جہاد نے (نیز سیاسی میدان میں آل سعود کے لیے ان کی حمایت نے) مخالفانہ پروپیگنڈہ کا وہ طوفان اٹھایا کہ ہر بری سے بری بات ان کے حق میں لائق یقین بن گئی ـــ اس کی تفصیل کے لیے اس عاجز کی کتاب "شیخ محمد ابن عبدالوہاب کے خلاف پروپیگنڈہ اور علماء حق پر اس کے اثرات" دیکھی جاسکتی ہے۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ شیخ احمد زینی دحلانؒ نے اپنی کتاب "خلاصۃ الکلام" اور "الدرر السنیۃ فی رد الوہابیۃ" میں ان کی طرف ایسی باتیں منسوب کی ہیں جن کی بنیاد پر ان کو یہود و نصاریٰ وغیرہ کافروں سے بھی بدتر درجہ کا کافر قرار دینا صحیح اور برحق ہوگا۔ اور اسی طرح کی باتیں ہمارے حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنے رسالہ "رجوم المذنبین" میں تحریر فرمائی تھیں لیکن بعد میں حضرت مدنیؒ نے ایک اخباری بیان کے ذریعہ اعتراف فرمایا کہ انہوں نے "رجوم المذنبین" میں جو کچھ اس سلسلے میں لکھا تھا وہ عام شہرت ہی کی بنیاد پر لکھا تھا۔

الفرقان سنہ ۷۳ھ کا مضمون

الغرض واقعۂ کربلا کے سلسلے میں اپنا یہی پرانا ذہن چلتا رہا جو اس عام اور روایتی تصور سے بہت زیادہ مختلف نہیں تھا جس کا کچھ ذکر اوپر کی سطروں میں آیا ہے حتیٰ کہ شوال یا ذی قعدہ سنہ ۷۳ھ کی بات ہے کہ میں کسی لمبے سفر پر جانے کی تیاری کر رہا تھا جبکہ اُجین (مدھیہ پردیش) کے ایک صاحب کا خط آیا جو الفرقان کے بہت قدرداں تھے، انہوں نے لکھا تھا کہ محرم کا مہینہ آنے والا ہے اس میں الٹے سیدھے شہادت نامے پڑھے جاتے ہیں اور غلط سلط روایتیں دہرائی جاتی ہیں۔ جی چاہتا ہے الفرقان میں اس موضوع پر کوئی مستند قسم کا مضمون آجائے اور ہم کوشش کریں کہ ہمارے یہاں مجلسوں میں وہی پڑھا جانے لگے۔ میں یہ ذمہ داری مولوی عتیق الرحمٰن کے سپرد کرکے اپنے سفر پر روانہ ہوگیا تھا مولوی عتیق الرحمٰن نے واقعۂ کربلا کے عنوان سے یہ مضمون لکھا اور ذی الحجہ سنہ ۷۳ھ کے الفرقان میں شائع

ہو گیا۔ میں سفر سے واپس آیا اور یہ مضمون پڑھا تو اس کی دو باتوں کی وجہ سے تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی، غصے سے میرا دماغ کھول اٹھا۔ ان باتوں میں سے ایک یہ تھی کہ سیدنا حسینؓ کے اقدامات کے لیے بغاوت کا لفظ اس مضمون میں استعمال کیا گیا تھا۔ دوسری بات مضمون کا یہ بیان تھا کہ جب حضرت حسینؓ کوفے کے قریب پہنچ کر اس حقیقت سے آگاہ ہوئے کہ کوفے والے غداری کر گئے ہیں اور پھر یزیدی لشکر کے پہنچ جانے سے آپ کے لیے واپسی کا راستہ بھی بند رہا تو یزیدی سالار عمر بن سعد کے سامنے آپ نے تین شکلیں رکھی تھیں کہ ان میں سے کسی کو قبول کر لیا جائے جن میں سے ایک یہ تھی کہ انھیں یزید کے پاس جانے دیا جائے تاکہ وہ براہ راست اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیدیں۔"

میں یزید کو حقیقتاً بڑا ظالم خبیث اور نابکار ساری عمر سے جانتا آرہا تھا اس کی بنا پر میرے نزدیک یہ ناممکن بات تھی کہ حضرت حسینؓ ایسی پیشکش فرمائیں۔ حضرت حسینؓ کے لیے یہ بات سوچنی بھی میرے لیے محال تھی۔ میں غصہ میں اٹھا اور مولوی عتیق کے گھر کی طرف کو روانہ ہوا تاکہ ان سے باز پرس کروں کہ یہ کیا لکھ دیا ہے؟

سو قدم کے قریب چلا ہوں گا کہ لفظ بغاوت کے بارے میں یہ بات ذہن میں آئی کہ بغاوت ہر جگہ تو معیوب نہیں ہے بلکہ اگر ایک ظالمانہ اور کافرانہ نظام کے خلاف ہو تو ایک طرح کا جہاد ہے۔ آخر ۱۸۵۷ء میں ہمارے بزرگوں نے انگریزوں کے خلاف جو کچھ کیا تھا وہ بغاوت ہی تو تھی جس پر ہم آج بھی فخر کرتے ہیں۔ البتہ یزید کے ہاتھ میں ہاتھ دینے والی بات ویسی ہی ناقابل قبول رہی۔ میں اسی حال میں مولوی عتیق کے گھر پہنچا اور بڑے غصے کے ساتھ ان سے پوچھا کہ تم نے یہ بات کیسے اور کہاں سے لکھ دی؟ مولوی عتیق کے پاس اس طرح کے غصے کے کچھ خطوط پہلے ہی آچکے تھے اور وہ اس سلسلے میں ایک دوسرے مضمون کی تیاری کر چکے تھے۔ اس کے لیے انہوں نے تاریخ کی متعدد کتابوں سے عبارتیں اور حوالے نقل کر کے رکھے ہوئے تھے انھیں دیکھ کر مجھے بھی ماننا پڑ گیا کہ پھر تو غلط نہیں لکھا ہے۔

یہ کتاب اس واقعے پر تقریباً تیس سال گزر گئے تھے کہ آج سے ۸ سال پہلے جب میری

کتاب "ایرانی انقلاب امام خمینی اور شیعیت" شائع ہوئی تو بعض مخلص دوستوں نے توجہ دلائی کہ جس مقصد سے یہ کتاب لکھی ہے اسی مقصد کی خدمت کے لیے یہ بھی مفید ہوگا کہ مولوی عتیق الرحمٰن صاحب کا مضمون "واقعۂ کربلا" اور اس کے بعد کا وضاحتی مضمون بابت محرم سنہ ۸۰ھ بھی کتابی شکل میں شائع کر دیا جائے۔ میں نے اس رائے کو پسند کیا اور سنہ ۸۸ء میں جب مولوی عتیق الرحمٰن کا ہندوستان آنا ہوا تو میں نے ان سے کہا کہ وہ پرانی فائل سے اپنے وہ دونوں مضمون نکلوا کر ایک نظر ڈال لیں اور کتب خانہ الفرقان کے حوالے کر دیں۔ مگر ان کی رائے یہ ہوئی کہ اس مسئلہ پر تو اب بالکل از سر نو لکھا جانا چاہیے۔

یہ کتاب جو اس وقت آپ کے ہاتھ میں ہے اس کی اساس تو وہی سنہ ۵۹ء اور سنہ ۶۰ء کے مضامین ہیں لیکن عزیز مصنف نے اس پر نظر ثانی میں جو محنت کی ہے اس نے اسے ایک بالکل نئی چیز بنا دیا ہے۔ کتاب کے مشتملات میں سے مجھے خاص طور پر اس کے آخری باب میں آنے والے شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کے اقتباس کی بابت یہ عرض کرنا ہے کہ اس اقتباس نے خود مجھے بڑا اہم فائدہ پہنچایا ہے۔ حضرت مسلم بن عقیلؓ کی شہادت کی خبر پانے پر واپسی کے ارادے کے بعد بھی حضرت بعض برادران مسلم بن عقیلؓ کی دلداری میں حضرت حسینؓ کے سفر جاری رکھنے پر مجھے ایک خلش تھی۔ اللہ تعالیٰ شیخ الاسلام کو اور اس کتاب کے عزیز مصنف کو جزائے خیر دے کہ شیخ الاسلام کے اس اقتباس میں اس خلش کے رفع ہونے کا سامان مل گیا۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کو اپنے بندوں کے لیے نافع بنائے اور اگر اس میں کوئی بات غلط آ گئی ہو تو اس کے اثر سے بندوں کی حفاظت فرمائے نیز عزیز مصنف کو اس سے رجوع کی توفیق بخشے۔ واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل۔

مقدمہ[1]

(طبعِ اوّل)

مصحفیؔ ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ہوگا کوئی زخم
تیرے دل میں تو بڑا کام رفو کا نکلا

سنہ ۱۳۷۸ھ م سنہ ۱۹۵۹ء کی بات ہے۔ ماہنامہ الفرقان (لکھنؤ)[2] کی ترتیب و ادارت کی نئی نئی ذمہ داری اٹھائی تھی کہ ایک اجنبی کی فرمائش آئی کہ محرم کا مہینہ قریب آرہا ہے سانحۂ کربلا (شہادت حضرت حسین ابن علی رضی اللہ عنہم) کے سلسلے میں غلط سلط روایات والے شہادت نامے اس ماہ مسلمانوں میں پڑھے جاتے ہیں جن سے کتنے ہی اوہام اور خیالات و عقائد پھیلتے ہیں۔ الفرقان میں اگر ایک مستند مضمون اس موقع پر واقعۂ کربلا کے موضوع پر آجائے تو مفید ہوگا۔ غالباً یہ فرمائش الفرقان کے مدیرِ اعلیٰ میرے والد ماجد (مولانا محمد منظور نعمانی) کے نام آئی تھی۔ مجھے حکم ہوا کہ لکھو۔

والد ماجد کے کتب خانے ہی میں ایسی کتابوں کی جستجو شروع کی جن کی مدد سے یہ فرمائش پوری کی جا سکے۔ ایک مصری مصنف کی کتاب ہاتھ آئی جو بہت قابلِ اعتماد اور قابلِ بھروسہ محسوس ہوئی (نام کتاب کا یاد ہے نہ مصنف کا) اس کتاب کی روشنی میں "واقعۂ کربلا" کے عنوان سے ایک مضمون تیار کر کے ذی الحجہ ۱۳۷۸ھ اگست ۱۹۵۹ء کے الفرقان میں دے دیا گیا۔

مضمون میں کوئی بہت خاص بات نہ تھی۔ واقعے کا سادہ سا بیان تھا اور اس سلسلے میں جو فکری اور عملی بے اعتدالیاں شیعیت کے اثر سے یا اس کے ردِ عمل کے طور پر پیدا ہو گئی ہیں اُن کے سلسلے میں اپنے

---

[1] نظر ثانی کے بعد۔ [2] ماہنامہ الفرقان مصنف کے والد ماجد مولانا محمد منظور نعمانیؒ نے ۱۹۳۴ء میں ہندوستان کے مشہور شہر بریلی سے جاری کیا تھا۔ ۱۹۴۳ء میں اسکو لکھنؤ منتقل کر دیا اور آج بھی شائع ہوتا ہے۔

فہم کے مطابق نقطۂ اعتدال واضح کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ تاہم ایک بات نے اس کو "معرکہ انگیز" بنا دیا اور وہ ایک روایت تھی جس کے مطابق حضرت حسینؓ نے میدانِ کربلا میں یہ صورتِ حال دیکھ کر کہ کوفہ کے جن لوگوں کی خواہش اور باصرار دعوت پر آپ نے ادھر کا سفر کیا تھا، ان میں کتنے ہی لوگ اس فوج میں تو شریک ہیں جو آپ کے خلاف کارروائی کے لئے کوفہ کے یزیدی گورنر ابن زیاد نے بھیجی ہے مگر آپ کی حمایت کے لئے نکل کر آنے والا کوئی نہیں ہے، یزیدی فوج کے سردار عمر بن سعد کو تین باتوں کی پیشکش کی تھی جن میں سے ایک یہ بھی تھی کہ آپ کو دمشق جانے دیا جائے جہاں آپ اپنا ہاتھ یزید کے ہاتھ میں دیدیں۔

"یزید کے ہاتھ میں ہاتھ دینے والی" یہ بات بہت سے لوگوں کے لیے ناگواری کا باعث ہوئی جیسے کہ اپنی طرف سے گھڑ کر کہہ دی گئی ہو۔ چنانچہ بہت سے خطوط کچھ استعجابی اور کچھ احتجاجی، اس سلسلے میں آئے۔ اور ان کی بنا پر الفرقان کی آئندہ اشاعت میں اس مسئلے پر باقاعدہ تاریخی حوالوں کے ساتھ تفصیل سے لکھنا پڑا، جس سے یہ حقیقت بالکل بے غبار ہو گئی کہ حضرت حسینؓ کی پیشکش کے بیان میں کوئی ذرا سی بھی غلط بیانی یا بے احتیاطی نہیں تھی بلکہ یہ ایک حقیقت تھی جو شیعی اثرات کے ماتحت کچھ دبی ڈھکی چلی آ رہی تھی۔ خطوط لکھنے والے بعض حضرات نے اس دوسرے مضمون کے بعد یہ لکھ کر اپنا اخلاقی فرض بھی ادا کیا کہ بے شک تم نے حضرت حسینؓ کی پیشکش کے بیان میں کوئی بے احتیاطی یا غلط بیانی نہیں کی تھی۔

اس قصے پر ۲۲-۲۳ برس گزر گئے تھے اور مجھے آب و دانہ نے لکھنؤ سے اٹھا کر لندن میں بسا دیا تھا، گزشتہ ۸۴ء میں لکھنؤ جانا ہوا تو والد ماجد نے ان دونوں مضامین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ تمہارا مضمون "واقعۂ کربلا" کتابی شکل میں چھپ جانا چاہیے، کچھ نظرِ ثانی کی ضرورت سمجھو تو ایک نظر ڈال لو اور کتب خانہ الفرقان کے حوالے کر دو۔ مضمون پر نظر ڈالی تو محسوس ہوا کہ نئے سرے سے لکھے جانے کی ضرورت ہے۔ اس لیے کہ ۲۲ برس پہلے کے مقابلے میں اپنا علم اور اپنے خیالات دونوں بہت بدل چکے ہیں۔ مگر یہ لمبا کام ان دنوں ممکن نہ تھا۔ مناسب

وقت کے لیے موخر کرنا پڑا، حتیٰ کہ گذشتہ سال (۹۰ء) میں، والد ماجد کے ضعف و اضمحلال کی اطلاعات پر لکھنؤ کے سفر کا خیال پیدا ہوا تو یہ موخر کردہ کام بھی یاد آ گیا اور مضمون کی نئے سرے سے تسوید کے لیے تاریخ طبری وغیرہ کا مطالعہ شروع کیا۔ اس مطالعے نے اس نتیجے پر پہنچایا جس کا اظہار رسالے کے شروع میں ہوا جبکہ اس پرانے مضمون کا معاملہ کچھ تبدیل و ترمیم کے عمل کا طالب نہیں ہے بلکہ وہ جس ضرورت کے تحت لکھا گیا تھا اس کا واقعی حق ادا ہونے کے لیے تاریخ کے اس حصے کے مکمل پوسٹ مارٹم کی ضرورت ہے جو حادثۂ کربلا اور اس کے پس منظر والے واقعات کی روایتوں پر مشتمل ہے۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش کی گئی تو اس کے نتیجے میں یہ کتاب تیار ہوئی جو آپ کے ہاتھ میں ہے۔

تاریخی روایتوں کا حال اور اس کی مثال

میں نہ تاریخ کا طالب علم رہا نہ کسی اور حیثیت سے تاریخ دانی کا دعویٰ۔ بالکل ممکن ہے کہ میں نے اس مطالعے میں جو کچھ محسوس کیا اور جو نتائج نکالے وہ اہل فن کی نگاہ میں قابل اتفاق نہ ہوں۔ مگر میرا احساس بالکل اسی نوعیت کا احساس ہے جیسے کسی بدیہی چیز کا احساس ہوتا ہے اور اس نوعیت کے احساسات کو کوئی نہ رد کر سکتا ہے نہ خواہ مخواہ شک کی نگاہ سے دیکھ سکتا ہے۔ میرا احساس ہے کہ ہماری تاریخ کا ایسا نازک حصہ جس قدر احتیاط اور جس قدر احساس ذمہ داری کے ساتھ قلمبند کیے جانے کی ضرورت تھی اسی قدر بے احتیاطی اور غیر ذمہ داری یہاں کارفرما نظر آتی ہے۔ ایک مثال ملاحظہ ہو۔

طبری ج ۶ ص ۲۳۲ پر ایک روایت بتاتی ہے کہ حضرت حسینؓ کربلا میں اترے تو وہ جمعرات کا دن اور محرم سنہ ۶۱ھ کی دوسری تاریخ تھی۔ پھر ص ۲۳۷ پر ایک روایت آتی ہے کہ جمعرات کا دن اور محرم کی نو تاریخ تھی کہ مخالف لشکر کے سالار عمر بن سعد، عبید اللہ بن زیاد کے ایک فوری حکم کے ماتحت، عصر کے بعد اپنے کیمپ سے اٹھ کر حضرت حسینؓ پر چڑھائی کرنے کے لیے پہنچ گئے۔ مگر پھر مفاہمت ہو گئی اور

آئندہ صبح تک کے لیے کارروائی روک دی گئی۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد آئندہ صبح جو آئے گی تو وہ جمعہ کی صبح ہوگی۔ جب ۹ محرم کو بھی جمعرات بتائی گئی پھر ۱۰ محرم کو بھی جمعرات ہی بتائی گئی تو ۱۰ محرم کو سوائے جمعہ کے اور کوئی دن نہیں ہو سکتا۔ مگر آگے صفحہ ۲۲۶ پر دوسری صبح کو عمر بن سعد کی کارروائی یعنی اپنے لشکر کو حرکت میں لانے کا بیان آتا ہے تو ہمیں یہ الفاظ ملتے ہیں کہ:

قال فلما صلى عمر بن سعد الغداة	راوی کہتا ہے پھر جب ہفتہ کو عمر بن سعد
يوم السبت وقد بلغنا ايضاً انه	نے فجر کی نماز پڑھی ـــ اور ہمیں یہ بھی روایت
كان يوم الجمعة وكان ذالك	ملی ہے کہ وہ جمعہ کا دن تھا۔ اور وہ دن
اليوم يوم عاشوراء وخرج فيمن	عاشوراء (۱۰ محرم) کا تھا تو ابن سعد
معه من الناس،	اپنے لوگوں کو لے کر نکلا۔

فرمائیے کہ صفحہ ۲۲۲ اور صفحہ ۲۲۴ والی روایتوں کے پیشِ نظر یہ ممکن ہے جب ۹ تاریخ کو جمعرات کا دن اور پھر ۱۰ تاریخ کو جمعرات کا دن بتایا گیا ہے، کوئی شک اس طور پر صفحہ ۲۲۶ کی اس روایت کو لینے کی ہے مگر یہاں ۱۰ تاریخ کو ہفتے کا دن بتایا گیا ہے ؟

ہمیں نہیں معلوم کہ "وقد بلغنا ایضاً" "اور ہمیں یہ بھی روایت ملی ہے کہ یہ جمعہ کا دن تھا" یہ الفاظ طبری کے ہیں یا راوی کے۔ اگر راوی کے ہیں اور طبری نے کچھ کہا ہی نہیں تب تو کہنا ہی کیا؟ اور اگر راوی کے نہیں طبری کے ہیں، تب بھی ایک مورخ کی ذمہ داری کے لحاظ سے اس اندازِ کلام کو کوئی ذمہ دارانہ انداز نہیں کہا جا سکتا جس سے ۱۰ محرم کو جمعہ کا دن ایک مشکوک دن بن جاتا ہے۔ حالانکہ گذشتہ بیانات کی رو سے "قطعی جمعہ کا دن ہے" کہنے کی بات یہ تھی کہ "یہ دن ہفتے کا نہیں جمعہ کا ہونا چاہیے، اور اگر ہفتہ ہی ثابت ہے تو پھر اگلے دونوں بیانات غلط ہیں۔"

طبری کا اپنا اعتراف

یہ مثال سامنے لا کر ہم طبری کے بارے میں کوئی ایسی بات نہیں کہہ رہے ہیں کہ اگر

ان کی زندگی میں کہی جاتی تو شاید وہ کوئی صفائی دے سکتے۔ اُن کا خود اپنا اعتراف ہے کہ اُن کے قاری کو ایسی روایات مل سکتی ہیں جو کسی طرح صحیح نہ ہو سکتی ہوں، جو کسی طرح سمجھ میں نہ آسکتی ہوں۔ کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ :-

> "میں نے اس کتاب میں جو کچھ ذکر کیا ہے اس میں میرا اعتماد اپنی اطلاعات اور راویوں کے بیانات پر رہا ہے نہ کہ عقل و فکر کے نتائج پر۔ کسی قاری کو اگر میری جمع کردہ خبروں اور روایتوں میں کوئی چیز بایں وجہ ناقابلِ فہم اور ناقابلِ قبول نظر آئے کہ نہ کوئی اس کی تُک بنتی ہے نہ کوئی معنی بنتے ہیں تو اُسے جاننا چاہیے کہ ہم نے یہ سب اپنی طرف سے نہیں لکھا ہے بلکہ اگلوں سے جو بات ہمیں جس طرح پہنچی ہے ہم نے اسی طرح نقل کر دی ہے۔ (جلد اول ص ۵)

پھر کونسی بات بعید ہے؟

مؤرخ کا دامن جب اتنا وسیع ہو کر اتنی بڑی اور دور سے نظر آنے والی اعجوبگی کے ساتھ بھی، جیسی کہ مذکورہ بالا مثال میں پائی جاتی ہے۔ ایک روایت کو اس کے یہاں بے چون و چرا جگہ مل سکتی ہے تو پھر راویوں کی کون سی غلطی، مبالغہ آرائی یا غلط بیانی رہ جاتی ہے جس کی توقع ہمیں اپنے ان مؤرخین کی کتابوں میں نہیں کرنی چاہیئے؟ خاص کر کربلا کے جیسے واقعات میں کہ جن سے جذبات متعلق ہوتے ہیں، تعصبات متعلق ہوتے ہیں اور مثبت و منفی (POSITIVE & NEGATIVE) مفادات بھی متعلق ہو جاتے ہیں۔[1]

---

[1] تاریخ تو پھر تاریخ ہے کہ جس میں بہت سی گنجائشیں ہیں۔ ابن جریر کی تو تفسیر میں بھی اسی درجہ کی اعجوبہ روایتیں ایسے مقامات تک میں پائی جاتی ہیں جن میں ادنیٰ درجہ کی گنجائش نہیں مانی جا سکتی۔ سورۂ نجم کی تلاوت کے دوران میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر معاذ اللہ مشرکین کے بتوں کی تعریف والے "تلک الغرانیق العلیٰ" والے شیطانی کلمات جاری ہونے کی روایت کئی کئی سندوں سے بلا کسی تنقید و نظر کے اس تفسیر میں دی گئی ہے۔

چنانچہ اس واقعے (واقعۂ کربلا) اور اس کے پس منظر کے واقعات کے سلسلے میں جہاں بظاہر صحیح اور قابل قبول روایات موجود ہیں، وہیں نہایت منکر اور ناقابلِ قبول روایات کا بھی ڈھیر لگ گیا ہے۔ اور فی الواقع یہ صورت پیدا ہوگئی ہے کہ کسی روایت کو صحیح مانتے ہوئے بھی یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ گو عقلاً صحیح نظر آتی ہے مگر ہوسکتا ہے کہ واقعہ میں یہ بھی صحیح نہ ہو۔ روایات کی اس صورت حال کا اندازہ آپ کو آگے بڑھ کر کتاب میں ہوگا۔ خاص کر کربلا کے میدان والی روایات میں۔ اور اسی لیے ہم نے اگرچہ کچھ روایات کو عقل، عادت، حالات وماحول اور دوسرے قابلِ لحاظ پہلوؤں کی روشنی میں قابلِ قبول اور کچھ کو ناقابلِ قبول ٹھیرایا ہے۔ کچھ کو ترجیح دی ہے اور کچھ کو رد کردیا ہے، مگر جس کو صحیح ٹھیرایا ہے اور جس کو ترجیح دی اس کو بھی فی الواقع اور سو فیصد صحیح کہنے کی ذمہ داری ہم نہیں اٹھا سکتے۔ جھوٹ اور سچ اور من گھڑت روایات کی وہ آمیزش نظر آتی ہے کہ اللہ کی پناہ۔

کربلا کے واقعے میں غلط بیانی کے اسباب

اور اس کی وجہ وہی ہے کہ کربلا کا سانحہ (چاہے جس شکل میں ہوا ہو) اول تو بجائے خود بہت جذبات انگیز ہے اور پھر اس کے پیچھے سیاسی صف آرائی کی ایک لمبی (کم از کم ۲۵ سالہ) تاریخ ہے جو ناگزیر طور پر دو طرفہ تعصبات کو بھی جنم دے چکی ہے اور مفادات میں دلچسپی رکھنے والے حلقے بھی بنا چکی ہے۔ مزید کوفیوں کی جس بے وفائی اور غداری نے یہ سانحہ کرایا اس کا بھی تقاضہ ہے کہ (قبائلی رقابتوں کے ماتحت) ایک دوسرے کو الزام دینے اور اپنے آپ کو اندر سے باوفا دکھانے والی روایتیں گھڑی جائیں، خاص کر جبکہ واقعہ کے چند سال بعد ہی یزید کی وفات سے حالات نے ایک دم پلٹا کھا لیا تھا۔ پھر ان سب باتوں سے اوپر، بہت سے راویوں اور مقتل نگاروں کا وہ "شیعی" جذبہ جو اگر اس نہایت "قیمتی" موقع کو ایمانداری کی نذر کردیتا اور شیعیت کے مفاد کے لیے حسبِ ضرورت اور حسبِ استطاعت

رنگ آمیزی اور روایت آفرینی کی خدمت انجام نہ دیتا تو یہ ایک غیر فطری بات ہوتی۔ غرض ان مختلف قسم کے محرکات و عوامل نے مل کر واقعۂ کربلا اور اس کے پس منظر سے تعلق رکھنے والے واقعات کے بیان میں وہ غضب ڈھایا ہے کہ حقیقت کی یافت مشکل بن گئی۔ نہایت بے لاگ طریقے سے روایتوں کا تجزیہ کیا جائے تبھی ممکن ہے کہ صداقت تک رسائی ہوسکے۔

کام مشکل بھی اور ضروری بھی

اس قصے میں صداقت تک رسائی اور اس کا اظہار کس قدر مشکل (یعنی پُرخطر) کام ہے، اس کا اندازہ کسی اور کو ہو یا نہ ہو، اس راقم کو تو اُس وقت سے ہے جب اس موضوع پر ۱۳ سال پہلے والے مضمون میں بغیر یہ جانے ہوئے کہ کسی چھپائی گئی صداقت کا اظہار ہو رہا ہے، وہ روایت نقل کر دی گئی جس کے مطابق حضرت حسینؓ نے یہ آمادگی ظاہر کی تھی کہ:

> (الف) یا میں یزید کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیدوں پھر وہ جو مناسب سمجھے میرے اور اپنے معاملے میں فیصلہ کرے[1]

اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ اس بیان کی بنا پر یہ مضمون بڑا ہنگامہ خیز ہو گیا اور آئندہ ماہ کے الفرقان میں جب پانچ چھ کتابوں کے حوالے سے یہ بیان مدلل کر دیا گیا تب بات قابو میں آئی۔ لیکن وہ بھی صرف سچے علم دوست اور صداقت پسند لوگوں کی حد تک۔ باقی جن لوگوں کیلئے ایک تاریخی حقیقت کے مقابلے میں یہ شاعری جزو ایمان بن چکی تھی کہ:

سر داد و نداد دست در دست یزید

وہ اپنے بے دلیل ایمان پر اس کے بعد بھی قائم اور سرگرم رہے۔

---

[1] تاریخ طبری جزو ۶ صفحہ ۲۳۵۔ البدایہ والنہایہ جلد ۸ صفحہ ۱۷۰

ایک ناگزیر ضمنی بحث

اگرچہ یہ موقع کسی بحث اور تفصیل کا نہیں ہے تاہم اس اندیشے کے پیش نظر کہ آج کی ان سطروں کو پڑھ کر بھی ایسے تمام حضرات کو گرانی لاحق ہو اس قدر بات یہاں کہہ دینا مناسب معلوم ہوتی ہے کہ یزید کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے اور فیصلہ اس پر چھوڑنے کی بات طبری، ابن اثیر اور البدایہ والنہایہ وغیرہ سب کے صفحات میں اس قدر روشن حقیقت ہے کہ جو لوگ اس کے بیان پر ناراض ہوتے ہیں وہ سچائی سے ناخوش ہونے کے سوا اور کچھ نہیں کرتے۔ طبری نے اس واقعہ کی سلسلے کی سب سے پہلی روایت یہ دی ہے کہ حضرت حسینؓ نے عمر بن سعدؓ سے ملاقات کی اور کہا کہ دونوں لشکروں کو یہیں کربلا کے میدان میں چھوڑ کر ہم تم دونوں یزید کے پاس چلیں۔ مگر عمر بن سعد نے اس کو قبول کرنے سے عذر کیا، اس کے بعد طبری میں دوسری روایت ان الفاظ کے ساتھ آئی ہے:-

قال ابو مخنف واما ما حدثنا به	ابو مخنف نے کہا لیکن مجالد بن سعید
المجالد بن سعيد والصقعب بن	اور صقعب بن زہیر وغیرہ محدثین کا قول
زهير الازدي وغيرهما من المحدثين	وہ ہے جو محدثین کی جماعت کا قول ہے
فهو ما عليه جماعة المحدثين	وہ کہتے ہیں کہ حضرت حسینؓ نے کہا تھا
قالوا انه قال اختاروا مني خصالاً	کہ میری تین باتیں قبول کر دیا میں
ثلاثاً اما ان ارجع الى المكان الذي	اس جگہ کو لوٹ جاؤں جہاں سے آیا
اقبلت منه واما ان اضع يدي في	ہوں یا یزید کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے
يد يزيد بن معاوية فيرى فيما بيني	دوں پھر وہ میرے اور اپنے بارے میں
وبينه رأيه واما ان تسيروني	جو سمجھے فیصلہ کرے اور یا تم مجھے مسلمانوں
الى ثغر من ثغور المسلمين شئتم	کے کسی سرحدی مقام پر جہاں بھی تم
فاكون رجلاً من اهله لي	چاہو پہنچا دو وہاں میں وہیں کا ایک

ما لهم وعليه ما عليهم[1]	آدمی ہو کر رہوں گا جیسے وہ سب ایسا

ہیں۔

سب سے پہلی روایت بھی طبری نے ابو مخنف ہی سے لی تھی۔ اور وہ ابو مخنف نے ایک فردِ واحد، ہانی بن ثبیت کے بیان کے طور پر دی تھی، بعد ازاں یہ دوسری روایت ہی جس پر وہ محدثین کا اتفاق بتاتا ہے۔ اس کے بعد اسی ابو مخنف کی ایک تیسری روایت طبری میں آتی ہے جو حضرت حسینؓ کے قافلے کے ایک باقی ماندہ فرد اور خاندانی غلام عقبہ بن سمعان کا بیان ہے کہ میں اول سے آخر تک آپ کے ساتھ تھا۔ آپ نے کہیں کوئی اس طرح کی بات نہیں فرمائی جو لوگ بیان کرتے ہیں۔ آپ نے تو صرف یہ فرمایا تھا کہ:۔

دعونی فلأذهب فی هذه الارض	مجھے چھوڑ دو کہ کہیں بھی اس لمبی چوڑی
العریضة حتی ننظر ما یصیر	زمین میں نکل جاؤں حتیٰ کہ یہ بات صاف
امر الناس[2]	ہو کر سامنے آجائے کہ لوگ کیا فیصلہ کرتے ہیں

اور پھر چوتھی روایت اسی ابو مخنف سے (دوسری روایت کی تکمیل کے طور پر) ہے کہ عمر بن سعد سے آپ کی ملاقات (جو معاملے کے سلجھاؤ کے لیے آپ نے شروع کی تھی) تین یا چار بار ہوئی اور اس کے نتیجے میں عمر نے ابن زیاد کو خط لکھا کہ اللہ کا شکر ہے معاملات سدھرنے کی صورت نکل آئی ہے اور حسینؓ نے پیش کش کی ہے کہ

ان یرجع الی المکان الذی منه	یا تو وہ اسی جگہ کو لوٹ جائیں جہاں سے
اتی او ان نسیّره الی ثغر من	آئے تھے یا ہم ان کو مسلمانوں کے جس
ثغور المسلمین شئنا فیکون رجلاً	کسی سرحدی مقام پر چاہیں بھیج دیں اور
من المسلمین له ما لهم وعلیه	وہاں وہ ایک عام مسلمان کی طرح رہیں
ما علیهم او ان یأتی یزید	گے اور یا پھر وہ امیر المومنین یزید کے
	پاس چلے جائیں اور اپنا ہاتھ ان کے

---

[1] جزو ٦ صفحہ ٢٣٥۔ [2] ایضاً

امیر المؤمنین یزید فیضع یدہ فی	ہاتھ میں دے دیں پھر وہ ان
یدہ فیری فیما بینہ و بینہ	کے اور اپنے معاملے میں جو مناسب
رأیہ[1]	سمجھیں کریں۔

عقبہ بن سمعان کا بیان اگر اس معاملے میں مان لیا جاتا تو اس سے قضیے کی ایک بڑی گتھی حل ہو سکتی تھی۔ جو عقبہ کے بیان کے برخلاف یہ دوسرا بیان ماننے سے پیدا ہوتی ہے کہ حضرت حسینؓ نے تین باتوں کی پیش کش کی تھی، جن میں سے ایک یہ تھی کہ وہ یزید کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دینے کو تیار ہیں۔ اس بیان کو ماننے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر ابن زیاد کو کیا مصیبت آئی تھی کہ خود اپنے ہاتھ میں ہاتھ دینے کا مطالبہ کرکے بے ضرورت قتال کی صورت پیدا کی؟ تاریخ کی روایات میں اس کا صرف ایک جواب ملتا ہے کہ شمر بن ذی الجوشن نے چڑھا دیا (طبری ص۲۳۵) مگر یہ کوئی اطمینان بخش جواب نہیں ہے۔ ابن زیاد کوئی ایسا ہلکا اور سطحی آدمی تو نظر نہیں آتا جو ایسی حماقت کسی کے چڑھانے سے کرلے۔ خاص طور سے جبکہ اسی روایت کا یہ بیان بھی سامنے رکھا جائے کہ عمر بن سعد کے اس خط پر ابن زیاد کا اپنا ردعمل نہایت مسرت اور قبولیت کا تھا[2]۔ بہرحال راقم سطور کی نظر میں اس گتھی کا کوئی معقول اور تشفی بخش حل نہیں ہے۔ البتہ عقبہ بن سمعان کا بیان مان لیا جائے تو پھر سرے سے کوئی اشکال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ قتال کی بات بالکل سمجھ میں آتی ہے۔ اور ابن زیاد کیلئے یہ کہنے کا موقع ہوتا ہے کہ اچھا اب وہ ہمارے ہاتھ میں آکر ہاتھ سے نکل جانا چاہتے ہیں۔ لیکن اس سہ گانہ پیش کش والی روایت کا پلڑا اتنا بھاری ہے اور اتنے شواہد اس کے حق میں پائے جاتے ہیں کہ چاروناچار اسی کو ماننا پڑتا ہے اور عقبہ بن سمعان کی شہادت کے بارے میں وہ کہنا پڑتا ہے جو جسٹس امیر علی نے (شیعیت کے باوجود اپنی معقول پسندی کی بنا پر) کہا ہے کہ عقبہ کا یہ انکار شاید اس بنا پر تھا کہ سہ گانہ پیش کش والی روایت میں انکو

---

[1] طبری جزو ۴ ص ۲۳۵ [2] جیسا کہ اپنے موقع پر آئے گا۔

حضرت حسینؓ کی توہین نظر آتی تھی۔[1]

اس روایت کے وزن کی سب سے پہلی وجہ تو ابو مخنف کا یہ بیان ہی ہے کہ "جماعتِ محدثین کا اس پر اتفاق ہے"۔ دوسرے یہ کہ ابو مخنف اور طبری دونوں عقبہ بن سمعان کی بات نقل کرنے کے بعد آگے چوتھی روایت پانچویں روایت اور چھٹی روایت میں مسلسل وہ باتیں بیان کر کے جو سہ گانہ پیش کش کے نتیجے میں پیش آتی چلی گئیں۔ گویا ابن سمعان کی بات کو ناقابلِ اعتنا قرار دے دیتے ہیں۔ اور تیسری بات یہ ہے کہ تاریخ کے واقعات میں حضرت حسینؓ کے ساتھیوں کی زبان پر ابن سعد اور اس کے ساتھیوں کو خطاب کرتے ہوئے بار بار یہ بات ملتی ہے کہ:-

أَفَمَا لَكُمْ فِي أَحَدٍ مِنَ الخِصَالِ	کیا حضرت کی پیش کی ہوئی باتوں میں سے
الَّتِي عَرَضَ عَلَيْكُمْ رِضًى ؟	کوئی ایک بھی تم کو قبول نہیں ؟

طبری جزو ۶ کے صرف دو صفحوں (ص ۲۴۴ اور ۲۴۵) میں تین جگہ یہ بات آئی ہے اور اس کے بعد بھی آتی چلی جاتی ہے۔ اس لیے کوئی گنجائش ہی نہیں کہ اس روایت کو نہ مانا جائے۔

اصل بات جو کہنا تھی

یہ جتنی بات ناگزیر سمجھ کر عرض کی گئی، ورنہ اصل بات یہ کہی جا رہی تھی کہ اس قصے میں اصل حقیقت اور صحیح واقعات کی بازیافت بھی مشکل اور اس سے زیادہ اس کا اظہار مشکل۔ اس لیے کہ اس میں لوگوں کو یا حضرت حسینؓ کی (معاذ اللہ) توہین نظر آتی ہے، اور یا یزید و ابن زیاد کی طرفداری۔ لیکن ہے یہ ایک ضروری کام۔ اس لیے کہ یہ "توہین" نظر آنا اور "طرفداری نظر آنا" یہ دونوں باتیں ہم سب کی نظروں میں (الا ما شاء اللہ) شیعیت کا رنگ آجانے کا نتیجہ ہیں۔ اور یہ رنگ کوئی اچھا رنگ نہیں ہے۔ واقعۂ کربلا سے اور جو کچھ ہوا ہو یا

---

[1] SPIRIT OF ISLAM P.301 Delhi (1978)

نہ ہوا ہو اشیعیت کو اپنی دوکان چمکانے اور اپنے اثرات پھیلانے کا وہ بے پناہ موقع ملا ہے کہ کچھ کہا نہیں جاتا۔ اور اسی لیے ضرورت ہے کہ نہایت ٹھنڈے دل سے پورے معاملے کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

سُنّی معاشرے پر شیعیت کے اثرات

میں اور کسی کا کیا کہوں، اپنے والد ماجدؒ کا ایک اعتراف اور ایک بیان نقل کرتا ہوں۔

ذی الحجہ ۸۲ھ کے الفرقان میں میرا مضمون "واقعۂ کربلا" شائع ہوا تو والد ماجد گھر سے باہر کہیں سفر میں تھے۔ میری عادت یہ رہی تھی کہ جو کچھ بھی لکھتا بالعموم اُن کو دکھا کر ہی الفرقان میں دیتا تھا۔ مگر یہ مضمون اُن کی حالتِ سفر کی وجہ سے نہیں دکھایا جا سکا تھا۔ واپس آکر پڑھا تو میرے یہاں تشریف لائے۔ بقول خود بہت غصّے میں گھر سے نکلے تھے۔ اوّلاً تو اس بات پر کہ حضرت حسینؓ کے اقدام کو "بغاوت" سے تعبیر کر دیا اور اس سے بڑھ کر یہ کہ "یزید کے ہاتھ میں ہاتھ دینے" (یعنی بیعت یا سپردگی منظور کر لینے) کی "بات" تم نے کہاں سے لکھ دی! لفظ "بغاوت" کی خلش کے بارے میں تو خود ہی فرمایا کہ وہ آتے آتے راستے ہی میں دور ہو گئی کہ یہ لفظ ہمارے فقہاء کے یہاں بے شک بُرا لفظ ہے لیکن آج کل کا ہندوستانی تو اس لفظ کو اپنے یہاں کے آج کے استعمال کے مطابق بولے گا اور آج کے استعمال میں خصوصاً تحریکِ آزادیِ ہند کے پس منظر میں، تو یہ لفظ ایک پسندیدہ اور فخر سے بولا جانے والا لفظ ہے نہ کہ کوئی مکروہ و مذموم لفظ۔ لیکن دوسری خلش باقی رہی اور وہ اس وقت دور ہوئی جب پانچ چھ کتابوں کے حوالے میں نے پیش کیے جو ایک دوسرا وضاحتی مضمون لکھنے کے لیے جمع کیے گئے تھے۔

یہ بات تو آج سے ۲ برس پہلے ہوئی۔ زیرِ نظر کتاب کا جب وہ باب تیار ہوا اور والد ماجدؒ نے سنا جو حضرت مغیرہ بن شعبہ اور یزید کی ولی عہدی کے متعلق ہے، تو بیان فرمایا کہ ہمارے بچپن میں عشرۂ محرم میں ہمارے گھر مجلس ہوتی تھی، ہمارے بڑے بھائی صاحب تاریخ ابن خلدون

(مترجم) سے حضرت حسینؓ کی شہادت کا بیان سناتے تھے، جس میں حضرت مغیرہؓ کا ذکر بھی آتا تھا تو بعض بڑے بوڑھوں کا ان کے متعلق یہ کہنا یاد ہے کہ "اس شیرے کی بوند تو مغیرہ ہی نے ٹپکائی تھی" یعنی فساد کا بیج تو انہوں نے ہی بویا تھا۔ ایک صحابی اور وہ بھی صاحب فضائل ومناقب صحابی کے متعلق کس بے تکلفی سے کتنی بڑی بات کہہ دی جاتی تھی! ـــ اور یہ ہمارے وطن منفصل کے پرانے ٹھیٹ بوڑھوں کی ہی نہیں کہہ دی جاتی تھی، جن کے پاس کوئی خاص علم نہ تھا اور جن کے زمانے تک اس موضوع پر کوئی بڑا اصلاحی کام ہندوستان میں نہ ہوا تھا بلکہ ہمارے زمانے کے ایسے اہل علم تک جن کے متعلق اس طرح کے کسی تبصرے کا خیال بھی ان کے علمی اور تنقیدی مذاق کی بنا پر نہیں کیا جانا چاہیے تھا۔ ان کے قلم سے ہم بعینہٖ یہی شیعیت ٹپکتی ہوئی دیکھتے ہیں۔ یزید کی ولی عہدی کے قصے میں اس فضول سی روایت پر اعتماد کرتے ہوئے جو کہتی ہے کہ حضرت مغیرہ نے اپنی گورنری بچانے کے لیے یزید کی ولی عہدی کا خواب حضرت معاویہؓ کو دکھایا جو ان کے لیے اتنا خوش کن تھا کہ حضرت مغیرہ سے لی جانے والی گورنری بحال کر دی[1]۔ کس طنزیہ انداز میں لکھا ہے کہ:

> "یزید کی ولی عہدی کے لیے ابتدائی تحریک کسی صحیح جذبے سے نہیں ہوئی تھی، بلکہ ایک بزرگ نے اپنے ذاتی مفاد کے لیے دوسرے بزرگ کے ذاتی مفاد سے اپیل کر کے اس تجویز کو جنم دیا۔"[2]

حضورؐ کی قرابت کا احترام یا عصمت کا عقیدہ؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت بے شک قابل لحاظ اور واجب الاحترام شئی ہے۔ وہ آدمی بدنصیب ہے جو آپ کی قرابتوں کا لحاظ اور احترام نہ کر سکے۔ لیکن لحاظ و احترام الگ چیز ہے اور معصومیت محض کا درجہ کسی کو دینا الگ چیز ہے۔ شیعیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے

---

[1] زیر نظر کتاب میں ایک پورا باب اس روایت پر بحث کرے گا۔ [2] خلافت و ملوکیت از سید ابوالاعلیٰ مودودی ص ۱۵۱

کے ساتھ حضرت فاطمہ، حضرت علی اور حضرات حسن و حسین (رضی اللہ عنہم) اور اپنے دیگر ائمہ کو بھی عصمت کے درجے پر فائز کرتی ہے۔ نتیجے میں ان محترم حضرات سے کسی خطا اور بھول چوک کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جبکہ ان سے اختلاف کی صورت میں اختلاف کرنے والا لازماً ہی خطاکار و گنہگار قرار پاوے گا۔

ہم اہل سنت بطور عقیدہ یہ بات نہیں مانتے مگر بہت تھوڑے لوگوں کو چھوڑ کر ہمارا عمل اسی ذہنی رویے کی شہادت دیتا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانے سے حضرت عثمان غنیؓ کے زمانے تک کے معاملات میں بعض دوسری اعتقادی قسم کی رکاوٹیں ہمیں اس رویے کے اظہار کی اجازت نہیں دیتیں۔ لیکن اس دور کے ختم ہوتے ہی جو نیا دور شروع ہوتا ہے تو ہمارے اس رویے کے اظہار کا دور بھی شروع ہو جاتا ہے۔ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے اختلاف کی کہانی میں ہم ذرا بھی انصاف پسندی کا مظاہرہ نہیں کرتے، انصاف کے بجائے حضرت معاویہؓ کو بس کچھ رعایت بمشکل دیتے ہیں۔ اگر ہم سچ مچ انصاف پر آمادہ ہو سکتے تو اس قضیے کی صورت ہماری نظروں میں آج بہت کچھ مختلف ہوتی، ہم اپنے اس رویے کو کتاب و سنت پر مبنی کچھ اعتقادات سے مربوط کرتے ہیں۔ مگر واقعے میں اس کا ربط ان شیعی اثرات سے زیادہ ہے جن سے اہل سنت کا کوئی طبقہ بھی بمشکل بچ سکا ہے۔

بے انصافی کی ایک مثال

بے انصافی کی صرف ایک مثال لیجیے ـــــ اس لیے کہ یہاں اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں نکل سکتی ـــ کہ جن تاریخی کتابوں سے ہم حضرت معاویہؓ کی طرف سے حضرت علیؓ پر سب و شتم کی روایتیں پاتے ہیں انھیں کتابوں کی شہادت یہ بھی ہے کہ:۔

• وکان علی اذا صلی الغداۃ یقنت فیقول: اللھم العن	اور واقعہ تحکیم کے بعد علیؓ جب فجر کی نماز پڑھتے تو قنوت پڑھتے اور کہتے

معاویۃ وعمرا وابا الاعور وحبیبا	کہ اے اللہ لعنت کر معاویہ پر، عمرو بن عاص
وعبد الرحمٰن بن خالد والضحاک	پر، ابو الاعور پر، حبیب بن مسلمہ پر،
بن قیس والولید فبلغ ذالک	عبد الرحمٰن بن خالد بن ولید پر، ضحاک بن
معاویۃ فکان اذا قنت لعن	قیس پر، ولید پر۔ پھر یہ بات جب معاویہ
علیا وابن عباس والحسن	کو معلوم ہوئی تو وہ بھی جب قنوت کرتے تو
والحسین والاشتر[1]	علی، ابن عباس، حسن، حسین و اشتر پر لعنت کرتے۔

لیکن اس صاف و صریح بیان کے باوجود ہمیں صرف اتنا یاد ہے کہ معاویہؓ اور ان کے ساتھی حضرت علیؓ پر سب و شتم کرتے تھے[2]۔ یہ نتیجہ حضرت علیؓ کے اس احترام کا نہیں ہے جو از روئے کتاب و سنت ہم پر واجب ہے کیونکہ کتاب و سنت بے انصافی نہیں سکھاتی بلکہ اس "احترام" کا نتیجہ ہے جو شیعیت والے عقیدۂ معصومیت سے لازم آتا ہے۔ اہل سنت کے اصل مذہب کا تقاضہ تو یہ تھا کہ اگر یہ روایت حضرت علیؓ کے حق میں قابل یقین یا قابل بیان نہیں تھی تو ایسا ہی حضرت معاویہؓ کے حق میں سمجھا جاتا کہ وہ بھی صحابی ہیں۔

تاہم حضرت علیؓ کے مقابلے میں جیسے کچھ بھی تھے حضرت معاویہ بہرحال ایک صحابی تھے۔ اس لیے ہم اپنے علم کلام کے ماتحت مجبور ہوتے ہیں کہ ان کے ساتھ کچھ رعایت برتیں۔ لیکن جب ان کے بیٹے یزید کا دور آتا ہے تو اس کے اور حضرت حسین ابن علیؓ کے معاملے میں ہم میں اور شیعوں میں کوئی فرق باقی نہیں رہ جاتا۔ اس لیے کہ یزید کو ایسا کوئی تحفظ حاصل نہیں تھا جیسا کہ اس کے والد حضرت معاویہ کو حاصل تھا۔ شیعوں نے "مثلاً" کہا کہ وہ فاسق و فاجر تھا اور کسی طرح اس لائق نہ تھا کہ تخت خلافت پر اس کو جگہ ملتی۔ تو چونکہ یہ بات حضرت حسینؓ کی حمایت میں کہی

---

[1] طبری ج ۶ صـ ۴۰

[2] اور یہاں یہ نوٹ کر لیجئے کہ طبری کی روایت میں جیسا کہ نقل کیا گیا دونوں جگہ "لعنت" کا لفظ ہے۔ اسی کو ابن اثیر نے اپنی کتاب میں دوسری جگہ یعنی حضرت معاویہ کے ساتھ "سب" کے لفظ سے بدل دیا ہے جس کا ترجمہ ہم سب و شتم کرتے ہیں۔

گئی تھی اس لیے بالکل آسانی ہم نے یہی کہنا شروع کر دیا۔ پھر بعض کو خیال آیا کہ اس سے تو حضرت معاویہؓ پر بڑا الزام آتا ہے۔ تب یوں کر دیا گیا کہ حضرت معاویہؓ کی زندگی میں تو وہ ایسا نہیں تھا لیکن بعد میں ہوا۔ حد یہ ہے کہ ابن خلدون جیسا آدمی جس نے یزید کی ولی عہدی کی زبردست وکالت اپنے مقدمۂ تاریخ میں کی ہے، وہ بھی ذرا سا آگے چل کر جب یزید اور حضرت حسینؓ کے قضیے پر آتا ہے تو ٹھیک وہی بات کہنی شروع کر دیتا ہے یعنی یہ کہ وہ فاجر و فاسق ہو گیا تھا۔ کب ہو گیا تھا؟ اور کب اس بات کا پتہ چلا؟ تاریخ تو کوئی سی بھی اٹھا کر دیکھ لیجیے، ہر جگہ ایک ہی بیان ہے کہ جیسے ہی مدینے کے گورنر نے حضرت حسینؓ کو یہ اطلاع دی کہ حضرت معاویہ انتقال فرما گئے اور ان کے ولی عہد یزید بن معاویہ آپ سے بیعت چاہتے ہیں، ویسے ہی حضرت حسینؓ نے مدینہ چھوڑ دینے کا ارادہ فرما لیا اور آنے والی رات میں مع تمام خاندان کے مکے کی راہ لی۔ اس کے بعد جب اس کی اطلاع شیعانِ علی کو پہنچی تو وہ بھی اپنے شاندار جلسے کر کے عازمِ مکہ ہوئے اور صرف سوا مہینے کی مدت میں یہ طے پا گیا کہ عراق میں حالات کی جانچ پڑتال اور ضروری پیشگی تیاریوں کے لیے مسلم بن عقیل کوفے کو روانہ کر دیے گئے۔ تو کیا یہ سمجھا جائے کہ یزید نے تختِ خلافت بعد میں سنبھالا والد کے انتقال کی خبر پاتے ہی فسق و فجور کا وہ عالم برپا کیا کہ حضرت معاویہ کے انتقال کی خبر سے پہلے یزید کے فسق و فجور کی خبریں پھیل گئیں؟ حالانکہ سچائی یہ ہے کہ اس بات کے لیے سوا مہینہ بالکل ناکافی تھا، کم از کم ایک سال تو گزرتا۔ "بیچارہ کا ہے" کی طرح فسق و فجور مفت میں بدنام ہوا ہے۔[1]

لکیر کی فقیری یا طلبِ علم و تحقیق؟

اب ایک طریقہ تو یہ ہے کہ جب ابن خلدون جیسے آدمی نے بھی یہی لکھ دیا تو پھر ثبوت ہو یا نہ ہو، سمجھ میں آئے نہ آئے، نہ ماننے کی کیا گنجائش ہے؟ یہ وہ طریقہ اور وہ طرز فکر ہے

---

[1] کتاب میں اس مسئلے پر قدرے تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔

جس نے سچی بات یہ ہے کہ ہمارا افکار خراب کیا ہے اور علم کے نام سے علمی جمود ہمارا شعار بن گیا ہے۔ اگلوں کی توقیر و تعظیم کے نام پر طلب علم و تحقیق کی راہ بند کرنے والا یہ طرز فکر اگر ہمارے یہاں عام نہ ہوا ہوتا تو ہمارا عالم آج کے عالم سے بہت مختلف ہوتا۔ منجملہ اس کے یہ جو شخصیت ہمارے یہاں اس وقت گھس آئی تھی جب اس نے ایک باقاعدہ متوازی مذہب کی شکل اختیار نہیں کی تھی، یہ بعد کے دور میں قطعی طور سے نکالی جا سکتی تھی، اور نکال دی جاتی اگر طالب علمانہ کی جگہ "منصفانہ" ذہنیت ہم پر حاوی نہ ہو چکی ہوتی کہ جو اوپر والوں نے جو عالم میں کہہ دیا اور لکھ دیا وہ حرف آخر اور میخ کی لکیر ہے اور اس لکیر کی فقیری ہم کو کرنا ہی ہے ؏

بہ مے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید

اللہ ہی جانے کہاں سے یہ طرز فکر اس دنیائے اسلام میں آیا جس کا خمیر ہی ذاتی غور و فکر کی دعوت سے اٹھایا گیا تھا اور آبا و اجداد اور رہبان و احبار (مشائخ) کی اندھی تقلید کو ضلال و خسران بتایا گیا تھا؟ کھلی ہوئی بات ہے اور ہم سبھی جانتے مانتے ہیں کہ کوئی آدمی عالم کل نہیں ہوتا، پھر ہر ایک کا کچھ کچھ خاص زاویہ نظر ہوتا ہے، ہر ایک اپنے زمانے اپنے ماحول اور ماحول پر غالب چیزوں سے متاثر ضرور ہوتا ہے۔ اس لیے کوئی کتنا بھی بڑا عالم اور محقق ہو کہیں نہ کہیں ٹھوکر ضرور کھائے گا، کسی نہ کسی لاعلمی یا غلط فہمی کا شکار ضرور ہوگا (الا ما شاء اللہ) اس لیے اگر اس کے احترام کے ساتھ ساتھ علم کے حق کا احترام بھی منظور ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کی باتوں کو تقلیداً لینے کے بجائے تحقیقاً لینے میں کوئی حرج سمجھا جائے اور خُذ ما صفا و دع ما کدر (جو ٹھیک ہے وہ لے لو جس میں گڑبڑ ہے وہ چھوڑ دو) کے دانشمندانہ مقولے پر عمل نہ کیا جائے۔ کسی بڑے آدمی کے حوالے ہی کی ضرورت اگر اس کھلی ہوئی بات کو بھی قبول کرنے میں ہو تو حضرت امام مالکؒ کے بارے میں نقل ہوا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

کل یوخذ منہ و یرد علیہ　　سوائے اس قبر والی ذات گرامی کے ہر ایک کا

إلا صاحب هذا القبر۔ قول ہر شخص کا قابل قبول ہو سکتا ہے نا قابل رد بھی ہو سکتا ہے۔

جو انسان کی اس محدودیت اور انفعالیت کے علاوہ ایک دوسری کھلی ہوئی بات یہ ہے کہ کسی گذشتہ زمانے کو ہم اخلاق و کردار اور عادات و اطوار کے لحاظ سے اس کے بعد والے زمانوں کے مقابلے میں خواہ کیسا ہی بہتر سمجھیں مگر وسائل کے معاملے میں ہر بعد والا زمانہ پہلے زمانوں کو پیچھے چھوڑتا آ رہا ہے۔ وسائل علم کا بھی یہی حال ہے کہ وہ برابر ترقی پذیر ہیں۔ کتنے ہی علوم جو اگلی صدیوں میں یا تو مدوّن نہ تھے اور مدوّن ہو گئے تھے تو ان کے مجموعے آسانی سے دستیاب نہ تھے، جبکہ زمانے کی ترقیوں نے اُن کو اب نہایت منقّح شکلوں میں ہر کہ ومہ کی دسترس میں کر دیا ہے، پھر علمی تحقیقات کو آسان بنانے کا فن الگ نئے نئے طریقے اور وسیلے ایجاد کر کے اپنے کرشمے دکھا رہا ہے۔ نتیجے میں نئی علمی تحقیقات کا بھی ایک سلسلہ قائم ہو چکا ہے۔ ایسے حال میں ہمارا علم جوں کا توں اور جمود مطلق کا نمونہ بنا رہے۔ جس معاملے میں جو بیان اگلے لوگ دے گئے تھے اور جو رائے ظاہر کر گئے تھے، اسے نئے اور بہتر وسائل کی روشنی میں پرکھ کر دیکھنے اور پھر رد کر دینے یا قبول کیے رہنے کا اپنا فیصلہ کرنے کی جرأت کے بجائے ہم جوں کے توں اُسی رائے پر قائم رہتے ہیں اور ہر نئی آواز اور نئی رائے سے لڑ جانے میں اپنی سعادت سمجھیں۔ یہ بے شک (حسن نیت کے ساتھ) اُخروی سعادت ضرور ہو سکتی ہے، مگر دنیوی سعادت کی قیمت پر ہوگی ــــ اور ہو رہی ہے ــــ جبکہ ہمارا دین بیک وقت دونوں سعادتوں کا کفیل ہے اور دونوں کی بیک وقت طلب ہی راہ ہمیں سکھاتا ہے۔[1]

دوسرا طریقہ جو ابن خلدون جیسے اہل علم کا اصلاً طریقہ ہے، یہ ہے کہ ہمیں اگر حضرت حسینؓ کی زندگی میں یزید کے فسق و فجور کی کوئی معتبر شہادت نہیں

---

[1] بلا تکلف اعتراف ہے کہ جو چیز آج قطعاً ناقابل فہم معلوم ہو رہی ہے۔ بہت کچھ نا قدری روشن رکھنے کے باوجود ایک زمانے میں ایک حد تک وہ اپنا حال بھی رہی ہے۔ اب افسوس ہوتا ہے کہ کاش عمر کا وہ قیمتی حصہ اس کم فہمی کی نذر نہ ہوتا جو ان الفاظ کو پڑھ کے کہ گفتگو حضرت حسینؓ کی زندگی کے دور تک کی ہی ہے۔

چلتی تو پھر ساری دنیا کہے بشمول ابن خلدون کہے تب بھی اس قول اور بیان کو بس اس پر محمول کرنا چاہیے کہ بعض باتیں اپنی شہرت کی بنا پر اس درجہ یقینی اور قطعی بن جاتی ہیں اور ایک زمانے تک بنی رہتی ہیں کہ ان کی واقعیت میں کسی شک اور ان کے بارے میں کسی تحقیق کی ضرورت کا سوال ہی ذہن میں نہیں آتا۔ اور یہی چیز اس معاملے میں پیش آئی ہے۔ حضرت حسینؓ جیسی شخصیت کا یزید کے آدمیوں کے ہاتھوں قتل اور پھر شیعہ پروپیگنڈہ مشینری (جس نے پروپیگنڈہ کے زور پر حضرت عثمانؓ جیسے عظیم المرتبت صحابی کو ایک کافر و مرتد باور کرادیا تھا) ان دو چیزوں کی طاقت مل کر یزید کے بارے میں کیا کچھ نہیں باور کرا سکتی تھی؟ اس شہرت کا پردہ جب تک چاک نہ ہوا تھا اور پروپیگنڈے کا سحر ٹوٹا نہ تھا تب تک جس طرح بات چلتی رہی چلتی رہی۔ مگر کیا وجہ ہے کہ ہمیشہ یوں ہی چلتی رہے اور حقیقت کھل جانے پر بھی اسکے ساتھ حقیقت پسندانہ معاملہ نہ کیا جائے؟

مومن کا معیار اور اس کی ذمہ داری

یزید سے ہماری کوئی رشتہ داری نہیں ہے۔ اور اگر ہے تو پہلے حضرت حسینؓ سے ہے۔ حضرت معاویہؓ سے ہماری کوئی رشتہ داری نہیں، اور اگر ہے تو پہلے حضرت علیؓ سے ہے۔ مگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جن کی ذات اقدس کی طرف یہ تمام رشتہ داریاں لوٹتی ہیں ان کی مبارک تعلیم نے ہمارا رشتہ سب سے پہلے حق اور صداقت کے ساتھ قائم کردیا ہے باقی تمام رشتہ داریوں کا درجہ

---

[1] صرف ایک شہادت ہمارے علم کی حد تک یہ ملتی ہے کہ حضرت معاویہؓ نے یزید کی ولی عہدی کے معاملے میں اپنے حاکم بصرہ زیاد سے مشورہ مانگا تو اس نے یزید کے شوق شکار اور کچھ آزادروی و سہل انگاری کا اندازہ کرکے یہ مشورہ دیا کہ یہ کام کچھ مؤخر کردینا مناسب ہوگا اور ساتھ ہی یزید سے کہلوایا کہ وہ اپنے حالات کی اصلاح کرے چنانچہ اسی روایت کے مطابق اس نے اپنی بہت کچھ اصلاح کرلی (طبری ج ۶ ص ۱۷۰) یعنی جو کچھ تھا وہ حضرت معاویہؓ کی زندگی میں تھا اور اُسی زمانے میں ختم ہوگیا۔

اس کے بعد رکھا ہے۔

یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا کُونُوا قَوَّامِینَ	اے ایمان والو مضبوط کھڑے ہو انصاف کے
بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰی	ساتھ گواہ بن کر اللہ کے۔ اگرچہ گواہی تمہارے
أَنْفُسِکُمْ أَوِ الْوَالِدَیْنِ وَالْأَقْرَبِینَ[1]	اپنے خلاف ہو یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں
	کے خلاف ہو۔
یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا کُونُوا قَوَّامِینَ	اے ایمان والو کھڑے ہو مضبوط اللہ کیلئے
لِلّٰهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ	انصاف کے گواہ بن کر اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں
شَنَآنُ قَوْمٍ عَلٰی أَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا	بے انصافی پر آمادہ نہ کرے۔ انصاف کیا
هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی[2]	کرو کہ یہ قرین تقویٰ ہے۔

اسلام کی اس واضح اور صریح تعلیم کو دھیان میں رکھتے ہوئے ہمیں تو اس کی کوئی گنجائش نظر نہیں آئی کہ ہم یزید کے لیے اور حضرت حسینؓ کے لیے ہمارے پاس الگ الگ ترازو اور الگ الگ باٹ ہوں بلکہ:

العین تدمع والقلب یحزن	آنکھوں میں نم ہے اور دل میں غم مگر زبان
ولا نقول الا ما یرضی به ربنا[3]	سے ہم وہی کہیں گے جو ہمارے رب کو پسند ہے۔

حضرت حسینؓ اور یزید کے قضیے کا مطالعہ اگر اللہ و رسول کی ان تعلیمات کی روشنی میں اسی اسپرٹ سے کیا جائے جس اسپرٹ سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ایک یہودی ملزم کے ساتھ برابری کی سطح پر اپنے قاضی کی عدالت میں حاضری قبول فرمائی۔ جس اسپرٹ کے ساتھ قاضی نے حضرت علیؓ کے خلاف فیصلہ دیا (اور صرف اس ٹیکنیکل بنیاد پر دیا کہ گواہی معتبر شرائط پر پوری نہیں اترتی) اور جس اسپرٹ کے ساتھ حضرت علیؓ نے یہ فیصلہ بلا تامل قبول فرما لیا۔ انصاف

---

[1] القرآن سورۃ النساء (۴) آیت ۱۳۵۔ [2] القرآن سورۃ المائدۃ (۵) آیت ۸۔

[3] یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اس موقع کا ارشاد ہے جب صاحبزادہ ابراہیم علیہ السلام آپ کے ہاتھوں میں جان جان آفریں کے سپرد کر رہے تھے اور آپ پر غم کا عالم طاری تھا۔

کی اس اسپرٹ کے ساتھ ہم اگر معاملے کو جانچنے کی کوشش کریں تو اس تصفیے میں اب تک جو تصور چلا آرہا ہے اس کے باقی رہنے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ اور اگر واقعی ایک ایماندارانہ اور غیر جانبدارانہ مطالعہ اس تصور اور تاثر کو باقی رکھنے کی اجازت نہیں دیتا جو اس معاملے میں اب تک عام طور سے رہا ہے تو پھر یقیناً یہ ایک ایماندارانہ فریضہ ہے کہ اس مطالعے کو سامنے لایا جائے اور ان تمام حلقوں تک اسے پہنچانے کی امکان بھر سعی کی جائے جو اب تک کے تصور کو ایک ایمانی سعادت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اس طرح حقائق کے ساتھ بے انصافی جیسی غلط چیز ایمان کا تقاضہ بن جاتی ہے۔

اس کام کی ضرورت

راقم کو پورا احساس بلکہ تجربہ ہے جس کا اوپر اظہار ہو چکا ہے کہ ایسے معاملات میں جن کا تعلق نازک قسم کے جذبات سے جڑ گیا ہو، ایک صدیوں اور نسلوں سے جمے ہوئے تاثر اور تصور کو چھیڑنا ایک پُرخطر کام ہے۔ مزید اس لیے بھی ایک دشوار کام ہے کہ خود اپنے جذبات کی دنیا بھی اس ایمانداری کے ہاتھوں جگہ جگہ آزمائش میں پڑتی ہے۔ اس لیے کہ اب تک کا عمومی تصور کچھ نہ کچھ ہم سبھی کو ورثے میں ملا ہے۔ مگر یہ معاملہ، جیسا کہ اوپر بھی گزر چکا ہے، ان معاملات میں سے ہے جنھوں نے ہمارے دینی زاویۂ نظر کو مجموعی طور سے بہت متاثر کیا ہے، یہ ان معاملات میں سے ہے جن معاملات نے ہمارے اندر ایمانداری اور غیر جانبداری کے تصور کو مدھم کیا ہے، جن معاملات نے انصاف پسندی کی بے لاگ اسلامی روح کو بے جان کر دیا ہے اور حقیقت بینی اور حقیقت پسندی جو اسلام کی سب سے بڑی زینت تھی اس سے اُمت کو بحیثیت مجموعی محروم کیا ہے، اُمت کا ہر حلقہ، خاص طور سے مذہبی حلقہ جو آج اپنے آپ کو معیارِ حق بنائے ہوئے ہے، اور اس طرح حق سب سے زیادہ مشتبہ اور متنازعہ چیز بن گئی ہے، یہ ایسے ہی معاملات کا رفتہ رفتہ اثر ہے جن میں انصاف اور حقیقت پسندی جیسے اولین اسلامی اور انسانی تقاضوں

کو دوسرے تیسرے اور چوتھے درجے کے تقاضوں سے مغلوب ہو کر قربان کر دیا جاتا رہا۔ ہمارے اندر نئے نئے حلقوں کی پیدائش پرانے حلقوں کے باہمی بُعد میں اضافہ اور ان میں سے ہر ایک کے اندر انتشار اور ٹوٹ پھوٹ کے عمل سے نئی نئی تقسیمیں، یہ سب عذاب اسی انصاف پسندی، حقیقت پسندی اور حقیقت بینی کے فقدان کا ہے، اس عذاب سے اُمت کے نکلنے کی کوئی صورت اس کے بغیر نہیں ہے کہ جہاں جہاں سے اس فساد کی ابتدا ہوتی نظر آتی جائے وہاں وہاں سے اصلاح کے کام کی ہمت کی جائے۔

پیش نظر کتاب اصلاً تو والد ماجدؒ کے ایماء کی تعمیل ہے، مگر جس خاص شکل میں اور جن الفاظ پر تیار ہوئی ہے وہ میرے انہی مذکورہ بالا احساسات کا نتیجہ ہے، برسہا برس سے بڑی شدت کے ساتھ احساس ہے کہ ہمارے یہاں حقیقت پسندی اور انصاف پسندی جس پر تمام دینی اور دنیوی سعادتوں کا مدار ہے ایک عنقا صفت شئی ہو گئی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ سعادت بھی ہمارے یہاں عنقا ہو گئی ہے عاقبت کی خبر تو خدا جانے۔ ہم پر وہاں کا حال دیکھیے جا کے کھلے گا۔ دنیا کی ہر سعادت سے بحیثیت قوم و ملت محرومی ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ جو قوم بھی حقیقت بینی اور حقیقت پسندی کا دروازہ اپنے اوپر بند کرے گی اور محرومات کو عقائد بنالے گی وہ لازماً پسماندگی اور محرومی ہی کو اپنا مقدر بنا دے گی۔ اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ اپنا یہ حال بدلے اور یہ کتاب اس تبدیلیٔ حال میں مددگار ہو۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سیدنا محمد وآلہ واصحابہ اجمعین۔

کچھ حوالوں کے سلسلے میں

کتاب کی تسوید کا بیشتر کام فروری ۸۸ء سے جولائی ۸۸ء تک ہندوستان کے قیام میں ہوا، مگر اس کی شروعات لندن ہی میں ہو چکی تھی، لندن میں البدایہ والنہایہ اور تاریخ ابن اثیر کے جو ایڈیشن سامنے رہے تھے اور جن سے لیے ہوئے کچھ نوٹس وغیرہ بھی ساتھ تھے ہندوستان

میں کام کرتے وقت یہ ایڈیشن دستیاب نہ ہو سکے اس کی بنا پر ایک ہی کتاب کے دو ایڈیشنوں کے حوالے کتاب میں آ گئے ہیں۔ کوشش کی گئی ہے کہ حوالے میں ایڈیشن کا امتیاز ہو جائے مگر امکان ہے کہ کہیں کچھ التباس ہو گیا ہو۔ اگر کوئی صاحب ان دونوں کتابوں کا کوئی حوالہ ملائیں اور اس میں کوئی دقت پیش آئے تو سمجھ لیا جائے کہ صفحہ کا نمبر دوسرے ایڈیشن کا ہے۔ ان کتابوں میں واقعات کا سنہ وار ذکر ہے اس لیے سنہ کے حساب سے ہر واقعہ بآسانی ہر ایڈیشن میں پایا جا سکتا ہے۔

آخر میں اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کتاب سے اگر کوئی خیر انجام پائے تو اسے قبول فرمائے اور قلم نے کہیں لغزش کی ہو تو اس کے اثرات سے ناظرین کو بچائے اور مجھے اس پر متنبہ ہونے کی سبیل پیدا فرمائے۔

تشکر و امتنان

کتاب کی تیاری کے سلسلے میں جن اصحاب کی مدد کا میں ممنون ہوں ان میں سرِ فہرست نام جناب مولانا سید محمد مرتضیٰ صاحب ناظم کتب خانہ دار العلوم ندوۃ العلماء کا ہے جن کی عنایت و کرم فرمائی سے ضرورت کی ہر وہ کتاب جو کتب خانہ میں تھی بروقت اور بہ آسانی دستیاب ہوئی۔ اللہ تعالیٰ ان کو اس مہربانی کا بہترین اجر میری طرف سے دے۔ افسوس کہ وہ اس تیسرے ایڈیشن کے وقت ہماری دنیا میں نہیں ہیں۔ ندوۃ العلماء کے اساتذہ میں اپنے محبِ قدیم مولانا برہان الدین صاحب سنبھلی اور ایک نئے محب مولانا عتیق احمد صاحب بستوی کو بھی میں نے کئی دفعہ بعض چیزوں کی تلاش کے لیے تکلیف دی جسے ان حضرات کے علمی ذوق و نظر نے آسان کر دیا۔ ہر وقت کے اور حسبِ ضرورت مددگاروں میں میرے عزیز برادر خورد میاں خلیل الرحمٰن سجاد نعمانی رہے۔ اللہ ان کو سلامت بعافیت رکھے۔ کتابت کی تصحیح وغیرہ کی ذمہ داری

جبکہ اس کام کو مکمل کیے بغیر لندن چلا آیا تھا، انھیں کے اوپر رہی۔ اور اس کے بعد کتاب کی طباعت اور اشاعت کے اہتمام کے لیے ان سے بڑے بھائی میاں محمد حسان نعمانی دعاؤں کے مستحق ہیں۔

آخر میں اللہ سے دعا ہے کہ اس کتاب سے اگر کوئی خیر انجام پائے تو اسے قبول فرمائے اور قلم نے کہیں لغزش کی ہو تو اس کے اثرات سے ناظرین کو بچائے اور مجھے اس پر متنبہ ہونے کی سبیل پیدا فرمائے۔

عتیق الرحمٰن سنبھلی
لندن ۴؍ اگست ۹۰ء

باب اوّل

شہادت عثمانؓ ــ خانہ جنگی ــ صلح حسنؓ

شہادت عثمانؓ اور خانہ جنگی

حضرت عثمانؓ کی شہادت (۳۵ھ) کے وقت سے مسلمانوں میں باہم تلوار چلنے کا جو دروازہ کھلا تو پھر اس پر حرام ہو گیا کہ بند ہو۔ اور یہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔

اذا وضع السیف فی امتی لم یرفع عنها الی یوم القیامۃ۔[1]	میری امت میں جب ایک دفعہ آپس میں تلوار کھینچ جائے گی تو پھر وہ قیامت تک رکھی نہ جائے گی۔

یہی بات حضرت عبداللہ بن سلامؓ (صحابی) نے ان کوفیوں، بصریوں اور مصریوں سے فرمائی تھی جو حضرت عثمانؓ کے درپے قتل تھے[2]۔ مورخ ابن اثیر نے ان کے الفاظ نقل کئے ہیں:

یا قوم لا تسلوا سیف اللہ فیکم فواللہ ان سللتموہ لا تغمدوہ ویلکم ان سلطانکم الیوم یقوم	اے لوگو! اللہ کی تلوار کو آپس میں مت کھینچو، خدا کی قسم اگر تم نے اسے بے نیام کر دیا تو پھر یہ واپس نیام میں جانیوالی

---

[1] مشکوٰۃ۔ کتاب الفتن۔ فصل ثانی۔ بحوالہ ابوداؤد، ترمذی۔

[2] انہی لوگوں کے ہاتھوں حضرت عثمانؓ کی شہادت ہوئی۔ یہ کون لوگ تھے؟ اس کی کچھ تفصیل ان شاء اللہ باب دوم میں آئے گی۔

بالقدرة، فان قتلتموه لا تقوم	نہیں ہے۔ دیکھو سمجھو آج تک تمہاری
الا بالسیف۔ [1]	حکومت فقط قدرت سے چلتی رہی ہے
	اگر تم نے اب عثمانؓ کو قتل کر دیا تو پھر
	یہ تلوار ہی سے چلے گی۔

اور خود حضرت عثمانؓ نے ان لوگوں سے اس بات کو یوں کہا تھا:۔

"اگر تم نے مجھے قتل کر دیا تو پھر آئندہ کبھی باہم محبت سے نہ رہ سکو گے، ایک ساتھ نماز نہ پڑھ پاؤ گے اور ایک جان ہو کے دشمن سے نہ لڑ سکو گے۔"[2]

جنگ جمل اور صفین

یہ تلوار آپس میں چلی اور ایسی چلی کہ الامان الحفیظ! شہادت عثمانؓ پر ایک سال مشکل گزرا کہ مسلمانوں نے آپس میں دو جنگیں، جنگ جمل اور جنگ صفین کے نام سے لڑیں اور اپنے ہزاروں بہترین افراد ان باہمی جنگوں کی نذر کر دیئے۔ دونوں جنگوں کے مقتولین کی تعداد تراسی ہزار تک بتائی گئی ہے اور جنگ جمل کی تیرہ ہزار تک۔

جنگ جمل جمادی الاخریٰ سنہ ۳۶ھ میں ہوئی۔ اس میں ایک طرف حضرت علیؓ تھے۔ دوسری طرف ام المومنین حضرت عائشہؓ، حضرت زبیرؓ اور حضرت طلحہؓ۔ اس کو جنگ جمل اس اونٹ کی وجہ سے کہا گیا ہے جس پر حضرت عائشہؓ سوار تھیں اور اس جنگ کا فیصلہ اس اونٹ کے کھڑے رہنے یا گر جانے پر ٹھہر گیا تھا۔ (عربی میں اونٹ کو جمل کہا جاتا ہے) حضرت علیؓ کے فوج کے دباؤ سے حضرت عائشہؓ کے حمایتی اگر پیچھے ہٹتے تھے تو اس اونٹ کے پاس جا کر بہرحال رک جاتے تھے اور اس کی حفاظت میں پروانہ وار جانیں دیتے۔ سینکڑوں آدمی مارے

---

[1] الکامل فی التاریخ از ابن اثیر ج ۳ ص ۹۰۔ دار الفکر، بیروت۔

[2] تاریخ الامم والملوک (تاریخ طبری) از ابن جریر طبری ج ۳ جزو ۵ ص ۱۱۸۔ دار القلم بیروت۔

گئے ہیں جو اس اونٹ کے اردگرد شہید ہوئے۔

اس جنگ کا مختصر قصہ یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت موسم حج (ذی الحجہ) میں ہوئی جبکہ اہل مدینہ کی بھاری تعداد حج کے لیے گئی ہوئی تھی۔ منجملہ ان کے حضرت عائشہؓ اور بعض دیگر امہات المومنین تھیں۔ یہ واپس ہو رہی تھیں کہ مدینے سے بہت سے لوگ مکہ پہنچے جن سے حضرت عثمانؓ کے قتل کر دیئے جانے کی خبر ملی۔ حضرت عائشہؓ نے اپنا ارادہ بدل دیا اور مکے ہی میں ٹھہر کر قاتلوں کے خلاف کارروائی کی منصوبہ بندی کا فیصلہ کیا۔ اس دوران میں حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ بھی مدینے سے پہنچ گئے۔ جو یہ خبر لائے تھے کہ مدینہ بالکل انہی اوباشوں کے قبضے میں ہے جن کے ہاتھوں خلیفہ سوم قتل ہوئے۔ ہم بھی جان بچا کر بھاگے ہیں۔ علیؓ کو انہی لوگوں نے خلافت قبول کرنے پر مجبور کیا۔ ان اوباشوں کے خلاف کارروائی کے سلسلے میں آخری فیصلہ یہ ہوا کہ براہ راست مدینہ نہ جایا جائے بلکہ بصرے اور کوفے کا رخ کیا جائے جہاں سے ان اوباشوں کی ٹولیاں نکل کر مدینہ پہنچی ہیں۔ ان دونوں مقامات کو قابو میں کر کے (جہاں طلحہؓ اور زبیرؓ کے ماننے والے بھی بکثرت ہیں) ان اوباشوں کے خلاف کارروائی آسان ہوگی۔ اس منصوبے کے ساتھ وہ تمام لوگ جو حضرت عثمانؓ کے حامی یا کم از کم قاتلوں کے مدینے پر قبضے سے ناخوش ہونے کی بنا پر مکے پہنچ گئے تھے، ام المومنین حضرت عائشہؓ کی قیادت میں بصرے کے لیے روانہ ہو گئے۔

حضرت علیؓ اگرچہ خود دیکھ رہے تھے کہ ان کے اردگرد بھاری تعداد میں قاتلان عثمانؓ ہیں مگر آپ کی حکمت عملی یہ تھی کہ اس وقت ان کی حمایت کو قبول کیا جائے کیونکہ ان کو اس وقت چھیڑنا نقصان دہ ہوگا بلکہ حضرت معاویہ (حاکم شام) جن کو آپ برطرف کرنا چاہتے ہیں ان کے خلاف کارروائی میں تو یہی لوگ سب سے زیادہ کارآمد بھی ہو سکتے تھے۔ اس بنا پر آپ پہلی ترجیح کے طور پر حضرت معاویہ کے خلاف کارروائی کی تیاری کر رہے تھے کہ مکے سے حضرت عائشہؓ اور زبیرؓ و طلحہؓ کی قیادت میں بصرے کے لیے ایک لشکر کی روانگی کی خبر ملی۔

حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ کی وجہ سے بظاہر یہ یقینی ہے کہ اس مہم کو حضرت علیؓ نے نہ صرف قاتلانِ عثمانؓ کے بلکہ خود اپنے خلاف بھی جانا ہوگا۔ کیونکہ حضرت علیؓ کی بیعت کے سلسلے میں ان حضرات کے درمیان بدگمانی کے اسباب پیدا ہو گئے تھے۔ بہر حال حضرت علیؓ نے فوری طور پر مدینے سے کوچ کر کے ان لوگوں کا راستہ روکنے کی کوشش کی۔ مگر وقت گزر چکا تھا۔ اس لیے بصرے کی مہم بلا رکاوٹ بصرے پہنچ گئی۔ حضرت علیؓ بھی اپنی فوج کے ساتھ وہیں پہنچے۔ اور پھر طرفین میں مذاکرات شروع ہوئے۔ جس کے نتیجے میں اس شرط پر صلح کی صورت بن گئی کہ حضرت علیؓ اپنے آپ کو قاتلانِ عثمانؓ سے آزاد اور بے تعلق کر لیں۔ ان لوگوں نے اس صلح کی سُن گُن پالی۔ جس میں ان کی قطعی موت تھی۔ چنانچہ ان لوگوں نے مشاورت کر کے فوری فیصلہ یہ کیا کہ حضرت عائشہؓ کے لشکر پر شب خون مار کے جنگ کی آگ بھڑکا دی جائے اور اس میں یہ لوگ کامیاب ہو گئے۔ پھر جو جنگ چھڑی تو اس وقت رکی جب حضرت علیؓ نے اس جنگ کے جلدی رکنے کی کوئی صورت اس کے سوا نہ دیکھی کہ اونٹ کو نشانہ بنایا جائے اور وہ بیٹھنے پر مجبور ہو جائے۔ چنانچہ یہ ہوا اور یہیں پر جنگ ختم ہو گئی۔ یعنی یہ بس ایک روزہ جنگ تھی۔ حضرت عائشہؓ بالکل سلامت رہیں اور پوری طرح باعزت سلوک کے ساتھ مدینے کو روانہ کر دی گئیں۔ حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ نے البتہ شہادت پائی۔ اور سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ قاتلانِ عثمانؓ کے گروہ سے حضرت علیؓ کی آزادی اور بے تعلقی اب مشکل تر ہو گئی۔ اور اس کے نتیجے میں حضرت معاویہؓ کے ساتھ بھی کسی مصالحت کا امکان گویا بالکل ختم ہو گیا۔ کیونکہ اس میں ان قاتلوں کی موت یقینی تھی۔ وہ حضرت معاویہ کو اور حضرت معاویہؓ ان کو نہیں برداشت کر سکتے تھے۔

جنگِ جمل کے بعد حضرت علیؓ نے کوفہ کو اپنا دارالخلافہ قرار دے لیا اور یہاں سے پھر حضرت معاویہؓ کے ساتھ نامہ و پیام شروع کیا کہ وہ بیعت کریں اور اپنی معزولی قبول کر لیں۔ ان کی شرط تھی کہ قاتلانِ عثمانؓ سے قصاص لیا جائے۔ جو ظاہر ہے کہ کم از کم فوراً تو ناممکن بات تھی۔ چنانچہ جنگ کی ٹھن گئی اور شام و عراق کے درمیان صفین کے مقام پر جولائی اگست ۳۶ھ

میں طرفین کا آمنا سامنا ہوا اور تقریباً دو ماہ یہ جنگ چلی جس کا خاتمہ اس وقت ہوا جب حضرت معاویہ کے لشکر سے نیزوں پر قرآن اٹھا لیے گئے کہ قتل و قتال کی حد ہو گئی، اسے بند کرو اور قرآن کو حکم بنا لو۔ اسی کو واقعہ تحکیم کہا جاتا ہے۔ مقتولین کی تعداد ستر ہزار تک بتائی گئی ہے۔

حضرت علیؓ کی شہادت

حضرت علیؓ نے تحکیم کی پیش کش پر جنگ اپنی مرضی کے خلاف بعض اہم ساتھیوں کے دباؤ پر بند کی تھی۔ ورنہ آپ اس پیش کش کو ایک جنگی چال سمجھتے تھے اور واقعی اس کو قبول کرنے سے آپ کے محاذ کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ منجملہ اس کے یہ تھا کہ آپ کی فوج کا ایک حلقہ اس تحکیم کی بنا پر آپ سے ایسا برگشتہ ہوا کہ کافر ہی قرار دے دیا اور آپ سے برسرِ جنگ ہو گیا۔ یہ وہ لوگ تھے جو تاریخ اسلام میں خارجی اور "خوارج" کہلائے۔ انہی میں کے ایک نے رمضان سنہ ۴۰ھ میں آپ کو شہید کر دیا۔[1]

حضرت حسنؓ کی خلافت

آپ کی شہادت کے بعد ساتھیوں نے آپ کے بڑے صاحبزادے حضرت حسنؓ کو جانشین بنایا۔ حضرت حسنؓ نے باہمی خون خرابے کا ماحول ختم کرنے کے لیے حضرت معاویہؓ کے حق میں دست برداری کا فیصلہ کیا۔ یہ سنہ ۴۱ھ کی بات ہے جب کہ آپ کی خلافت کو چھ مہینے ہوئے تھے۔ حضرت معاویہؓ نے اس کے لیے آپ کے منہ مانگے شرائط منظور کیے اور ربیع الاول سنہ ۴۱ھ میں یہ مصالحانہ دست برداری پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی اس طرح یہ پانچ سال کا تفرقہ ختم کر اسلامی وحدت پھر سے بحال ہوئی۔ چنانچہ اس سال کو مسلمانوں

---

[1] ابتداءً یہ لوگ ان میں سے تھے جنہوں نے حضرت علیؓ کو مجبور کیا کہ تحکیم کو قبول کر لیں مگر بعد میں جب تحکیم کی عملی صورت یہ کی گئی کہ دو آدمی حکم بنائے جائیں تو یہ احمق بگڑ گئے کہ آدمی کو حکم بنانا قرآن کے خلاف ہے۔

نے "عام الجماعت" اجتماعیت واپس آنے کا سال قرار دیا۔

عالی مقام بیٹا

حضرت حسنؓ کے بارے میں ایک ارشادِ نبویؐ صحیح بخاری میں روایت ہوا ہے کہ آپؐ نے حضرت حسنؓ کی طرف اشارہ کر کے جبکہ وہ بچے ہی تھے، فرمایا کہ

ان ابنی ھذا سید ولعل اللّٰہ	میرا یہ بیٹا سید (عالی مقام) ہے
ان یصلح بہ بین فئتین عظیمتین	امید ہے کہ اللہ اس کے ذریعہ مسلمانوں
من المسلمین [1]	کے دو بڑے گروہوں میں صلح کرائے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد صحابہ کے بارے میں آتا ہے کہ انھوں نے جنگ جمل اور جنگ صفین (جو حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد مسلمانوں نے آپس میں لڑیں) سے اپنے آپ کو علیحدہ رکھا مثلاً حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت اسامہ بن زیدؓ، حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ۔ یہ اور ان کے ساتھ بہت سے حضرات اس اختلاف اور خانہ جنگی کو وہ فتنہ سمجھتے تھے جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو ڈرایا تھا۔ طبری نے جلیل القدر تابعی امام شعبیؒ (م ۱۰۳ھ) سے روایت کی ہے کہ:

باللہ الذی لا الٰہ الا ھو ما نھض	قسم خدائے وحدہٗ لاشریک کی، اس واقعہ
فی تلک الفتنۃ الا ستۃ بدریین	میں بدری صحابہ (جن کا درجہ سب سے اعلیٰ مانا
ما لھم سابع او سبعۃ ما لھم ثامن [2]	جاتا ہے) میں چھ کے سوا کوئی ساتواں
	یا سات کے سوا کوئی آٹھواں نہ تھا جو شریک ہوا ہو۔

---

[1] مشکوٰۃ بحوالہ بخاری باب مناقب اہل بیت۔ [2] طبری جزء ۵ صفحہ ۱۹۵ روایت میں چھ اور سات کا جو شک ہے اس کی وجہ طبری کی اگلی روایت کے مطابق حضرت ابوایوبؓ انصاری کے بارے میں امام شعبی کا شک ہے کہ وہ شریک تھے یا نہیں اور تاریخی تحقیق یہ بتاتی ہے کہ شریک نہیں تھے۔

حضرت حسنؓ کی عمر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں اگرچہ اتنی نہ تھی کہ وہ فتنہ کے متعلق آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے ایسے ارشادات اور تنبیہات سے واقف ہو سکتے جیسے ارشادات حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور دوسرے متعدد بزرگ صحابہؓ کو اس موقع پر یاد آرہے تھے[1] اور اس لیے وہ اپنے والد ماجد کے ساتھ جنگ جمل اور جنگ صفین دونوں میں اگرچہ شریک ہوئے۔ مگر ان کی طبیعت جس سانچے میں ڈھلی تھی اس کے زیر اثر ان کی ابتدائی کوشش یہی رہی تھی کہ ان کے والد ماجد حضرت علیؓ جنگ سے گریز فرمائیں۔ طبری اور ابن اثیر دونوں میں ہے کہ حضرت معاویہؓ کی طرف سے جب یہ جواب آگیا کہ وہ قصاص عثمانؓ کا مطالبہ پورا ہونے سے پہلے حضرت علیؓ کی خلافت تسلیم کرنے والے نہیں ہیں اور حضرت علیؓ اس وقت تک مدینے ہی میں تھے تو اہل مدینہ کو فکر ہوئی کہ پتہ چلے کہ اب علیؓ کا ارادہ کیا ہے؟ وہ معاویہؓ کے خلاف لشکر کشی کریں گے اور اس طرح اہل قبلہ کے[2] خلاف تلوار اٹھائیں گے یا اس سے رک جائیں گے۔ اور تجسس خاص کر اس لیے ہوا تھا کہ انہیں پتہ چلا تھا کہ حسنؓ اپنے والد کو یہ رائے دے رہے ہیں کہ وہ کوئی اقدام

---

[1] مثلاً حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے لوگوں کو یاد دلایا کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ عنقریب ایک فتنہ (آزمائش اور خیر یا صحیح معاملہ) رونما ہوگا جس میں بیٹھ رہنے والا کھڑے رہنے والے سے بہتر ہوگا اور کھڑا ہونے والا چلنے والے سے اور چلنے والا (یعنی پیدل چلنے والا) سوار (سواری پر چلنے والے) سے (ابن اثیر ج ۳ ص ۱۱۶) اسی فتنہ کا حوالہ ان تمام لوگوں کی گفتگوؤں میں ملتا ہے جنہوں نے حضرت علیؓ کی خلافت قبول کی مگر جنگ میں ان کا ساتھ قبول نہیں کیا۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ تو خود کسی سے کم تر بزرگ صحابی نہ تھے، انہیں کیوں فتنے کی یہ حدیثیں یاد آرہی تھیں؟ اس سلسلے میں کوئی قطعی بات تو نہیں کہی جا سکتی لیکن بظاہر آپ خلافت کی بیعت لے لینے کی وجہ سے نظم و ضبط کو اہم ترین ذمہ داری سمجھ رہے تھے اور یہ کہ فتنہ فرو ہونے کی یہی صورت ہے۔ واللہ اعلم۔

[2] اہل قبلہ کے خلاف تلوار اٹھانے کے الفاظ طبری اور ابن اثیر کی روایت ہی کے ہیں: "رأیہ فی قتال اهل القبلة: أیجترئ علیه ام ینکل عنه؟" طبری ج ۵ ص ۱۶۵۔

نہ کریں۔ روایت میں ہے؛

وقد علمهم ان الحسن بن علي	اور انھیں یہ معلوم ہو چکا تھا کہ حسن بن علیؓ
دعاه الى القعود وترك	اپنے والد کو یہ مشورہ دے رہے ہیں کہ آپ کوئی اقدام
الناس [1]	نہ کریں اور لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیں

ابن کثیر نے اس موقع پر حضرت حسنؓ کے الفاظ بھی نقل کیے ہیں کہ ان الفاظ میں آپ نے اپنے والد ماجد کو کسی اقدام کے خلاف رائے دی۔

يا ابت دع هذا فان فيه سفك	ابا جان! یہ نہ کیجئے، یہ ارادہ ترک کر دیجیے،
دماء المسلمين ووقوع	کیونکہ اس میں مسلمانوں کی خونریزی
الاختلاف بينهم [2]	اور باہم اختلاف انگیزی ہے۔

ابن اثیر[3] ہی میں ایک دوسری جگہ آتا ہے (اور طبری اور البدایہ والنہایہ میں بھی ہے) کہ اہل شام پر (یعنی حضرت معاویہؓ کے خلاف) فوج کشی کی تیاری ہو رہی تھی کہ پتہ چلا مکہ سے حضرت عائشہؓ کی سرکردگی اور حضرت زبیرؓ و طلحہؓ کی رہنمائی میں ایک فوج حضرت علیؓ کے ساتھیوں کی طرف سے (جن میں قاتلانِ عثمانؓ اور ان کے ہمنوا شامل تھے) بے اطمینانی کے ماتحت بصرہ کی طرف روانہ ہو گئی ہے تاکہ ان کے خلاف کارروائی کر کے حضرت علیؓ کو ان کے چنگل سے نکالا جائے، تو حضرت علیؓ نے بجائے شام جانے کے یکایک مدینے سے نکل کر ان لوگوں کو راستے میں روکنے کا فیصلہ کیا۔ روایت سے ایسا لگتا ہے کہ حضرت حسنؓ ساتھ نہیں تھے لیکن بعد میں پہنچ کر ربذہ کے مقام پر ملے[4]۔ نیز یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جیسے انکے روکنے سے حضرت علیؓ رکے نہیں تو وہ خود ان کے ساتھ روانہ نہیں ہوئے مگر پھر کچھ خیال

---

[1] ابن اثیر ج ۳ ص ۱۰۴ [2] البدایہ والنہایہ ج ۷ ص ۲۳۵ مطبعۃ الاصمعی۔ ریاض

[3] کیونکہ ابن اثیر کی اصل طبری ہی کی روایتیں ہیں اور اسی طرح البدایہ والنہایہ کی بھی اصل وہی ہے۔

[4] مدینے سے مکے کے راستے میں تین میل پر ایک مقام ہے۔

آیا تو پیچھے سے چل کر ربذہ پہنچے اور وہی گفتگو پھر کی جس کا اشارہ اوپر کی روایت میں ملتا ہے۔

وأتاه ابنه الحسن في الطريق	آپ کے بیٹے حسنؓ راستے میں آپ کے پاس آئے
فقال له لقد أمرتك فعصيتني فتقتل	اور کہا کہ میں نے کچھ آپ سے کہا تھا جو آپ نے
غداً بمضيعة لا ناصر لك	نہیں مانا نتیجہ یہ ہوگا کہ کل کو آپ بے یار
فقال له علي..... وما الذي	و مددگار مارے جائیں گے حضرت علیؓ
أمرتني فعصيتك قال أمرتك	نے کہا کہ تم نے مجھ سے کیا کہا تھا جو میں
يوم أُحيط بعثمان أن تخرج	نہیں مانا؟ کہا کہ جس دن عثمانؓ محصور کیے
عن المدينة فيقتل ولست	گئے میں نے آپ سے کہا تھا کہ آپ شہر سے
بها ثم أمرتك يوم قُتل أن لا	باہر چلے جائیں تاکہ آپ کی موجودگی میں کچھ نہ
تُبايع حتى تأتيك وفود العرب	ہو پھر جب عثمانؓ قتل کر دیئے گئے تو میں نے
وبيعة أهل كل مصر فإنهم لن	آپ سے کہا کہ آپ بیعت مت لیجیے حتیٰ کہ
يقطعوا أمراً دونك فأبيت علي	تمام عرب کے وفود آپ کے پاس آویں اور ہر شہر
وأمرتك حين خرجت هذه	کے لوگوں کی بیعت آجائے اس لیے کہ
المرأة وهذان الرجلان أن	یہ لوگ آپ کے سوا کسی کو منتخب کر ہی نہیں
تجلس في بيتك حتى يصطلحوا	سکتے آپ نے یہ بات بھی نہیں مانی اور پھر
فإن كان الفساد كان على يد	جب عائشہؓ اور زبیرؓ و طلحہؓ نکلے تو میں نے کہا کہ آپ
غيرك فعصيتني في ذالك	گھر بیٹھے رہیں حتیٰ کہ یہ باہم مصالحت ہو جائے کیونکہ
كله۔ [1]	اگر فساد ہونا ہے تو وہ آپ کے نہیں دوسرے
	کے ہاتھ سے ہو مگر آپ نے میری کوئی بھی بات نہیں مانی۔

حضرت علیؓ کی رائے میں صاحبزادے حسنؓ کا مشورہ صحیح نہ تھا اس لیے انھوں نے جس بات

---

[1] ابن اثیر ج ۳ ص ۱۱۱

کو صحیح سمجھا اس پر عمل فرمایا اور پھر باہمی جنگ اور خونریزی کا ایک طویل سلسلہ چلا جس میں حضرت حسنؓ بھی والد ماجد کے دوش بدوش شامل رہے مگر جب سنہ ۴۰ھ میں ایک خارجی کے ہاتھ سے حضرت علیؓ کی شہادت کا سانحہ پیش آیا اور آپ کی جانشینی کا بار حضرت حسنؓ کے کاندھوں پر رکھ دیا گیا تو اس وقت یہ حقیقت بالکل آئینہ ہو چکی تھی کہ اس اختلاف سے مسلمانوں کا بے پناہ نقصان ہو گیا تھا اور اب بھلائی اسی میں تھی کہ یہ باب بند کر دیا جائے۔ حضرت علیؓ کے حامیوں میں انتشار حکم عدولی اور شکست خوردگی کا مسلسل تجربہ بھی سامنے تھا اس لیے کہ دینی نقطۂ نظر سے بھی بہتری باہمی مصالحت ہی میں تھی، چنانچہ حضرت حسنؓ کے حصہ میں یہ سعادت آئی کہ ان کی پیش قدمی کی بدولت مسلمانوں کا پانچ سالہ تفرقہ مٹ گیا اور وہ پھر سے ایک جماعت بن گئے اور اس طرح وہ پیشگوئی بھی پوری ہوئی جو بخاری کی روایت کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے لیے فرمائی تھی کہ میرا یہ بیٹا بڑا عالی مقام ہوگا اس کے ذریعہ مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں کا تفرقہ مٹے گا۔

امن و یکجہتی کے بیس سال

حضرت معاویہؓ اور حضرت علیؓ کے اختلافات کی بدولت حضرت معاویہؓ کے بارے میں کسی کی کچھ بھی رائے ہو مگر ایک بات سے انکار کسی انصاف پسند کے لیے ممکن نہیں ہے کہ ان کے اندر عرب سرداری کی اعلیٰ ترین خصوصیات تھیں۔ ایک طرف وہ اپنے زمانے کی عرب ذہانت کے پانچ دور اندیشوں اور دیدہ وروں (دہات عرب) میں سے ایک مانے جاتے تھے اور انھوں نے ثابت کر دیا کہ ان پانچ میں وہ سب سے بڑھ کر تھے[1]۔ دوسری طرف سخاوت اور حلم کے بادشاہ، داد و دہش میں ہاتھ نہیں رکتا تھا اور بردباری کی انتہا نہیں تھی۔ چنانچہ حضرت معاویہؓ کی ان صفات نے

---

[1] باقی چار کے نام یہ ہیں: حضرت عمرو بن العاص، مغیرہ بن شعبہ، قیس بن سعد اور عبد اللہ بن بدیل۔ ان میں سے ۱ حضرت معاویہؓ کے ساتھ تھے ۱ غیر جانبدار رہے اور ۲ حضرت علیؓ کے ساتھ۔ طبری ج ۳ جزء ۶ ص ۱۳۹۔

تفرقہ کی خلیجوں کو پاٹنے اور اُس زمانے کی تلخ یادوں کو بھلانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ ان کا بیس سالہ دورِ حکومت (۴۱ھ تا ۶۰ھ) بالعموم امن و عافیت اور مسلمانوں کی یکجہتی کے ساتھ گزرا اور مسلمان آپس کی جنگ سے چھٹی پا کر ان محاذوں کی طرف واپس چلے گئے جہاں وہ دشمنانِ اسلام کے خلاف مصروفِ جنگ ہوتے اور نئی فتوحات حاصل کرتے تھے۔ ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں آپ کے حالاتِ زندگی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

> "خلافتِ عمری اور خلافتِ عثمانی میں معاویہؓ کے ہاتھوں شامی محاذ پر جہاد اور فتوحات کا جو شاندار سلسلہ چلتا رہا تھا وہ اُس وقت بالکل رک گیا جب ان کے اور علیؓ کے درمیان معرکوں کا دور چلا۔ ان دنوں میں نہ ان کے ہاتھ پر کوئی نئی فتح ہوئی نہ اُن کے ہاتھ پر۔۔۔ حتیٰ کہ حسنؓ کے ساتھ صلح ہوئی اور معاویہؓ کی خلافت پر جیسا کہ گزر چکا ہے ۴۱ھ میں، پوری اسلامی دنیا نے اتفاق کر لیا۔ اُس وقت سے لے کر اپنے سن وفات (۶۰ھ) تک وہ بے خلل و غش حکمراں رہے۔ اس شان کے ساتھ کہ دشمن کی سرزمین پر جہاد ہو رہا ہے، حق کا پرچم بلند ہے، چاروں طرف سے مالِ غنیمت آ رہا ہے اور مسلمان ان کے ساتھ آرام، انصاف اور عفو و درگزر کی فضا میں رہ رہے ہیں۔"[1]

حضرت معاویہؓ اور حضرات حسنینؓ

شیعہ علماء و مصنفین پر افسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے حُبِ علیؓ کے نام پر معاویہؓ دشمنی میں حضرت معاویہؓ کی مسلّم صفات حلم، سخاوت، و سماحت اور ان پر مبنی تاریخی حقائق کو بھی جھٹلانے کی مقدور بھر کوشش کی ہے۔ یہاں تک کہہ دیا کہ انہوں نے تو وہ وعدے بھی پورے نہیں کیے جو حضرت حسنؓ کے ساتھ شرائطِ صلح کے طور پر طے ہوئے تھے۔ حالانکہ ان کا معاملہ حضرت

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۲۹

حسنؓ ہی نہیں حضرت حسینؓ کے ساتھ بھی اس حد تک حسنِ سلوک اور رواداری کا تھا کہ اعلیٰ درجے کے علم، تدبّر اور کریم النفسی کے بغیر اس کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ مثال کے لئے خود انہی حضرات کی کتابوں میں یہ واقعہ مذکور ہے کہ ایک مرتبہ یمن سے دمشق کو ایک سرکاری قافلہ بہت سا قیمتی سامان مثلاً یمنی چادریں، عنبر اور دیگر خوشبوئیات لے کر حسبِ معمول مدینے سے گزر رہا تھا۔ حضرت حسینؓ نے روک کر اس کا تمام مال اتروا لیا اور حضرت معاویہؓ کو یہ خط لکھ کر بھیج دیا کہ "ایسا ایسا قافلہ جو دمشق میں تمہارے خزانے بھرنے اور تمہارے باپ کی اولاد کا سامانِ عیش بننے کے لیے جا رہا تھا میں نے اُسے روک کر اس کا مال لے لیا ہے کیونکہ مجھے ضرورت تھی۔"[1] ہم یقین نہیں کر سکتے کہ حضرت حسینؓ نے ایسی نامناسب زبان اپنے خط میں استعمال فرمائی ہوگی، گمان غالب ہے کہ خط کو یہ زبان ان حضرات کی عطا کردہ ہے جو اس بات کے روادار نہیں کہ حضرت حسینؓ کو حضرت معاویہؓ کے ساتھ اس سے بہتر زبان میں مخاطب ہوتا ہوا دیکھیں۔ بہرحال ان حضرات کی روایت کے مطابق یہ خط حضرت حسینؓ نے حضرت معاویہؓ کو لکھا۔ اب دیکھیے کہ اس کا کیا اور کس انداز کا جواب حضرت معاویہؓ نے انہی حضرات کی روایت کے مطابق دیا۔

> "اللہ کے بندے معاویہ کی طرف سے حسین بن علی کے نام۔ تمہارا خط ملا جس میں تم نے لکھا ہے کہ یمن سے آتا ہوا قافلہ روک کر اس کا سامان تم نے لے لیا ہے۔ لیکن تمہیں یہ چاہیے نہیں تھا جبکہ وہ میرے نام سے آ رہا تھا۔ کیونکہ یہ حق صاحبِ حکومت

---

[1] حیات الامام حسین بن علیؓ۔ از باقر شریف القرشی۔ مطبوعہ مؤسسۃ الوفاء بیروت ج ۲ ص ۲۳۲۔ نیز مقتل الحسینؓ از عبدالرزاق الموسوی المقرم، مطبوعہ دارالکتاب الاسلامی بیروت حاشیہ ص ۱۷۱ بحوالہ شرح نہج البلاغہ لابن حدید ج ۴ ص ۳۲۷ طبع اول۔ احتیاطاً خط کے عربی الفاظ کو بھی یہاں پڑھ لیجئے۔

من الحسین بن علی الی معاویۃ بن ابی سفیان، اما بعد! فان عیراً مرت بنا من الیمن تحمل مالاً وحللاً وعنبراً وطیباً الیک لتودعہا خزائن دمشق وتعل بہا بعد النہل بنی ابیک وانی احتجت الیہا فاخذتہا۔ والسلام۔

(والی) کا ہے کہ مال اس کے ہاتھ میں آوے لے پھر وہی اسکو تقسیم کرے۔ اللہ جانتا ہے کہ
اگر تم اسکو میرے پاس لگے رہتے تو میں ایمانداری سے تمہارا حصہ دینے میں کوئی کمی نہ
کرتا۔ لیکن بھتیجے! بات یہ ہے کہ تمہارے دماغ میں ذرا تیزی ہے۔ کاش کہ یہ بس میرے
ہی زمانے تک رہے کیونکہ میں تمہاری قدر و قیمت جانتا ہوں اور ایسی باتوں سے
درگذر کر لیتا ہوں۔ ڈر لگتا ہے کہ بعد میں تمہارا واسطہ کسی ایسے سے نہ پڑ جائے
جو تمہیں کوئی چھوٹ دینے کو تیار نہ ہو۔[1]

اس چھوٹی سی خط و کتابت سے کیا کیا باتیں ثابت ہوتی ہیں اس وقت اس کے احاطہ کا موقع نہیں صرف اتنی بات یہاں کہنا مقصود ہے کہ حضرت معاویہؓ کا یہ جواب دیکھ کر کسی ادنیٰ انصاف پسند کے لیے شبہ کی بھی گنجائش نہیں رہتی کہ وہ حضرات حسنینؓ کے ساتھ پاس لحاظ اور کریم النفسی کے سوا کوئی دوسرا معاملہ کرتے ہوں گے چہ جائیکہ وہ وعدے بھی پورے نہ کریں جس پر حضرت حسنؓ نے خلافت کی جنگ سے دستبرداری کی تھی۔[2]

یہ دعوے (یا یہ کہیے کہ حضرت معاویہؓ پر بد عہدی کا الزام) یوں تو شیعہ حضرات کے یہاں عام ہے لیکن بہت تعجب اس وقت ہوا جب اس مضمون کی تیاری کے سلسلے میں لکھنؤ کے

---

[1] حوالہ سابق۔ [2] حضرت حسینؓ اور حضرت معاویہؓ کی یہ خط و کتابت اور جس واقعے کے سلسلے میں یہ خط و کتابت ہوئی وہ واقعہ یہ سب کچھ شیعہ کتب کے حوالے سے درج کیا گیا ہے علاوہ خاص طور سے اس لیے درج کیا گیا ہے کہ انہی کے بیان سے ان کا یہ الزام غلط ثابت ہو جائے کہ حضرت معاویہؓ کا حضرت حسن حسین کے ساتھ معاملہ اچھا نہیں تھا۔ اس کے سوا اس واقعہ اور خط و کتابت کو یہاں درج کرنے کا کوئی دوسرا مقصد کوئی معقول آدمی نہیں سمجھ سکتا۔ مگر کتاب کا پہلا ایڈیشن (اردو) شائع ہوا تو کچھ لوگ جن کو کتاب کا عمومی روایتی انداز سے ہٹا ہوا ہونا ناگوار گزرا ہے انھوں نے اس واقعہ اور خط و کتابت کو بیان کرنے کا یہ مطلب بھی نکال لیا ہے کہ مصنف حضرت حسینؓ کو نعوذ باللہ ایک لٹیرا بتانا چاہتا ہے۔ ایسے لوگوں کو جواب کو کہاں دیا جا سکتا ہے۔ ہاں دعائے خیر ان کے لیے کی جا سکتی ہے۔

شیعہ عالم جناب سید علی نقی (المعروف بہ نقن صاحب) کی تصنیف "شہید انسانیت" دیکھتے ہوئے اس دعوے کی دلیل میں تاریخ طبری کا حوالہ نظر سے گزرا، یہ حوالہ جزو ۶ ص۹۳ کا ہے[1] طبری کے اس مقام پر واقعۃً یہ الفاظ پائے جاتے ہیں کہ "فَلَم یَفِ لِلحَسَنِ عَلَیہِ السّلام مِنَ الشُّرُوطِ شَیئًا"۔ جن کا ترجمہ اگر کوئی چاہے تو بے شک ان الفاظ میں کر سکتا ہے کہ "جتنی شرطیں کی گئی تھیں ان میں سے کوئی ایک بھی (معاویہؓ نے) پوری نہیں کی"۔ لیکن اہل علم سے بعید ہے کہ وہ طبری کے اس جملہ کا حوالہ اس مقصد کے لیے دیں کیونکہ اسی تاریخ طبری میں ایک صفحہ پہلے ص۹۲ پر گزر چکا ہے کہ:

وقد صالح الحسن معاویۃ علی	اور حسنؓ نے معاویہؓ سے صلح اس شرط پر
ان یَجعَلَ لہ ما فی بیت مالہ	کی تھی کہ کوفے کے بیت المال میں جو
وخراج دارابجرد علی ان لا	کچھ ہے وہ ان کا ہوگا نیز دارابگرد[2]
یُشتَمَ علیٌّ وھو یسمع فاخذ ما	کا خراج ان کو ملا کرے گا اور ان کے سامنے
فی بیت مالہ بالکوفۃ وکان فیہ	حضرت علیؓ پر سب و شتم نہیں ہوا کرے گا۔ پس
خمسۃ آلاف الف۔	انھوں نے وہ تمام رقم لے لی جو کوفے کے بیت المال
	میں تھی اور وہ پچاس لاکھ (درہم) تھی۔

اس کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ کوئی ایک شرط بھی پوری نہیں کی گئی۔

ایک صفحہ آگے چل کر یعنی ص۹۳ پر طبری نے جن شرائط کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ پوری نہیں کی گئیں، ان کا قصہ دوسرا تھا۔ وہ قصہ طبری ہی کے بیان کے مطابق یہ تھا کہ یہ شرائط جن کا بیان آیا یہ تو وہ تھیں جو حضرت حسنؓ نے حضرت معاویہؓ سے صلح کی خواہش کرتے ہوئے ان کو لکھ کر بھیجی تھیں۔ ادھر حضرت معاویہؓ خود نہیں چاہتے تھے کہ مسلمانوں کے درمیان

---

[1] شہید انسانیت ص۲۲۳، ۲۲۴۔ سید العلماء اکادمی لکھنؤ۔ [2] شہر کا نام ہے عربی میں اسکو دارابجرد لکھا گیا ہے مگر مولانا شبلی کی الفاروق سے معلوم ہوتا ہے کہ فارسی میں اس کا اصل نام دارابگرد ہے۔

کشت و خون کا سلسلہ چل رہا ہے۔ چنانچہ قبل اس کے کہ حضرت حسنؓ کا مراسلہ ان تک پہنچے انہوں نے خود دو آدمی ایک سادہ کاغذ پر دستخط کر کے اس پیغام کے ساتھ بھیجے تھے کہ حسنؓ جو شرائط صلح چاہیں اس کاغذ پر لکھ دیں مجھے منظور ہیں۔ چنانچہ حضرت حسنؓ نے اس کاغذ پر کچھ نئے شرائط بھی بڑھا کر لکھ دیئے۔ یہ تھے وہ شرائط جن کے بارے میں طبری کی ص ۹۳ کی روایت بتا رہی ہے کہ:۔

فاختلفا فی ذالک فلم ینفذ	ان شرائط کے بارے میں اختلاف ہوا
للحسن علیہ السلام۔ الخ	اور ان میں سے کوئی شرط معاویہؓ نے پوری نہیں کی۔

مولانا نقی صاحب نے اس پورے واقعہ کو قلم انداز کر دیا ہے اور افسوس ہے کہ اسی ایک جگہ نہیں اور بھی بہت سی جگہوں پر موصوف نے اسی طرح کا معاملہ شیعہ مزعومات کو نباہنے کیلئے اپنی اس تصنیف میں کیا ہے۔ جن میں سے بعض کا ذکر اپنے موقعہ پر آئے گا

بہرحال شرائط صلح پورے نہ کیے جانے کی بات بڑی زیادتی ہے ایک شرط کے بالکل نقد ایفاء کا ذکر تو طبری کی مذکورہ بالا روایت میں آ گیا ہے دوسری شرط داراب گرد کا خراج، اس کے بارے میں طبری کے اندر کوئی مزید روایت نہیں ملتی۔ لیکن دوسرے ذرائع مثلاً ابن اثیر کی تاریخ کامل اور ابن کثیر کی البدایہ والنہایہ سے معلوم ہوتا ہے کہ داراب گرد جس کا تعلق بصرہ کی ولایت سے تھا اس کے خراج والی شرط پر بصرہ کے لوگ معترض ہوئے کہ یہ خراج تو ہمارا حق ہے یہ کسی اور کو نہیں دیا جانا چاہیے۔ ابن اثیر نے بس اتنی ہی بات بیان کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ لیکن ابن کثیر نے لکھا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے اس کے بدلے میں ان کو سالانہ موجب نزاع کے بدلے میں ایک ہزار دینار منظور کیے جو حضرت حسنؓ اپنے حین حیات دمشق کے سالانہ سفروں میں علاوہ دیگر عطیات و تحائف کے وصول فرماتے رہے۔[1]

---

[1] فعوضہ معاویہؓ عن کل سنۃ ألف ألف درهم فی کل عام فلم یزل یتناولہ مع ما لہ فی کل زیادۃ من الجوائز والتحف الی ان توفی۔ البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۶۔

رہی تیسری شرط کہ کم از کم حضرت حسنؓ کی موجودگی میں حضرت علیؓ پر سب و شتم نہ کیا جائے اس کے بارے میں ابن اثیر کا بیان ہے کہ یہ شرط پوری نہیں کی گئی۔[1] اور تنہا یہ ایک بیان یہ تاثر دینے کے لیے کافی ہے کہ ابن اثیر بھی انہی مورخین میں سے ہیں جن پر حضرت علیؓ حسن و حسین (رضی اللہ عنہم) اور حضرت معاویہؓ و یزید کے درمیان والے معاملات میں آنکھ بند کر کے اعتماد نہیں کیا جانا چاہیے۔ کیونکہ یہ بیان اگر صداقت پر محمول کر لیا جائے تو ہمیں یہ ماننے کے لیے تیار ہونا پڑے گا کہ (معاذ اللہ) حضرت حسنؓ کو غیرت اور عزت نفس کی کوئی ادنیٰ مقدار بھی دربار حق تعالیٰ سے عطا نہیں ہوئی تھی، ان کے والد ماجد کو حضرت معاویہؓ اور ان کے لوگ منبر پر برا بھلا کہتے تھے اور حضرت حسنؓ اس کے باوجود کبھی ایک حرف شکایت بھی منہ پر لائے بغیر ہر سال دمشق جا کر مقررہ وظائف و تحائف انہی حضرت معاویہؓ کے ہاتھ سے وصول کیا کرتے تھے، کیسے ممکن ہے کہ اتنی نامناسب بات، جو شرائط صلح کے بھی خلاف تھی، حضرت معاویہؓ اور ان کے حکام کے طرز عمل میں شامل رہے اور حضرت حسنؓ ۹۔۱۰ سال تک[2] اسے خاموشی سے برداشت ہی نہ کرتے رہیں بلکہ حضرت معاویہؓ کی خدمت میں سالانہ حاضری بھی دیتے رہیں اور ان سے تحائف و وظائف لینا گوارا کرتے رہیں۔؟

ابن اثیر ہی نے دارابگرد کے خراج کے سلسلے میں اہل بصرہ کے اعتراض کی بابت یہ بھی لکھ دیا ہے کہ اس میں خود حضرت معاویہؓ کا اشارہ بھی شامل تھا مگر اس کا کوئی ثبوت؟ نہ ثبوت ہے نہ حوالہ۔ حالانکہ اگر اس بیان میں کچھ واقعیت ہوتی تو نہ تو یہ ممکن تھا کہ حضرت حسنؓ کو مصالحت کے وقت سے لے کر اپنی وفات تک (۹۔۱۰ سال کے عرصے میں) اس کا پتہ نہ چلتا جبکہ بصرہ بھی کوفے کی طرح آپ کی اور آپ کے والد ماجد کی عملداری کا حصہ رہا تھا اور نہ ہی یہ بات قابل تصور ہے کہ سب کچھ جانتے بوجھتے آپ چھ ہزار سالانہ کی جگہ ایک ہزار سالانہ پر خاموشی سے راضی رہتے ـــــ اور حضرت حسینؓ کے بارے میں اگر کسی

---

[1] ج ۳ ص ۲۷۲ مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۹۶۵ء۔ [2] صلح سنہ ۴۱ھ میں ہوئی اور حضرت حسنؓ کی وفات سنہ ۵۰ھ میں۔

طرح ان کی نرم طبیعت وغیرہ کے حوالے سے شرائطِ صلح کی یہ سب مبینہ کھلی اور چھپی خلاف ورزیاں قابلِ تحمل بھی مان لی جائیں تو حضرت حسینؓ کے بارے میں تو یہ تصور قطعی طور پر ناقابلِ قبول ہے ــــ ان کا مزاج بالکل مختلف تھا وہ سرے سے صلح کے ہی روادار نہ تھے۔ بس حضرت حسنؓ کے فیصلے سے مجبور ہو گئے تھے ابن کثیر نے لکھا ہے کہ:۔

> "جب خلافت حضرت حسنؓ کے ہاتھ میں آئی اور انھوں نے مصالحت کا فیصلہ کیا تو حضرت حسینؓ کو یہ فیصلہ بہت شاق گذرا۔ وہ اپنے بھائی کی رائے کو بالکل صحیح نہیں سمجھتے تھے اور مصر تھے کہ اہلِ شام سے قتال جاری رہے۔ ان کا اصرار اور صلح کی مخالفت یہاں تک تھی کہ حضرت حسنؓ کو کہنا پڑا کہ میں سوچتا ہوں کہ تمھیں گھر میں بند کر دوں اور جب تک مصالحت کی کارروائی سے پوری طرح فارغ نہ ہو جاؤں باہر نہ نکالوں۔"[1]

ایک روایت میں اس اختلافِ رائے کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت حسینؓ نے صلح کی بات سن کر حضرت حسنؓ سے کہا کہ "میں آپ کو قسم دیتا ہوں کہ اپنے باپ کو جھوٹا اور معاویہ کو سچا مت ٹھہرائیے اس پر حضرت حسنؓ نے یہ کہہ کر ان کو خاموش کیا کہ میں تم سے زیادہ جانتا ہوں۔"[2]

الغرض حضرت حسینؓ کا مزاج بالکل مختلف تھا۔ ان کے لیے کسی بھی طرح نہیں سوچا جا سکتا کہ وہ ایسے حالات اور معاملات کے ہوتے ہوئے حضرت معاویہؓ کے ساتھ اچھے تعلقات رکھنا گوارا کر سکتے تھے، حالانکہ اسی البدایہ والنہایہ میں مذکورہ بالا بیان کے بعد مذکور ہے کہ:۔

> "حسن کا یہ رویہ دیکھ کر حسین نے خاموشی اور موافقت اختیار کر لی اور پھر جب خلافت کی باگ ڈور پوری طرح معاویہ کے ہاتھ میں آ گئی تو اپنے بھائی حسن کے ساتھ حسین

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۸ صفحہ ۱۶۳ [2] ابن اثیر ج ۳ صفحہ ۲۰۳۔

> بھی معاویہ کے پاس آتے جاتے تھے اور معاویہ دونوں کا غیر معمولی اکرام فرماتے تھے
> مرحبا و اہلاً سے استقبال فرماتے اور بڑے بڑے عطیات دیتے ۔" [1]

حتیٰ کہ حضرت حسن کا انتقال (سنہ ۵۰ھ میں) ہوگیا تب بھی حضرت حسین نے حضرت معاویہ کے پاس سالانہ تشریف بری کا معمول تن تنہا ہی قائم رکھا۔ [2]

الغرض حضرت معاویہ اور حضرات حسنین کے درمیان جو حسن تعلق کی صورت اور بالخصوص حضرت معاویہ کی طرف سے اکرام و عطا کی جو روش ان کی خلافت کے پورے عرصے میں برقرار رہی، وہ نہ صرف اس الزام کی قطعی تردید کرتی ہے کہ حضرت معاویہ نے شرائط صلح کا احترام نہیں کیا تھا بلکہ ان بیانات کے لیے ایک تصدیق بھی فراہم کرتی ہے جو حضرت معاویہؓ کے حلم و عفو اور داد و دہش کے غیر معمولی اوصاف کے سلسلے میں مؤرخین کے یہاں ملتے ہیں۔ [3]

* * *

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۳۷ ۔ [2] ولما توفی الحسن کان الحسین یفد الی معاویۃ فی کل عام فیعطیہ و یکرمہ ۔ حوالہ سابق ۔ [3] مثلاً حضرت علیؓ کے دست راست حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا قول ہے جو طبری نے نقل کیا ہے کہ "میں نے حکومت کے لیے معاویہؓ سے بڑھ کر موزوں آدمی نہیں دیکھا کہ لوگوں کے ساتھ بے حد کشادہ دلی کا برتاؤ کرتے تھے" (ج ۶ ص ۱۸۴) یا خود حضرت معاویہؓ کا قول اپنے بارے میں جو حلم و عفو کی ایک آزمائش کے موقع پر ان کی زبان پر آیا کہ "مجھے گوارا نہیں کہ کوئی خطا میرے عفو سے بڑھ جائے اور کوئی جہالت میرے حلم سے یا کسی کی کوئی کمزوری ایسی بھی ہو جائے جس کی میں پردہ داری نہ کر سکوں اور کسی کی بدسلوکی ایسی جس کا جواب میں حسن سلوک سے نہ دے سکوں۔" (ایضاً ص ۱۸۱) ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ ج ۸ میں پورے ایک صفحہ (۱۳۶) پر حضرت معاویہؓ کے انہی اوصاف میں متعدد بیانات اور واقعات نقل کیے ہیں اور اپنے طور پر ان الفاظ میں ان کی ثنا بیان کی ہے کہ ... "یعنی انہ کان جمیل السیرۃ حسن التجاوز جمیل العفو کثیر الستر رحمہ اللہ" مختصر یہ کہ وہ عمدہ سیرت کے مالک، نہایت اعلیٰ عفو و درگذر کرنے والے اور عیوب کی بہت زیادہ پردہ داری کرنے والے تھے۔ (ج ۸ ص ۱۲۶)

باب دوم

کوفی مزاج ــــ ریشہ دوانیاں ــــ اور حضرت حسینؓ

حضرت معاویہؓ کے بارے میں یہ تھوڑی سی گفتگو بالکل ضمناً آگئی ورنہ اصل مدعا تو اُن حالات اور اسباب کی تحقیق تھی جن کے نتیجے میں حضرت معاویہؓ کا بیس سالہ پُرامن و پُرسکون دور ختم ہوتے ہی واقعہ کربلا جیسا سانحہ وجود میں آگیا۔ اسی تحقیق کے سلسلے میں اہلِ کوفہ کے مزاج و کردار کی خصوصیات کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے۔

اہلِ کوفہ

کوفہ کی بنیاد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے ہاتھوں سے پڑی تھی جو کسریٰ (فارس) حکومت کے خلاف اسلامی جہاد کے کمانڈر تھے۔ وہ مختلف عرب قبائل جو عراق کے محاذ پر مصروفِ جہاد تھے انہی کے خاندانوں سے یہ نیا شہر آباد کیا گیا۔ اور اس طرح یہ مسلمانوں کی سب سے بڑی چھاؤنی اور ان کی جنگی طاقت کا مرکز بن گیا۔ لیکن اس خصوصیت کے ساتھ اس شہر کی یہ خصوصیت بھی رہی کہ اس کے شہریوں میں بڑی تلوّن مزاجی اور بے سرے پن کی سی کیفیت پائی جاتی ہے۔ یہ اپنے حکام سے بہت جلدی ناراض ہو جاتے اور مرکز سے شکایتیں کرتے

نئے حاکم کا مطالبہ کرنے لگتے تھے۔ یہ حال حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے پورے زمانے میں رہا۔ بلکہ عثمانی خلافت کے آخری دنوں میں تو ان کا مرض بڑھ کر اس کھلی سرکشی اور شوریدہ سری تک پہنچا کہ حضرت عثمانؓ کی خلافت ہی نہیں اُن کی جان بھی اسی کی بھینٹ چڑھ گئی۔ اور اپنے ہی جیسے مصری اور بصری مفسدوں کے ساتھ مل کر ان لوگوں نے مدینۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم میں خوف و دہشت کی وہ فضا قائم کی کہ خلیفۃ الرسول کی تدفین بھی بمشکل تین دن بعد رات کے اندھیرے میں مسلمانوں کے عام قبرستان جنت البقیع سے الگ ایک احاطے میں کی جا سکی۔ جسے عہد اموی میں جنت البقیع سے ملایا گیا۔

حضرت عثمانؓ کی شہادت سے دو سال پہلے کے واقعات میں تاریخ کچھ کوفیوں کا نام لے کر بتاتی ہے کہ انہوں نے حکام کے خلاف شکایتوں کے اظہار سے بڑھ کر خود ادارۂ خلافت کو قریشی سلطنت کا نام دینا شروع کر دیا۔ امیر کوفہ سعید بن العاص نے اس فتنہ پردازی کے خلاف کارروائی کی اجازت یا جو کچھ اور مناسب سمجھا جائے اس کی ہدایت مانگی۔ حضرت عثمانؓ نے مناسب سمجھا کہ ان کو شہر بدر کر کے حضرت معاویہؓ کے پاس دمشق بھیج دیا جائے کہ وہ شاید ان کا کچھ علاج کر سکیں گے۔ مگر ان کے مرض کے مقابلہ میں حضرت معاویہ کی حکمت اور مہارت بھی کام نہ دے سکی۔ تب یہ لوگ حمص میں جہاں عبدالرحمٰن بن خالدؓ بن ولید امیر تھے، بھیجے گئے اور ان کے طریقۂ علاج (سختی) سے بظاہر یہ لوگ ٹھیک اور تائب ہو گئے مگر واقعے میں ایسا نہیں تھا۔ چنانچہ جیسے ہی کوفے میں کچھ اور لوگ ان کی والی صدا بلند کرنے کو کھڑے ہوئے تو یہ فوراً ہی نمودار ہو گئے اور پھر جب مصر اور بصرے میں انہی کی طرح سے مرکزی حکومت کے خلاف شکایتیں پالنے والے لوگ بھی ابن سبا کی سازشی تحریک کے ذریعہ ایک رابطے میں مربوط ہو گئے تب یہ سب سنہ ۳۵ھ میں حج کے سفر کا ڈھونگ رچا کر مدینے

پر جا چڑھے اور ۱۸ ذی الحجہ کو حضرت عثمانؓ کو شہید کر دیا۔ دو ڈھائی ہزار کے قریب ان سب کی تعداد بتائی گئی ہے[1] یہ سب جھوٹ یا سچ حضرت علیؓ کا دم بھرتے تھے چنانچہ بعد میں حضرت علیؓ کی بیعت بھی کی اور پھر جنگ جمل اور جنگ صفین میں آپ کے ساتھ نکلے اور جب جنگ جمل سے پہلے فریقین کی نیک نیتی کی بنا پر صلح کی شکل پیدا ہو گئی تو سبائیوں نے اس صلح کو تباہ کرنے کی جو کوشش کی جس کا ذکر گذشتہ باب میں آچکا ہے، تاریخ کے بیان کے مطابق اس میں شب خون مارنے کا اصل کردار کوفیوں ہی نے ادا کیا (ملاحظہ ہو ابن اثیر) اور پھر انہی کی بدولت صفین میں حضرت علیؓ جنگ بند کرنے پر مجبور ہوئے اور بعد میں آپ کا ہر دن ایسا گذرا کہ کہا جا سکتا ہے، آپ نے باقی وقت ان کے ساتھ رو رو کر پورا کیا۔ آپ کے اس دور کے خطبوں میں بار بار ایسے جملے ملتے ہیں کہ "سب سے بڑا دھوکہ کھانے والا وہ ہے جو تمہارے دھوکہ میں آیا۔"[2]

ایک خطبہ میں ہے:۔

ایها الفرقة التی اذا امرت	اے وہ گروہ کہ جب بھی میں نے کسی بات
لم تطع واذا دعوت لم تجب	کا حکم دیا اس نے نافرمانی کی، اور جب
ان امهلتم خضتم وان حوربتم	کسی کام کی طرف بلایا لبیک نہ کہی، ذرا
خرتم وان اجتمع النّاس علی	مہلت مل جاتی ہے تو فضولیات میں لگ
امام طعنتم	جاتے ہو اور جب دشمن حملہ آور ہو تو
لا ابا لغیرکم[3]	بزدلی دکھاتے ہو اور جب لوگ کسی
	امام پر جمع ہو جائیں تو تم کیڑے نکالتے
	ہو ... ہائے افسوس تم پر۔

---

[1] مزید تفصیل کیلئے دیکھیے تاریخ ابن اثیر اور تاریخ طبری۔ [2] نہج البلاغۃ ج ۱ ص ۸۳ دار المعرفۃ [3] ایضاً ج ۲ ص ۱۰ نہج البلاغۃ ایسے ارشادات سے بھری پڑی ہے اگر کوئی چاہے تو جلد اول ہی کا مطالعہ کافی ہوگا۔

یہی لوگ تھے کہ حضرت علیؓ کی زندگی میں جنگ سے جی چراتے اور آپ کے احکام سے سرتابی کرتے رہے اور جب حضرت حسنؓ نے مصالحت کی تو ان کے خیمے پر حملہ کر دیا۔ سامان بھی لوٹا اور زخم بھی لگایا[1] ظاہر ہے کہ ان لوگوں کا حضرت معاویہؓ کے ساتھ کیسے گزارا ہو سکتا تھا۔ چنانچہ حضرت معاویہؓ کے حلم نے اگر کہیں جواب دیا تو یہ کوفہ والوں ہی کے ساتھ ہوا۔

الغرض اس امن و امان اور اسلامی جمعیت کی بحالی کے دور میں اگر کہیں سے کچھ خلفشار پیدا کرنے کی خواہش اور جستجو ہوتی رہی تو وہ کوفہ ہی کی سرزمین سے تھی۔ حضرت حسینؓ کے متعلق ان لوگوں کو معلوم تھا کہ مصالحت سے وہ خوش نہ تھے۔ بس حضرت حسنؓ کے دباؤ سے مجبور ہو گئے تھے جیسا کہ اس سلسلے میں اوپر تاریخی بیان گزر چکا ہے۔ حضرت حسنؓ کی وفات کے بعد ان لوگوں نے سمجھا کہ اب حضرت حسینؓ کو آمادۂ جنگ کرنے کا وقت آگیا ہے۔ چنانچہ البدایہ والنہایہ کی روایت کے مطابق:۔

وقدم المسیب بن عتبة	مُسیّب بن عُتبہ فزاری حضرت حسنؓ
الفزاری فی عدة معه	کی وفات کے بعد مع کچھ اور آدمیوں
الحسین بعد وفاة الحسن	کے حضرت حسینؓ کے پاس آیا اور ان
فدعوه الی خلع معاویة[2]	لوگوں نے آپ کو حضرت معاویہ کی بیعت
	توڑنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔

پھر یزید کے لیے ولی عہدی کی بیعت کا قصہ کھڑا ہوا تب ان لوگوں نے از سر نو یہی کوشش کی۔

لما بایع الناس معاویة	جب لوگوں نے عام طور پر یزید کیلئے
لیزید کان حسین ممن لم	معاویہؓ سے بیعت کر لی تو حضرت حسینؓ

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۲۹ ابن اثیر ج ۳ ص ۲۰۳

[2] ج ۸ ص ۱۶۲۔

یبایع لہ۔ وکان اھل الکوفۃ	ان لوگوں میں سے تھے جنھوں نے بیعت نہیں کی
یکتبون الیہ یدعونہ الی	اور اسی بنا پر اہلِ کوفہ معاویہؓ کے زمانے
الخروج الیھم فی خلافۃ	میں حسینؓ کو لکھتے رہے تھے کہ مدینے سے
معاویۃ۔[1]	نکل کر ان کے پاس آجائیں۔

آگے ابن کثیر لکھتے ہیں :۔

کل ذالک یأبی علیھم[2]	حسینؓ نے ہر بار ہی ان کی اس بات
	کو قبول کرنے سے انکار کیا۔

حضرت حسینؓ کی رائے

لیکن حضرت حسینؓ کے اس انکار سے یہ سمجھ لینے کی گنجائش نہیں ہے کہ آپ کی اس رائے میں تبدیلی آگئی تھی جس رائے کی بنا پر آپ نے اپنے برادرِ بزرگ حضرت حسن کی مصالحت پسندی سے اختلاف فرمایا تھا۔ بلکہ دوسرے تاریخی بیانات کی روشنی میں نظر آتا ہے کہ آپ کی رائے میں تو کوئی فرق نہیں آیا تھا البتہ جو بیعت آپ حضرت حسن کے ساتھ حضرت معاویہ سے کر چکے تھے یا تو اس کا احترام آپ کو کسی ایسے اقدام سے مانع تھا جس کی طرف اہلِ کوفہ بلاتے تھے یا آپ کی رائے میں اب وہ قابلِ احترام تو نہیں رہی تھی مگر مصلحت نہیں معلوم ہوتی تھی کہ ایسا اقدام کیا جائے۔ تاریخ کے بیانات سے دونوں ہی امکانات سامنے آتے ہیں۔ البدایہ والنہایہ میں ہے کہ جب کوفیوں نے حضرت حسین کے پاس فتنہ انگیز آمد و رفت شروع کی تو مدینے کے گورنر مروان نے حضرت معاویہ کو اس کی اطلاع دیتے ہوئے خطرات کی پیش بندی کی طرف توجہ دلائی اس پر حضرت معاویہ نے حضرت حسین کو لکھا کہ،

ان من اعطی اللہ صفقتہ	جس شخص نے اللہ کو قول و قرار دیا ہو

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ج۸ ص۱۶۲ [2] ایضاً

يمينه وعهده لجدير بالوفاء وقد أنبئت أن قوماً من أهل الكوفة قد دعوك إلى الشقاق وأهل العراق من قد جربت قد أفسدوا على أبيك وأخيك فاتق الله واذكر الميثاق فإنك متى تكدني أكدك[1]

(یعنی بیعت کی ہو) اسکو لائق ہے کہ وفائے عہد کرے۔ مجھے اطلاع دی گئی ہے کہ کوفہ کے کچھ لوگوں نے تمھیں فتنہ آرائی کی دعوت دی ہے حالانکہ یہ اہل عراق وہ ہیں جنکو تم خوب جانتے ہو کہ انھوں نے تمھارے باپ بھائی کو کس فساد میں ڈالا۔ پس اللہ سے ڈرو، عہد یاد رکھو اور یہ کہ اگر تم نے میرے خلاف کوئی قدم اٹھایا تو میں بھی اٹھاؤنگا۔

اس خط پر حضرت حسینؓ کا جواب یہ نقل کیا گیا ہے

أتاني كتابك وأنا بغير الذي بلغك عني جدير والحسنات لا يهدي لها إلا الله وما أردت لك محاربة ولا عليك خلافاً وما أظن لي عند الله عذراً في ترك جهادك وما أعلم فتنة أعظم من ولايتك أمر هذه الأمة[2]

تمھارا خط ملا، معلوم ہوتا ہے کہ میرا حال اس کے مخالف ہے جو تمھیں میرے متعلق معلوم ہوا ہے اور یہ بس اللہ کا فضل ہے جسکے سوا نیکیوں کی ہدایت دینے والا اور کوئی نہیں، میں تمھارے خلاف کسی محاذ آرائی اور مخالفت کا ارادہ نہیں رکھتا ہوں، اگرچہ میں نہیں جانتا کہ تمھارے خلاف جہاد نہ کرنے کیلئے میرے پاس اللہ کے سامنے کیا عذر ہوگا اور میں نہیں جانتا کہ اس سے بڑھکر اور فتنہ کیا ہو سکتا ہے کہ تمھارے ہاتھ میں اس امت کی سربراہی ہو۔

---

[1] ج ۸ ص ۱۶۵

[2] ایضاً۔

اس جواب کے سخت لہجے کے باوجود یہ اندازہ ہوتا ہے ـــــ خاص کر پہلے فقرے کی روشنی میں ـــــ کہ حضرت حسین کے لیے اصلاً یہی بیعت مانع تھی۔ اور اس کو توڑ دینے کا خیال آپ نے اپنے آپ سے بعید اور اپنے لیے نازیبا قرار دیا تھا۔ لیکن کوئی شخص آخری فقروں کا سہارا لیکر کہنا چاہے تو کہہ سکتا ہے کہ بیعت کا خیال مانع نہیں تھا بلکہ بات مصلحت وقت کی تھی جو مانع ہو رہی تھی۔ یعنی حضرت معاویہ کے اقتدار کے استحکام کو دیکھتے ہوئے کسی مخالف اقدام کی کامیابی کا امکان نظر نہیں آتا تھا۔ اور شیعہ حضرات یہی کہتے ہیں، کیونکہ وہ تو سرے سے بیعت ہی کا انکار کرنا چاہتے ہیں۔ حیاۃ الامام الحسین، جس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے، کے شیعہ مصنف باقر شریف القرشی لکھتے ہیں کہ:

ولم یکن من رأی الامام الخروج	امام حسین کی رائے میں معاویہ کے خلاف
علی معاویة، وذالك لعلمه بفشل	خروج مناسب نہیں تھا کیونکہ وہ جانتے
الثورة وعدم نجاحها۔[1]	تھے کہ کامیابی نہیں ہوگی۔

اس کے بعد الاخبار الطوال ص۲۰۳ اور انساب الاشراف (ج ۱ ق ۱) کے حوالے سے آپ کا یہ خط بھی نقل کیا ہے جو اہل کوفہ کی طرف سے خروج کی دعوت کے جواب میں لکھا گیا تھا:

...... واما انا فلیس رأیی	اور جہاں تک میرا تعلق ہے تو آج کل
الیوم ذالك، فالصقوا رحمکم	میری رائے ابھی تک (خروج کی) نہیں
الله بالارض واکمنوا فی	ہے۔ پس تم لوگ جب تک کہ معاویہ
البیوت واحترسوا من	زندہ ہیں، زمین سے چپکے رہو، گھروں
الظنة ما دام معاویة حیًّا	میں قرار پکڑو اور کسی طرح کے شک
فان یحدث الله به حدثًا	شبہ کا ماحول مت پیدا کرو۔ ہاں

---

[1] حیاۃ الامام حسین ج ۲ ص۲۲۰۔

وانا حیّ کتبت الیکم برأیی۔ لہ	اگر معاویہ کو کچھ ہو گیا اور میں اس وقت زندہ ہوا تو میں تمھیں اپنی رائے سے آگاہ کروں گا۔

اس خط کا انداز بظاہر اُن لوگوں کی تائید میں جا رہا ہے جو سمجھتے ہیں کہ حضرت حسینؓ کا عدمِ خروج بر بنائے حالات و احتیاط تھا نہ کہ اُس بیعت کے احترام میں جو آپ نے حضرت حسنؓ کے ساتھ حضرت معاویہ کے ہاتھ پر کی تھی۔

بہر حال جو بھی واقعہ ہو، اس بات میں شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ حضرت حسینؓ کا یہ رویہ بس حضرت معاویہؓ کی زندگی تک کے لیے تھا۔ حضرت معاویہؓ نے اپنے بعد کے لیے جب بطور ولی عہد اپنے بیٹے یزید کا تقرر کیا اور چاہا کہ لوگ اُسے قبول کر لیں تو حضرت حسینؓ کا اس کو قبول کرنے اور یزید کے لیے بطور ولی عہد بیعت کرنے سے انکار اسی بات کی ایک علامت تھی کہ وہ اپنے آپ کو آئندہ کسی اقدام کے لیے آزاد رکھنا چاہتے تھے اور اس میں کچھ نہ کچھ دخل کوفیوں کا بلاشبہ تھا جیسا کہ مذکورہ بالا تاریخی بیانات سے ظاہر ہوتا ہے۔

باب سوم

یزید کی ولی عہدی کی تجویز اور حضرت مغیرہؓ بن شعبہ

مؤرخین (طبری، ابن اثیر، ابن کثیر وغیرہم) کے بیان کے مطابق سنہ۵۶ھ میں (یعنی اپنے انتقال سے ۴ سال پہلے) حضرت معاویہؓ نے طے کیا کہ اپنے بعد زمام خلافت سنبھالنے کے لیے یزید کو نامزد کر جائیں اور اس نامزدگی کے لیے رعایا سے رضامندی بھی حاصل کرلیں جس کی شکل اس زمانے میں بیعت تھی۔[1] تاکہ بعد میں کوئی جھگڑے قضیے کی صورت نہ پیدا ہو۔ حضرت معاویہ کی اس کوشش کی بابت آتا ہے کہ:۔

وفیہا دعا معاویۃ الناس الی البیعۃ لیزید ولدہ ان یکون ولی عہدہ من بعدہ...... فبایع لہ الناس فی سائر الاقالیم الا عبد الرحمٰن بن ابی بکر وعبد اللہ بن عمر والحسین بن علی وعبد اللہ بن زبیر وابن عباسؓ

اور اسی (سنہ ۵۶ھ) میں معاویہ نے تحریک کی کہ لوگ ان کیلئے ان کے بیٹے یزید کی ولی عہدی کے لیے بیعت کریں...... پس تمام اقالیم میں لوگوں نے اس کیلئے بیعت کرلی بسوائے عبدالرحمٰن بن ابی بکر کے اور سوائے عبداللہ بن عمر، حسین بن علی، عبداللہ بن زبیر اور عبداللہ بن عباس کے۔

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۸ ص۷۹ ۔

جہاں تک یزید کی ولی عہدی کے لیے نامزدگی کا تعلق ہے وہ ایک یقینی واقعہ ہے اسی طرح حضرت حسینؓ کا اس کو قبول کرنے سے انکار بھی ایک قطعی واقعہ ہے۔ مگر ان دونوں باتوں کی جو تفصیلات ہماری تاریخی کتابوں میں آتی ہیں ان میں ایک بڑا حصہ ناقابلِ یقین ہے۔ یہ تفصیلات چونکہ خوب شہرت پا چکی ہیں۔ اس لیے بہتر ہے کہ اس موقع پر تھوڑی سی گفتگو ان تفصیلات پر ہو جائے۔ اس باب میں ہم پہلے واقعے کی تفصیلات پر گفتگو کریں گے۔

ولی عہدی کی تجویز

یزید کو ولی عہد بنائے جانے کی تجویز کے سلسلے میں روایت بیان کی جاتی ہے کہ یہ تجویز صحابیِ رسول حضرت مغیرہ بن شعبہ نے پیش کی تھی اور اس کا پس منظر خالص ایک خود غرضانہ اور نفس پرستانہ پس منظر تھا۔ ایسی خود غرضی اور نفس پرستی کہ اس میں اسلام اور ملتِ اسلام کی بدخواہی بھی انھیں بخوشی منظور ہوئی[1] (والعیاذ باللہ)

حضرت مغیرہؓ کا مقامِ صحابیت

یہ مغیرہ بن شعبہؓ کون ہیں؟ ان اصحابِ کرام میں سے ہیں جنھیں ۶ھ میں صلح حدیبیہ کے موقع پر بیعتِ رضوان[2] میں شامل ہونے کا شرف حاصل ہے[3]۔ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر اصحابِ نبیؐ کی وہ بیعت ہے جس کے بارے میں قرآن پاک نے بشارت دی کہ

لَقَدْ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ	بیشک اللہ راضی ہوا ان مسلمانوں سے جب کہ (اے نبی)
یُبَایِعُوْنَکَ تَحْتَ الشَّجَرَۃِ (الفتح آیت ۱۸)	وہ درخت کے نیچے تمہارے ہاتھ پر بیعت کر رہے تھے۔

---

[1] روایت کی تفصیل آگے آتی ہے۔ [2] یعنی وہ بیعت جس پر رضائے الٰہی کی بشارت نازل ہوئی۔ [3] الاصابہ لابن حجر ج ۳ ص ۱۳۲، سیر اعلام النبلاء (از حافظ ذہبی ج ۳ ص ۲۱ بیروت) البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۴۸-۵۰

اور پھر اس صلح حدیبیہ کے موقع پر حضرت مغیرہ صرف شجر کا بیعت ہی میں نہ تھے بلکہ ان کا ایک اور خاص قابل ذکر کردار بھی اس موقع پر تھا جو ان کے ایمانی مرتبے کا اظہار کرتا ہے۔ وہ کردار یہ ہے کہ اس صلح کے موقع پر قریش مکہ کی طرف سے جو صاحب سفیر ہو کر گفتگو کے لیے آئے تھے وہ حضرت مغیرہ بن شعبہ کے چچا عروہ بن مسعود ثقفی تھے۔ عروہ بن مسعود نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو شروع کی تو ان کا ہاتھ بڑھ بڑھ کر بار بار آنحضرت کی ریش مبارک تک پہنچتا تھا۔ مغیرہ بن شعبہ تلوار لیے اور آہنی خود پہنے، جس میں چہرہ بھی چھپا ہوا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر کھڑے ہوئے تھے۔ اپنے چچا کے اس طرز گفتگو پر بگڑ کر بولے کہ "اپنا ہاتھ روک لو قبل اس کے کہ اس سے ہاتھ دھو بیٹھو" عروہ بن مسعود جو طائف اور مکہ کی نہایت مؤثر شخصیت تھے اس جملے پر سناٹے میں آ گئے۔ آنحضرت سے مخاطب ہو کر بولے کہ محمد! یہ کون شخص ہے؟ کس قدر بے تکی زبان میں بات کرتا ہے! آنحضرتؐ نے فرمایا "آپ ہی کا بھتیجا ہے۔[1]" —— اور یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ کوئی ایسے چچا بھتیجے تھے جن کے آپس کے تعلقات اچھے نہ رہے ہوں گے۔ نہیں ان کے آپس کے تعلقات نہایت اچھے تھے جس کی شہادت عروہ کا اگلا جملہ دیتا ہے۔ عروہ آنحضرتؐ کا جواب سن کر حضرت مغیرہ کی طرف متوجہ ہوئے اور بولے "اچھا یہ تم ہو، دھوکہ باز! جس کے کیے کو کل ہی میں نے بھرا ہے[2]" —— یہ اشارہ تھا اس واقعے کی طرف کہ حضرت مغیرہ جو ابھی کچھ دن پہلے اسلام لائے تھے، اس سے متصلاً پہلے انھوں نے ایک سفر میں اپنے ساتھیوں کی کسی بات پر خفا ہو کر ان سب کو تہ تیغ کر دیا تھا۔ عروہ بن مسعود نے ان سب کی دیت اپنے پاس سے ادا کر کے معاملے کو ختم کیا تھا۔

حضرت مغیرہ کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ جب ان کے شہر طائف والے (سنہ ۹ھ) میں مسلمان ہوئے تو ان کے مخصوص بت "لات" کا بت خانہ توڑنے کیلئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] سیر اعلام النبلاء ج ۳ ص ۲۵۔ [2] ایضاً۔

نے جن دو اشخاص کو بھیجا تھا ان میں سے ایک یہی مغیرہ بن شعبہ تھے[1]۔ (دوسرے ابوسفیان بن حرب تھے)

سنہ ۹ھ میں ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری غزوہ "غزوۂ تبوک" ہوا ہے۔ یہ غزوہ اپنی چند در چند سختیوں اور دشواریوں کی وجہ سے "غزوۂ عسرت" بھی کہلایا ہے۔ اور اسی حوالے سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کے شرکاء پر اپنی عنایت خاص کا اعلان بھی قرآن پاک کی سورۂ ۹ (التوبہ) میں بایں الفاظ فرمایا ہے۔

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ	اور اللہ نے رحمت کی نظر فرمائی نبیؐ پر
وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ	اور مہاجرین وانصار پر کہ جنہوں نے تنگی
الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ	کے وقت میں نبیؐ کا ساتھ دیا تھا جبکہ
الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ	ان میں سے بعض کے دل کج ہوتے جا رہے
قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ	تھے پھر اللہ نے ان پر بھی نظر رحمت
عَلَيْهِمْ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ	فرمائی بے شک وہ ان کے لیے رؤف
رَّحِيْمٌ ۝ (آیت ۱۱۷)	اور رحیم ہے۔

حضرت مغیرہ کو اس غزوہ میں شرکت کا بھی شرف حاصل تھا اور وہ مہاجرین کے زمرے میں تھے۔ حضرت مغیرہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ۳سو سے اوپر احادیث مروی ہیں۔ اسی غزوۂ تبوک کے موقع کی بھی ایک روایت چمڑے کے موزوں پر مسح کرنے ان سے بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی اور مؤطا امام مالک وغیرہ میں مروی ہوئی ہے، کہیں غزوۂ تبوک کے ذکر کے ساتھ اور کہیں بغیر اس کے ذکر کے[2]۔

حضرت مغیرہؓ خلفائے راشدینؓ کے دور میں

دورِ نبوی کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دور میں بھی وہ ایک معتمد شخصیت اور

---

[1] الاصابہ ج ۶ ص ۱۳۲   [2] دیکھئے سیر اعلام النبلاء ج ۳ ص ۲۲ مع حاشیہ۔

بغاوت میں نمایاں رہے[1]۔ شجاعت میں بھی مرد تھے اور تدبیر و حکمت اور فطانت و ذہانت میں بھی فرد، حافظ ذہبی لکھتے ہیں:۔

من كبار الصحابة اولی	بڑے درجے کے صحابہ میں سے تھے
الشجاعة والمكيدة شهد	صاحب شجاعت بھی اور صاحب مکر و
بيعة الرضوان۔[2]	تدبیر بھی۔

غیر معمولی ذہانت اور اصابت رائے کی بنا پر "مغیرة الرأی" کہلاتے اور دہاۃ عرب میں شمار ہوتے تھے[3]۔ حضرت عمر فاروقؓ کے دور میں بھی وہ معتمد رہے۔ بحرین کے گورنر بنائے گئے، بصرے کی گورنری پر رہے اور پھر کوفے کی[4]۔ بصرے کی گورنری کے زمانے میں ان پر ایک سنگین اخلاقی الزام لگا۔ حضرت عمرؓ نے معزول کرکے شہادت طلب کی۔ شہادت ناکام ہوئی تو روایت میں ہے کہ:۔

فكبّر عمر۔	حضرت عمرؓ نے خوشی سے تکبیر کہی۔[5]

اور اس کے بعد جب پھر ایک موقع آیا کہ کوفے کی گورنری کے سلسلے میں حضرت عمرؓ سخت پریشان تھے، جس آدمی کو بھی وہاں بھیجتے وہ ناکام ہوتا۔ اس لیے کہ جیسا کہ اوپر گزرا وہ سخت بے سرے لوگ تھے۔ ادھر کوئی حاکم بھیجا اور ادھر انہوں نے اس کے خلاف شکایتوں کا سلسلہ شروع کیا۔ تو اس موقع پر آپ نے گہرے غور و فکر اور مشاورت کے بعد حضرت مغیرہ بن شعبہؓ ہی کا انتخاب کیا۔

---

[1] حافظ ابن حجر نے الاصابہ میں لکھا ہے کہ یمامہ کے معرکے میں شامل تھے یعنی وہ شدید جنگ جو مسیلمہ کذاب کے خلاف ہوئی تھی ص ۱۳۲۔ اس کے بعد سواد عراق میں حیرہ کا شہر، تمام اسلامی حکومت کے دائرے میں آیا تو وہاں حضرت ابوبکرؓ کی طرف سے بکار سرکار بھیجے گئے ص ۱۳۲۔ [2] سیر اعلام النبلاء ج ۳ ص ۲۱۔ [3] اصابہ ج ۳ ص ۱۳۱، اعلام ج ۲ ص ۲۲۰۔ [4] اصابہ ص ۱۳۱-۱۳۲۔ [5] اعلام ج ۲ ص ۲۷۵۔

فاروقی انتظامیہ کا ایک اہم اصول اور حضرت مغیرہؓ

اس مشاورت اور انتخاب اور اس کے پس منظر کی تفصیل بجائے خود بڑی بصیرت افروز ہے اور فاروقی بلکہ اسلامی انتظامیہ (ADMINISTRATION) کا ایک نہایت اہم اصول اس کے ذریعہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ تفصیل یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت عمار بن یاسر کو کوفے کی گورنری پر بھیجا۔ حضرت عمارؓ ان سابقین اولین میں ہیں جنھوں نے بڑی مصیبتیں اسلام کی راہ میں اٹھائی ہیں، مگر کوفے والے تو بس کوفے والے، فوراً ہی شکایتیں شروع کردیں۔ نہ صرف یہ شکایت تھی کہ نااہل ہیں بلکہ یہ بھی کہ امانت و دیانت سے بھی خالی ہیں۔[1] حضرت عمرؓ نے واپس بلالیا اور کہا کہ عمار میں جانتا تھا کہ یہ کام تمہارے بس کا نہ ہوگا مگر میرا دھیان اس آیت کی طرف گیا جس میں ارشادِ حق ہے کہ:-

وَنُرِيدُ أَنْ نَمُنَّ عَلَى الَّذِينَ	اور ہم ارادہ کرتے ہیں کہ ان لوگوں پر احسان
اسْتُضْعِفُوا فِي الْأَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ	کریں جن کو کمزور بنا کر رکھ لیا گیا ہے
أَئِمَّةً وَنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ.	پس ان کو سربراہی دیں اور زمین
(سورہ ۲۸ (قصص) آیت ۵)	کی وراثت بخشیں۔

اس لیے میں نے تم کو بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ ان کو واپس بلانے کے بعد حضرت عمرؓ نے کوفے کے وفد سے پوچھا کہ اچھا تم بتاؤ کس کو چاہتے ہو۔ انھوں نے حضرت ابوموسیٰ اشعری کا نام لیا۔ یہ بھی بڑے پائے کے صحابی تھے ان لوگوں کے اپنے بھی تھے۔ یمن سے تعلق تھا اور یمن کے بہت سے قبیلے کوفے میں آبسے تھے۔ مگر سال بھر مشکل سے گزرا کہ ان کے حالات کی بھی شکایت شروع ہوگئی اور حضرت عمرؓ نے ان کو کوفے سے ہٹا کر بصرے بھیج دیا[2] اور اب اس خالی جگہ کے لیے فکرمند تھے کہ کیا کریں، کس کو بھیجیں۔ مسجد میں جا کر

---

[1] تاریخ ابن اثیر ج ۲ ص ۱۶ ۔ [2] ایضاً۔

لیٹے اور نیند آگئی۔ اسی حالت میں حضرت مغیرہ بن شعبہ وہاں پہنچ گئے، حضرت عمرؓ بیدار ہوئے تو انھوں نے اپنی قیافہ شناسی کے ماتحت کہا کہ آپ کچھ زیادہ ہی فکر مند معلوم ہوتے ہیں خیریت تو ہے۔ حضرت عمرؓ نے قصہ بتایا۔ اسی دوران میں اہلِ شوریٰ بھی آ گئے ان کے دریافت کرنے پر کہ معاملہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ:-

ان اھل الکوفۃ قد عضلونی ‏ ‏ ‏ ‏ اہل کوفہ نے مجھے بڑے مخمصے میں ڈالدیا ہے

اور پھر نئے تقرر کے سلسلے میں مشورہ طلب کرتے ہوئے ان حضرات سے فرمایا کہ مسئلہ میرے سامنے یہ ہے کہ حکام اور والیان کے تقرر کے سلسلے میں کیا اصول برتوں؟ اعلیٰ اسلامی صفات والے کو ترجیح دوں اگرچہ وہ انتظامی لحاظ سے کمزور ہو؟ یا انتظامی لحاظ سے مضبوط اور اہل افراد کو ترجیح دی جائے اگرچہ وہ اسلامی صفات کے لحاظ سے اعلیٰ مقام کے نہ ہوں بس میانہ رو ہوں۔ آپ کے الفاظ جو روایت میں نقل ہوئے ہیں وہ یہ ہیں:-

ما تقولون فی تولیۃ رجل ضعیف مسلم او رجل قوی مسدد؟

اس پر جواب دینے والے حضرت مغیرہ تھے انھوں نے فرمایا کہ:-

اما الضعیف المسلم فان اسلامہ لنفسہ وضعفہ علیک وعلی المسلمین واما القوی المسدد فان سدادہ لنفسہ وقوتہ لک وللمسلمین [1]	امیر المومنین! جہاں تک انتظامی اعتبار سے کمزور مگر اسلامی لحاظ سے اعلیٰ درجہ کے مسلمان کا سوال ہے تو اسکی اسلامیت کا فائدہ تو اسکی ذات کو پہنچے گا مگر اسکی کمزوری کا نقصان آپکو اور مسلمانوں کو، اسکے برعکس بس میانہ رو مگر مضبوط فرد ہو تو اسکی میانہ روی اسکے لیے ہوگی اور مضبوطی آپکے اور عامۃ المسلمین کے لیے۔

---

[1] "تاریخ ابن اثیر ج ۳ ص ۱۴

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے جب مذکورۂ بالا سوال اہلِ شوریٰ کے سامنے رکھا تھا تو ان کا اپنا رجحان بھی اسی طرف تھا۔ اور وہ جو شکایت ان سے مروی ہے کہ یا اللہ کیا کروں متقی ملتا ہے تو منتظم نہیں ہوتا اور جو منتظم ہوتا ہے اس میں تقویٰ نہیں ملتا۔ اس شکایت اور تجربے کے نتیجے میں بالآخر وہ یہی طے کرنے پر مائل ہو گئے تھے کہ تقویٰ کو کم اور انتظام کو زیادہ اہمیت دی جائے۔ چنانچہ اس موقع پر جو کہ آپ کی وفات سے دو ڈھائی سال پہلے رجب ۲۱ھ کا واقعہ ہے، حضرت مغیرہ کا جواب سننے کے بعد آپ نے گویا اسی کو قبول کر لیا اور حضرت مغیرہ ہی کے لیے طے کر دیا کہ وہ کوفے کی ذمہ داری سنبھالیں۔ روایت کے الفاظ ہیں:۔

فولّى المغيرة الكوفة فبقي	پس آپ نے کوفہ کی ولایت مغیرہ ہی کے سپرد
عليها حتى مات عمر رضي الله	کر دی اور وہ اس عہدے پر رہے حتیٰ کہ
عنه سنتين او ما يزيد[1]	حضرت عمرؓ نے وفات پائی اور یہ کوئی
	دو سال یا کچھ زیادہ کی مدت ہوئی۔

حضرت مغیرہؓ کی دوسری عظمت

حضرت مغیرہؓ کی ایک عظمت وہ تھی جو سورۂ توبہ اور سورۂ فتح کی ان قرآنی آیات سے ثابت ہوتی ہے جن کا حوالہ اوپر گزرا اور جن کی رو سے حضرت مغیرہ ایک طرف ان چودہ سو سرفروش انسانوں میں سے ہیں جن سے پروردگارِ عالم نے اپنی خوشنودی کا اعلان صلحِ حدیبیہ کے موقع پر فرمایا۔ اور دوسری طرف ان تیس ہزار فرمانبرداروں کی فہرست میں بھی ان کا نام ثبت ہے جن کو پروردگار نے غزوۂ عسرت کی صعوبتیں اٹھانے پر نظرِ کرم کی ایک خصوصی نظر سے سرفراز فرمایا۔ یہ ان کی ایک اور سب سے بلند تر عظمت تھی۔ دوسری عظمت اوپر کے واقعے سے سامنے آتی ہے کہ حدیبیہ اور تبوک کی سرفرازیاں حاصل ہونے کے باوجود ان کے لیے

---

[1] ابن اثیر ج ۳ ص ۱۶ ۔

یہ بات ذرا بھی پریشان کن نہیں ہوئی کہ حضرت عمرؓ جس گفتگو کے سیاق و سباق میں ان کو کوفے کی حکومت دے رہے ہیں اس کی رو سے اُن کا درجہ ایک ذرا کم متقی مسلمان کا ہو جاتا ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ انھوں نے تو گویا اپنے ہی ہاتھ سے اپنے اوپر "کم متقی مسلمان" کا لیبل لگا لیا۔ ظاہر ہے کہ سب صحابہ کرامؓ ایک درجہ کے نہیں تھے "تقویٰ اور طہارت" میں بھی ان کے درجات مختلف تھے۔ اور ایسے میں اُن کی عظمت کی بات کہا جا سکتا ہے کہ ایسی ایسی قرآنی بشارتوں سے سرفرازی کے باوجود اُن میں سے اگر کوئی اپنے آپ کو تقویٰ اور طہارت اور تدین میں صحابہؓ کمتر دیکھتا تھا تو بے تکلف اپنے آپ کو کمتر ہی جانتا اور کمتر سمجھے جانے پر راضی ہوتا تھا۔ اللہ کی طرف سے ملنے والی خوشنودیوں کے تمغے پر نظر کر کے غرے میں نہیں مبتلا ہوتا تھا البتہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد ... ولکن سددوا وقاربوا[1] پر تفکر کر کے اللہ سے آخرت میں عفو و عنایت کی امید رکھتا تھا۔

بدنام کن روایت کا متن

شیعہ حضرات سوائے تین چار کے تمام اصحاب نبیؐ کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ مرتد ہو گئے تھے بلکہ سابقین اولین ابو بکرؓ و عمرؓ اور عثمانؓ وغیرہ تو شروع ہی سے معاذ اللہ منافق تھے۔ ایسا گمان رکھنے والوں کے لیے ٹھیک ہے کہ وہ ان حضرات کی شان میں جو بھی چاہیں سوء ادب کریں مگر جو شخص اصحاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ایسے گمان کو اپنے لیے بدبختی کی بات سمجھتا ہو وہ کیسے مان سکتا ہے کہ یہ لوگ جنھوں نے اسلام کے لیے ایسی جاں نثاریاں اور فرمانبرداریاں کیں کہ خدائے پاک نے بھی سند قبولیت

---

[1] حدیث نبوی ہے: "ان الدین یسر ولن یشاد الدین احد الا غلبہ فسددوا وقاربوا وابشروا۔ الحدیث" اللہ کا دین آسان ہے جو کوئی اس میں شدت پسندی کریگا بالآخر مغلوب ہو جائیگا بس میانہ روی سے کام لو اور رضائے حق کی خوشخبری پاؤ۔ (مشکوٰۃ باب الاقتصاد فی العمل بحوالہ بخاری)

عطا فرمادی رہ اسلام کی جڑ کھودنے کا کام کرتے گئے اور فخر سے کہتے گئے کہ میں نے اسلام اور امت اسلامیہ کے لیے تباہی کی داغ بیل ڈال دی ہے"۔ یہی بدبختانہ بات ہے جو یزید کی ولی عہدی کی تجویز کے سلسلے میں حضرت مغیرہ جیسے صاحب فضائل صحابی رسول ﷺ کی طرف ہماری تاریخی کتابوں میں منسوب کی گئی ہے اور جس کے متعلق ہم نے کہا تھا کہ تفصیل آگے آئے گی۔ تاریخ کی جو کتابیں اس وقت ہمارے سامنے ہیں، ان میں سب سے زیادہ غضب ابن اثیر کی کتاب "الکامل فی التاریخ" میں ڈھایا گیا ہے۔ اور یہ بیان دیا گیا ہے کہ:۔

> اور اسی سنہ (۵۶ھ) میں لوگوں نے یزید بن معاویہ سے ولی عہدی کی بیعت کی۔ اور اس معاملے کی ابتدا مغیرہ بن شعبہ سے ہوئی تھی۔ ہوا یوں کہ معاویہ نے کوفے کی امارت سے مغیرہ کو معزول کر کے سعید بن عاص کو مقرر کرنے کا ارادہ کیا۔ مغیرہ کو یہ بات معلوم ہوئی تو انھوں نے طے کیا کہ مجھے معاویہ کے پاس جا کر خود ہی اپنا استعفا پیش کر دینا چاہیے تاکہ لوگوں کو یہ ظاہر ہو کہ مجھے اس عہدے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ پس یہ طے کر کے وہ معاویہ کے پاس گئے اور وہاں (دمشق) پہنچ کر اپنے دوستوں سے کہا کہ میں نے آج ولایت اور امارت حاصل نہیں کر لی تو پھر کبھی بھی نہیں کر سکوں گا۔ یہ کہہ کر سیدھے یزید کے پاس پہنچے اور اس سے بولے کہ یہاں بڑے بڑے اصحاب نبی صلے اللہ علیہ وسلم اور بزرگان قریش گزر چکے اب صرف ان کی اولاد رہ گئی ہے اور تم ان میں سے سمجھ بوجھ کے اعتبار سے بھی اور سنت و سیاست کے علم کے اعتبار سے بھی افضل لوگوں میں ہو۔ میں نہیں جانتا کہ آخر امیر المومنین کو کیا چیز مانع ہے کہ وہ تمھارے لیے ولی عہدی کی بیعت لے لیں۔ یزید یہ سن کر بولے کیا آپ سمجھتے ہیں کہ یہ بیل منڈھے چڑھے گی؟ مغیرہ نے کہا کیوں نہیں؟ پس یزید اپنے باپ کے پاس پہنچے اور یہ گفتگو بتائی۔ معاویہ نے یہ بات سن کر مغیرہ کو بلایا اور پوچھا کہ یہ یزید کیا کہہ رہا ہے؟

انہوں نے کہا کہ ہاں امیر المومنین! ٹھیک کہہ رہا ہے۔ میرے سامنے اس اختلاف اور خونریزی کا منظر ہے جو عثمانؓ کے قتل کے بعد رونما ہوا (میں نہیں چاہتا کہ یہ دوبارہ ہو) یزید کی شکل میں آپ کے بعد ذمہ داریوں کو سنبھالنے والا ایک فرد موجود ہے۔ پس اس کا تقرر کر دیجئے تاکہ آپ کو کچھ ہو تو لوگوں کے لیے ایک جائے پناہ اور آپ کا خلف موجود ہو اور کوئی فتنہ و فساد رونما نہ ہونے پائے۔ معاویہ نے یہ سن کر کہا کہ اس کام کی صورت کیا ہوگی؟ مغیرہ نے جواب دیا کہ کوفے والوں کو متفق کرنے کے لیے میں کافی ہوں۔ بصرے کے لیے زیاد موجود ہے اور ان دو بڑے شہروں کے بعد کوئی نہیں رہ جاتا جو آپ کی مخالفت کرے۔ معاویہ نے یہ سن کر کہا کہ اچھا تم اپنے منصب پر واپس جاؤ اور اپنے بھروسے کے لوگوں سے بات چیت کرو۔ پھر دیکھیں گے۔ یہ کہہ کر معاویہ نے ان کو رخصت کیا اور یہ لوٹ کر اپنے دوستوں میں پہنچے اور بولے کہ میں نے معاویہ کا پاؤں ایسی رکاب میں پھنسا دیا ہے کہ اب نکلنے والا نہیں ہے اور امت محمدیہ میں پھوٹ کا وہ سامان کیا ہے کہ اب ابد تک اس میں جوڑ کی صورت نہ ہو سکے[1]

کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی اور بھی ہے لیکن جتنا اوپر آیا اس کا آخری (خط کشیدہ) جملہ ایسا ہے کہ اس کے بعد کچھ اور سنانے کی ضرورت نہیں[2]۔

کیا کوئی گنجائش اس بات کی ہے کہ ہم اصحاب بیعت رضوان کے لیے اور مجاہدین غزوۂ تبوک کے لیے خدائے ذوالجلال کی وہ خوشنودی اور کرم فرمائی بھی مانیں جس کا نہایت بلند آہنگ اعلان قرآن پاک میں ہوا ہے۔ اور اس کے ساتھ ان میں سے کسی کے بارے میں یہ ماننے کو بھی تیار ہو جائیں کہ اس نے دنیا کی ایک حقیر غرض

---

[1] ابن اثیر ج ۳ صفحہ ۲۴۹۔ [2] اصل عربی الفاظ یہ ہیں: لقد وضعت رجل معاویۃ فی غرز بعید الغایۃ علی امۃ محمد وفتقت علیھم فتقا لا یرتق ابدا۔

کے لیے دیدہ و دانستہ نہ صرف اسلام دشمنی کا ایک کام کیا بلکہ اس کا فخریہ اعلان بھی دوستوں میں کیا؟ خدا کی پناہ اور ہزار بار پناہ۔ ہم یہ لغویات بلکہ کفریات، مان کر قرآن اور اس کے اعلان کو جھٹلانے کا کام کیسے کر سکتے ہیں؟

کچھ اور اس سے بڑھی ہوئی روایتیں

ہم نہیں کہہ سکتے کہ ہمارے ان قابل فخر مورخین کا معیار روایات کے قبول کرنے میں کیا تھا اور انھوں نے کیسے رافضیت سے وابستہ نہ ہونے کے باوجود ایسی روایت کو بلا نقد و تبصرہ لے لیا؟ لیکن ان پر آنکھ بند کر کے اعتماد ہم بہر حال نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ان کے یہاں تو اس سے بھی زیادہ ناقابل یقین اور ایمان سوز روایتیں موجود ہیں۔

حضرت مغیرہؓ کے بارے میں ایک روایت طبری میں ہے اور ابن اثیر نے بھی اسکو حسب عادت من و عن لے لیا ہے۔ سنیے اور خود فیصلہ کیجیے کہ کیا اس کو مانا جا سکتا ہے روایت ہے کہ:-

"سنہ ۴۰ھ میں حج مغیرہ بن شعبہ کی امارت میں ہوا۔"

اس کی تفصیل ابن جریر طبری اپنی سند کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ:-

"جب اس سال میں کہ جس میں علی قتل کیے گئے، موسم حج آیا تو مغیرہ بن شعبہ نے معاویہ کی طرف سے ایک جعلی خط بنایا اور اس کی بنیاد پر لوگوں کو سنہ ۴۰ھ کا حج کرا دیا۔ اور کہا گیا ہے کہ انھوں نے یوم ترویہ (۸ ذی الحجہ) میں وقوف عرفہ کرا دیا (جو ۹ تاریخ کو عرفات میں ہوتا ہے) اور عرفہ کے دن یعنی ۹ تاریخ کو قربانی کرا دی (جو ۱۰ تاریخ کو ہوتی ہے) لہذا اس طرح سے کرایا کہ کہیں ان کی جعل سازی کا پتہ نہ چل جائے۔ اور ایک بیان اس سلسلے میں یہ بھی ہے کہ یہ جلدی جلدی کی کاروائی انہوں نے اس لیے کی کہ انہیں اطلاع مل گئی تھی کہ کل صبح کو عتبہ بن ابی سفیان امیر حج کی حیثیت سے مکہ پہنچ جائیگا۔"

آپ ذرا غور کیجیے مغیرہ دشمنی میں کیسی کیسی خرافات تیار کرنے والوں نے تیار کی ہیں۔ اور ہماری تاریخی کتابوں میں ان کو جگہ مل گئی ہے۔ مان لیجیے مغیرہ بن شعبہ اُن فضائل سے آراستہ ہونے کے باوجود جن کا ذکر اوپر کیا گیا۔ اس حد تک بھی (معاذ اللہ) گر سکتے تھے کہ جعلی تقرر نامہ بنا کے حج کی امیری ہی نہ کریں بلکہ اس امیری کی خاطر حج کا حلیہ بھی بگاڑ دیں۔ یعنی ۹ ذی الحجہ کے بجائے ۸ کو حج (وقوف عرفہ) کرادیں اور ۱۰ کے بجائے ۹ کو قربانی کرادیں۔ لیکن کیا اس وقت کے اور وہ تمام مسلمان بھی اندھے ہو گئے تھے جو حج کرنے آئے تھے، ان میں سے کسی کو خبر نہیں رہی کہ مغیرہ کیا غضب کر رہے ہیں یا کسی کے بھی منہ میں زبان نہ تھی جو اُنھیں ٹوکتا؟ آخر کون اس بیہودہ روایت کو مان سکتا ہے؟ مگر ہم دیکھ رہے ہیں کہ تنہا طبری ہی نے نہیں اس کو قابلِ بیان نہیں سمجھا بلکہ ابن اثیر نے بھی بلا چون وچرا نقل کر دیا ہے۔ خدا بھلا کرے ابن کثیر نے ضرور اسے نقل کرنے کے بعد یہ کہنے کی ضرورت بھی سمجھی ہے کہ "یہ روایت باطل ہے، حضرت مغیرہ کے بارے میں ایسے گمان کی کوئی گنجائش نہیں، کیونکہ صحابۂ کرام ایسی باتوں سے بالاتر تھے یہ روایت[1] دراصل شیعیت کا شوشہ ہے۔

حاصل کلام

بہرحال اس کا امکان تو تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ حضرت مغیرہ نے ایک صاحب رائے اور دوراندیش انسان کی طرح جس کے لیے وہ مشہور تھے۔ حضرت معاویہ کے بعد اختلافات کے اندیشے سے یہ رائے قائم کی ہو کر اس کی پیش بندی کے لیے یزید کی ولی عہدی مناسب رہے گی۔ لیکن یہ بات کہ انھوں نے محض کوفے کی اپنی امارت بچانے کے لیے یہ داؤں کھیلا اور اس بات کا پورا شعور رکھتے ہوئے کھیلا کہ اس تجویز کے ذریعہ وہ امتِ مسلمہ کو

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۲

تباہی و بربادی کے راستے پر ڈال رہے ہیں۔ یہ قطعاً ناقابل قبول بات ہے قرآن پاک کی صاف صاف شہادت ہے کہ "اللہ ان سے راضی ہوا" ــــ "اللہ نے ان پر رحمت کی نظر کی" تو اس قرآنی شہادت کے مقابلے میں کوئی بھی ایسی روایت کیسے قابل قبول ہو سکتی ہے جو حضرت مغیرہ کو ایسے کردار کا حامل دکھائے جس کے ساتھ اللہ کی رحمت و رضامندی ہرگز جمع نہیں ہو سکتی؟ اور پھر روایت بھی وہ جس کی کوئی سند تک ہمارے سامنے نہیں ہے[1]۔

ایک اور پہلو

اتنی ہی بات نہیں کہ یزید کی ولی عہدی کے لیے حضرت مغیرہ کی تجویز کی یہ روایت از روئے درایت لائق تسلیم نہیں ہے بلکہ روایتی حیثیت سے بھی اس کی خامی یہ ہے کہ ابن اثیر تو اپنی بلا سند روایت میں واقعہ کی صورت یہ بیان کرتے ہیں جیسا کہ اوپر گزر چکا کہ سنہ ۹ھ میں حضرت معاویہ نے حضرت مغیرہ کو کوفہ کی امارت سے معزول کر کے سعید بن عاص کو ان کی جگہ لانے کا ارادہ کیا۔ مغیرہ کو پتہ چلا تو وہ اس ارادے سے سیدھے عازم دمشق ہوئے کہ عہدے سے اپنی بے نیازی ظاہر کرنے کے لیے خود جا کر استعفیٰ دیدیں الخ۔ جبکہ طبری میں سند کے ساتھ صورت واقعہ یہ بیان کی گئی ہے کہ مغیرہ اپنے ضعف کا عذر لے کر معاویہ کے پاس پہنچے کہ ان کا استعفیٰ قبول کر لیا جائے۔ جس پر حضرت معاویہ نے قبول کر لیا اور ان کی جگہ پر سعید بن العاص کو لانے کا ارادہ کیا۔

دونوں روایتوں میں صورت واقعہ بالکل مختلف ہے۔ ابن اثیر کی روایت میں حضرت معاویہ ارادہ کرتے ہیں کہ حضرت مغیرہ کو ہٹا کر سعید بن عاص کا تقرر کر دیں اور اس کو سن کر حضرت مغیرہ استعفیٰ دینے جاتے ہیں جبکہ طبری کی روایت میں حضرت مغیرہ خود سے استعفیٰ کے خواہش مند ہوتے ہیں اور نتیجۃً حضرت معاویہؓ ارادہ کرتے ہیں کہ سعید بن عاص

---

[1] تاریخ ابن اثیر میں سند کی روایت درج نہیں ہوتی۔

کا تقرر کر دیا جائے۔ اس اختلاف کی صورت میں طبری کی باسند روایت کو قدرتی طور پر ابن اثیر کی بے سند روایت پر ترجیح ہونی چاہیے۔ طبری کی روایت آگے ایسی کوئی بات نہیں بیان کرتی جس کو حضرت مغیرہ جیسے ایک صحابی رسول کے حق میں ماننا ہمارے لیے ممکن نہ ہو۔

طبری کی روایت کا سقم

لیکن طبری کی روایت میں بھی ایک جھول ہے یعنی آگے جو صورت واقعہ انھوں نے بیان کی ہے وہ عقلاً کچھ سمجھ میں آنے والی نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت مغیرہ کا استعفےٰ منظور ہونے اور سعید بن عاص کا ان کی جگہ پر نام آنے کی بھنک جو حضرت مغیرہ کے سکریٹری (کاتب) کے کان میں پڑی تو وہ (سعید کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے) ایک دم سعید کے پاس جا پہنچے اور خوشخبری سنائی۔ اس کا پتہ حضرت مغیرہ کو چل گیا اور یہ چیز جو انھیں ناگوار ہوئی تو ایک دم یزید کو ولی عہدی کا خواب دکھانے کی اسکیم تیار کر کے یزید کے پاس پہنچ گئے یزید یہ سنہرا خواب لے کے اپنے والد کے پاس پہنچے اور والد نے اس کی خوشی میں حضرت مغیرہ کو ان کی جگہ پر بحال کر کے کوفے واپس بھیج دیا کہ جائیں اور اس خواب کو واقعہ بنانے کی تدابیر کریں۔

مغیرہ بن شعبہ خود سے استعفےٰ دینے کو جاتے ہیں۔ ضعیف العمری کا تقاضہ ہے۔ پھر یہ کیا بات ہوئی کہ جو شخص ان کا سکریٹری تھا وہ نئے ہونے والے امیر کو خوش کرنے کیلئے اس کے پاس خوشخبری لے کر پہنچ گیا تو آپ نہ صرف اس سے بگڑ گئے بلکہ اپنا استعفےٰ ہی الغا کرنے کی ٹھان لی۔ یہ تو ایک بچوں والا مزاج ہوا۔ حالانکہ مغیرہ مانے ہوئے صاحب رائے اور دانشمند اور تدبر کے پتلے میں ہیں! بظاہر روایت کا یہی ناقابل فہم پہلو ہے جس کی بنا پر ابن کثیر نے اسے طبری ہی کے حوالے سے درج کرنے کے باوجود اس کا یہ حصہ کا دین

والا جزو نکال کر بس یوں بیان کیا ہے کہ:-

> ...... استعفے منظور ہونے اور سعید بن عاص کا تقرر کیے جانے کی خبر سننے سے مغیرہ کو شاید کچھ کھٹکا سا ہوا جس کی بنا پر وہ یزید کے پاس گئے۔ الخ[1] ......"

اور چونکہ ابن اثیر نے اپنی کتاب کے مقدمہ میں صراحۃً لکھا ہے کہ انھوں نے اپنی کتاب کی بنیاد اصلاً طبری کی روایات پر رکھی ہے اور بعد میں وہ دوسری کی روایات سے مناسب اضافے کرتے ہیں اس لیے یہ سمجھنا غلط نہ ہوگا کہ اصل روایت تو ان کے سامنے بھی طبری ہی کی ہے مگر ابن کثیر کی طرح انہوں نے بھی اس کو اصل صورت سے پیش کرنے میں دقت محسوس کی تو اس کی اصلاح انہوں نے ابن کثیر سے بھی زیادہ کر دی۔ اور خود ہی استعفےٰ دیکر خود ہی نادم ہونے کو بھی حضرت مغیرہ جیسے ہوشمند اور پختہ کار سے بعید دیکھ کر واقعہ کو یوں بیان کیا کہ اصل ارادہ معاویہ کی طرف سے ہوا تھا کہ مغیرہ کو معزول کر کے سعید کا تقرر کر دیا جائے۔ مغیرہ کو اس کی بھنک پڑی تو وہ اس کی کاٹ کے لیے اپنا استعفےٰ لے کر پہنچ گئے۔ اور استعفےٰ کے ساتھ ساتھ یزید کے کان میں ولی عہدی کا افسوں بھی پھونک دیا جس کے نتیجے میں معاویہؓ کو خود ہی ضرورت محسوس ہوئی کہ مغیرہ کو ان کے عہدے پر باقی رکھا جائے[2]۔

سوال یہ ہے کہ ایسی روایت کی وقعت کیا ہے جو اتنی ناقابل فہم ہو کہ طبری کا نام لیکر بیان کرنے والے بھی اس کو کافی رد و بدل کے بغیر بیان کے قابل نہ سمجھتے ہوں؟

ایک اور سوال

حضرت مغیرہ بن شعبہ کا انتقال معتبر روایات کے مطابق سنہ ۴۹ھ یا سنہ ۵۰ھ میں

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۸۲ [2] ابن اثیر کی بیان کردہ روایتوں کا پورا ترجمہ اوپر گزر چکا ہے۔

ہو جاتا ہے[1]۔ اب ذرا غور کیجیے کہ طبری کی روایت بھی ہے اگرچہ بہت مختصر طور پر[2] اور ابن اثیر نے تو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے کہ مغیرہ بن شعبہ جب کوفے واپس گئے تو حضرت معاویہ سے کیے ہوئے وعدے کے مطابق یزید کی ولی عہدی کے لیے زمین ہموار کرنے میں لگ گئے اور پھر وفود تیار کر کے دمشق بھیجے جو حضرت معاویہ سے جا کر درخواست کریں کہ اپنے بعد کیلئے یزید کی ولی عہدی کی شکل میں بندوبست کر جائیں[3]۔ لیکن یہ ساری روایتیں انہیں سنہ ۵۶ھ کے واقعات کے ذیل میں آتی ہیں بایں طور کہ سنہ ۵۶ھ میں یزید کو ولی عہد سلطنت بنایا گیا اور اس کی تجویز دراصل مغیرہ بن شعبہ نے رکھی تھی اور اس طرح قصہ پیش آیا تھا۔

سوال یہ ہے کہ یہ قصہ پیش آیا کب تھا؟ کون سے سنہ کی بات ہے؟ اور جس سنہ میں یہ قصہ پیش آیا کہ مغیرہ بن شعبہ نے استعفیٰ دیا یا وہ معزول کیے گئے اور پھر انہوں نے یزید کی ولی عہدی کی تجویز سے حضرت معاویہؓ کو خوش کر کے اپنا عہدہ بچایا اس کا ذکر اسی سنہ کے واقعات میں کہیں کیوں نہیں ملتا جس سنہ میں یہ واقعہ پیش آیا تھا اور جو ۵۰ھ یا اس سے پہلے ہی کا کوئی سنہ ہو سکتا ہے جبکہ حضرت مغیرہ زندہ تھے) طبری اور ابن اثیر کے صفحات حکام کی معزولیوں، تقرریوں، استعفوں اور قتلوں کے تذکروں سے بھرے ہوئے ہیں، حتیٰ کہ خود مغیرہ بن شعبہؓ ہی کا بالکل اسی طرح کا ایک استعفیٰ دینے کا واقعہ بھی سنہ ۴۵ھ کے واقعات میں موجود ہے[4]۔ لیکن جس معزولی اور دوبارہ تقرری کا تعلق یزید کی ولی عہدی جیسے اہم واقعہ سے ہے اور پھر اس کے ساتھ حضرت مغیرہ کے بھیجے ہوئے وفود کا دمشق آنا جانا بھی جڑا ہوا ہے، اس کا ذکر اور اس کے اہم متعلقات اور نتائج کا ذکر ہمیں سنہ موضوعہ کے اندر نہیں ملتا۔ اس کے بعد اس ولی عہدی سے لوگوں کے اختلاف کی باتیں چلتی ہیں۔ بات حضرت حسینؓ اور حضرت ابن زبیر کے خروج اور معرکہ آرائی تک

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۸۰، ابن اثیر ج ۳ ص ۲۴۷ بیان واقعات سنہ ۵۶ھ۔ [2] طبری ج ۶ ص ۱۲۹

[3] پوری تفصیل کے لیے دیکھیے ابن اثیر ج ۳ ص ۲۴۹ [4] دیکھیے طبری ج ۶ ص ۱۲۴-۱۲۵

پہنچتی ہے۔ طرح طرح کی گفتگوئیں ہیں، تبصرے ہیں، تنقید ہے، تائید ہے کسی ذیل میں بھی ہمیں حضرت مغیرہؓ کا نام اس سلسلے میں سننے کو نہیں ملتا۔ حالانکہ یہ بالکل قدرتی بات تھی کہ کہیں حضرت معاویہؓ کے ہی منہ پر اپنی پوزیشن کی صفائی کے سلسلے میں یہ نام آتا کہ بھائی یہ تو ایک غیر اموی کا تجویز کیا ہوا نام ہے، اور وہ بھی ایسے ایسے اوصاف و فضائل رکھنے والا! اسی طرح عادۃً غیر ممکن تھا کہ اس ولی عہدی کی مخالفت کرنے والے اور پھر ولی عہد سے لڑائی لڑنے والے اس کو اور اس کے باپ کو برا بھلا کہنے کے ساتھ دو چار نام اس تجویز پیش کرنے والے کو بھی نہ رکھتے۔ سنہ ۵۶ھ کی ان روایتوں کے علاوہ جن کا ذکر اوپر کیا گیا کہیں سے کہیں تک آپ کو حضرت مغیرہ کا ذکر اس قضیے سے جڑا ہوا نہیں ملے گا۔ کیا معاملے کا یہ پہلو ان روایتوں کی واقعیت میں شک پیدا کرنے کا حق نہیں رکھتا۔

اور اب سند کی بات

اور سند کے لحاظ سے بھی یہ روایت کوئی قابلِ اعتناء درجہ کی نہیں ہے۔ اس کے ایک راوی علی بن مجاہد کے بارے میں ابن معین کا قول ہے کہ "کان یضع الحدیث" حدیثیں گھڑا کرتا تھا۔ (میزان الاعتدال ج ۳ ص ۱۵۲) جو شخص حدیثیں گھڑ سکتا ہو وہ تاریخی روایات میں کیا کچھ نہیں کر سکتا؟ حافظ ابن حجر تقریب التہذیب میں لکھتے ہیں کہ "متروک ہیں" اور "لیس فی شیوخ احمد اضعف منہ" (امام احمد کے شیوخ (اساتذہ) میں ان سے زیادہ ضعیف کوئی دوسرا نہیں ہے) (ج ۱ ص ۲۴)

باب چہارم

ولی عہدی کی راہ میں زیاد کا وجود رکاوٹ؟

یزید کی ولی عہدی کی تجویز کے سلسلے میں جو راوی یہ بتاتے ہیں کہ یہ تجویز کوفے کے اموی گورنر مغیرہؓ بن شعبہ کے دماغ سے نکلی تھی، اور نہایت بچکانہ حرکت کے طور پر نکلی تھی، وہی راوی ایک مزید بات اس سلسلے میں یہ بھی بتاتے ہیں کہ حضرت معاویہ نے اپنے ایک دوسرے اہم گورنر زیاد سے بھی اس سلسلے میں رائے مانگی تھی اور اس نے رائے یہ دی کہ اس معاملے میں عجلت مناسب نہیں ہے، فی الحال اسکو التوا میں رکھنا اور موزوں حالات کا انتظار کرنا مناسب ہوگا۔ حضرت معاویہ نے یہ رائے بلا چون و چرا قبول کر لی۔[1] اس کے

---

[1] طبری ج ۲ صـ ۱۷۱۔ زیاد بصرے کا گورنر تھا۔ اس کو زیاد بن ابیہ، زیاد بن سُمَیّہ، زیاد بن ابی سفیان وغیرہ کئی ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ یعنی نسب کے اعتبار سے ایک کمزور آدمی تھا۔ مگر نہایت باصلاحیت۔ طائف کے قبیلہ ثقیف میں ہجری کے سنہ ۱ میں پیدا ہوا۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں اس کی صلاحیتیں کھلنا شروع ہوئیں اور حضرت عمرؓ نے اسے بڑھاوا دیا۔ بصرہ میں گورنروں کا سکرٹری رہا۔ حضرت علیؓ کا عہد آیا تو آپ نے اسے فارس کی گورنری دی۔ اور حضرت حسنؓ کی صلح کے بعد بھی ایک گورنر تھا جس نے سال بھر تک حضرت معاویہ کے اقتدار کو تسلیم نہیں کیا بالآخر ۴۲ھ میں اطاعت قبول کر لی اور کوفے میں رہائش کی اجازت حاصل کی۔ حضرت معاویہ اس سے اتنے خائف تھے (باقی آئندہ صفحہ پر)

بعد انہی راویوں کی یہ بھی روایت ہے کہ۔

لما مات زیاد دعا بکتاب	جب زیاد کا انتقال ہو گیا تو معاویہ نے
بکتاب فقرأ علی النّاس	یزید کو خلیفہ نامزد کرنے کی ایک دستاویز
باستخلاف یزید۔ ان حدث	تیار کرا کے لوگوں کے سامنے پڑھی جو
به حدث الموت فیزید	یہ تھی کہ معاویہ کی موت واقع ہو جائے
ولی عهد فاستوثق النّاس	تو یزید جانشین ہوگا جس پر سب لوگوں
علی البیعة لیزید الا خمسة	نے سوائے پانچ افراد کے
نفر [1]	یزید کی ولیعہدی کے لیے اپنا اقرار
	دیا۔

روایت کے الفاظ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے حضرت معاویہ کو بس زیاد کی موت کا انتظار تھا۔ چنانچہ ابن اثیر اور ابن کثیر دونوں نے بھی جو واقعات کو طبری کی طرح الگ الگ روایات میں توڑ کر نہیں بلکہ ایک تسلسل کے ساتھ بیان کرتے ہیں، زیاد کا مشورہ اور حضرت معاویہ کے یہاں اس کی قبولیت نقل کرنے کے بعد استخلافِ یزید کی از سر نو تحریک کو زیاد کی موت کے ساتھ بالکل اسی طرح جوڑ کے بیان کیا ہے جیسے بس زیاد کا وجود اس راہ میں رکاوٹ تھا، وہ ہٹا اور حضرت معاویہ از سر نو سرگرم ہو گئے[2] حالانکہ زیاد کا انتقال باتفاقِ مورخین ۵۳ھ میں

(گذشتہ صفحہ کا بقیہ) کوفہ کے گورنر حضرت مغیرہ کو لکھا کہ زیاد اور اس کے ساتھ فلاں فلاں ترپال شیعانِ علی کو پابند کر دو کہ نماز با جماعت مسجد میں پڑھیں اور ہمیشہ نگاہ میں رہیں، مگر نہ تو زیاد جیسا آدمی ایسی زندگی پر راضی رہ سکتا تھا نہ حضرت معاویہؓ ایسے کارآمد آدمی کو اپنا بنائے بغیر چھوڑ سکتے تھے۔ بالآخر دونوں قریب آئے اور ۴۵ھ میں زیاد کو بصرے کی گورنری مل گئی اور پھر مسلسل ترقیاں پاتا ہوا ۵۳ھ میں انتقال کر گیا۔ (طبری ج ۶ ۔ ابن اثیر ج ۳ ۔ سیر اعلام النبلاء ج ۳ ۔

[1] طبری ج ۶ ص ۱۷۰ [2] ابن اثیر ج ۳ ص ۲۵۰ البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۷۹ ۔

ہو گیا تھا۔[1] جبکہ حضرت معاویہ کی از سرِ نو سرگرمی کا وقت ۵۶ھ میں بتایا جا رہا ہے۔ ۵۶ھ کے واقعات کے عنوان کے تحت طبری کے الفاظ ہیں۔

وفیھا دعا معاویۃ الناس	اور اسی سنہ میں معاویہ نے لوگوں کو
الی بیعۃ ابنہ یزید من بعدہ	اپنے بعد اپنے بیٹے یزید کی بیعت کی دعوت
وجعلہ ولی العہد لہ	دی اور اسے ولی عہد بنا دیا۔

اور تقریباً یہی الفاظ ابن کثیر اور ابن اثیر کے یہاں بھی پائے جاتے ہیں۔

پس اول تو کوئی وجہ ایسی سامنے نہیں ہے جس کی بنا پر یہ سمجھنا معقول ہو کہ حضرت معاویہ زیاد کے خوف سے اپنی دلی خواہش دبائے بیٹھے رہے۔ دوسرے اگر یہی واقعہ تھا تو زیاد کا انتقال ۵۳ھ میں ہو جانے کے بعد ۵۶ھ تک یزید کو کون چیز انہیں روکے رہی؟ اور پھر کیا تک ہے کہ ۵۶ھ میں ہونے والے واقعہ کو اس انداز سے بیان کیا جائے کہ جیسے وہ زیاد کی موت کے فوراً بعد ہی پیش آگیا تھا جو کہ تین سال قبل ۵۳ھ میں ہو چکی تھی؟

قرینِ قیاس بات

جہاں تک زیاد سے مشورے کا سوال ہے، وہ تو عین ممکن بلکہ قرینِ قیاس ہے، کیونکہ زیاد کا تعاون ناگزیر تھا، لیکن تجویز کے احیاء کو زیاد کی موت سے خواہ مخواہ مربوط کرنا جس سے یہ تاثر ہوتا ہے کہ بس زیاد کا وجود رکاوٹ بنا ہوا تھا جس کی وجہ سے ولی عہدی کی تجویز ۵۔۶ سال سرد خانے میں پڑی رہی۔ چنانچہ وہ راستے سے ہٹا اور

---

[1] طبری، ابن اثیر اور ابن کثیر تینوں کے یہاں اس کا ذکر موجود ہے۔ لیکن ابن کثیر نے ۵۳ھ کے واقعات میں جہاں انہوں نے زیاد کی وفات کے بعد حضرت معاویہ کا سرگرمِ عمل ہونا بیان کیا ہے وہاں پتہ نہیں کیسے یہ بھی لکھ گئے ہیں کہ زیاد کی وفات اسی سنہ میں ہوئی تھی "فلما مات زیاد وکان فی ھذہ السنۃ شرع معاویۃ الخ" ظاہر ہے کوئی بھول چوک ہے اسی لیے اس جگہ کسی کو خلجان نہیں ہونا چاہیے۔ ج ۸ ص ۷۹

معاویہ پھر سرگرم عمل ہو گئے۔ یہ ربط ایک زبردستی کا ربط ہے اور قابلِ قبول نہیں نظر آتا۔ اس کے مقابلے میں قابلِ قبول یہ بات ہو سکتی ہے کہ سنہ ۵۹ھ میں اپنی عمر اور صحت کے تقاضے سے حضرت معاویہ کو یہ خیال غالب ہوا ہو کہ انھیں اپنے بعد کے لیے انتظام میں مزید دیر نہیں کرنی چاہیے کیونکہ اس وقت ان کی عمر ستّر سے اوپر ہو چکی تھی اور چار سال بعد سنہ ۶۰ھ میں ان کا انتقال ہی ہو گیا[1]۔ حضرت معاویہ کی سرگرمی کی جو تفصیلات اہلِ تاریخ نے لکھی ہیں ان میں صاف طور سے اس کا اشارہ پایا جاتا ہے بلکہ بعض کے بیانات میں تو صراحت کا درجہ ہے۔ مثلاً طبری میں ہے کہ جو پانچ آدمی یزید کی ولی عہدی سے متفق نہیں ہوئے تھے۔ جن کا ذکر اوپر دی ہوئی طبری کی روایت میں آ گیا ہے۔ ان کو ہموار کرنے کے لیے حضرت معاویہ نے حجاز کا ایک سفر کیا تو ان میں سے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے ساتھ بات چیت میں انہوں نے کہا کہ:-

إنّي أرهب أن أدع أمة محمد بعدي كالضأن لا راعي لها[2]	مجھے ڈر ہے کہ کہیں میں امتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے بعد بکریوں کے اس ریوڑ کی طرح نہ چھوڑ جاؤں جس کا کوئی دیکھنے والا نہ ہو۔

اور ابن اثیر میں ہے کہ انہوں نے (اپنے سفر سے پہلے) مدینے کے گورنر مروان بن حکم کو لکھا کہ میں چاہتا ہوں کہ اپنے بعد کے لیے کسی کو نامزد کر جاؤں، سو تم اس سلسلے میں اہلِ مدینہ کی رائے معلوم کرو۔ اس خط کا مضمون ابن اثیر میں اس طرح دیا گیا ہے کہ:-

---

[1] حضرت معاویہ کی عمر ۷۳ سال سے لیکر ۸۵ سال تک بتائی گئی ہے۔ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ "ان کی عمر اس وقت (موت کے وقت) ۸۰ سال تھی اور کہا گیا ہے کہ اسّی سے اوپر تھی اور یہی زیادہ مشہور ہے" البدایہ والنہایہ جلد ۸ ص ۱۴۳۔ [2] طبری ج ۶ ص ۱۷۰۔

انی قد کبرت سنی و دق	میری عمر بہت ہو چکی ہے اور ہڈیاں
عظمی وخشیت الاختلاف	گھل رہی ہیں۔ اور مجھے ڈر ہے کہ
علی الامة بعدی وقد رأیت	امت میں میرے بعد اختلاف ہو۔ اس
ان اتخیر لهم من یقوم	لیے ضروری سمجھ رہا ہوں کہ اپنے بعد کیلئے
بعدی وکرهت ان اقطع	کسی کوئی کو طے کر دوں۔ لیکن تمہارے
امرا دون مشورة من عندك	پاس جو لوگ ہیں (یعنی اہل مدینہ) انکے
فاعرض ذالك علیهم	مشورے کے بغیر کوئی فیصلہ کر دینا مجھے
واعلمنی بالذی یردون	پسند نہیں۔ پس تم میری یہ بات ان
علیك ۔ [1]	لوگوں پر پیش کرو اور ان کے جواب
	سے آگاہ کرو۔

ایک اور فائدہ

ابن اثیر کی اس عبارت سے جہاں ہمارے اس قیاس کو دلیل ملتی ہے کہ ۵۶ھ میں حضرت معاویہؓ یزید کی ولی عہدی کے لیے جو سرگرم ہوئے وہ اس لیے نہیں تھا کہ زیاد کا انتقال ہو جانے سے راستہ صاف ہو گیا تھا بلکہ ضعیف العمری اور اپنے وقت کے قریب ہو جانے کا احساس اس کا باعث ہوا تھا۔ اسی کے ساتھ ابن اثیر کی بیان کردہ ان روایتوں کی تردید یا تضعیف کا سامان بھی، ابن اثیر کی اس مذکورہ بالا روایت میں پایا جاتا ہے جو یزید کی ولی عہدی کے سلسلے میں حضرت مغیرہ بن شعبہ کے متعلق ان کی کتاب میں ایک ہی صفحہ پہلے درج ہوئی ہیں اور اس جلیل القدر صحابی کی مضحکہ خیزی کا سامان بن رہی ہیں

گزشتہ صفحات میں ہم نے ان روایتوں کی طرف اشارہ کیا تھا تفصیل نہیں دی تھی۔ ان روایتوں کے مطابق حضرت مغیرہ جب یزید کی ولی عہدی کی تجویز سے حضرت

---

[1] ابن اثیر ج ۳ ص ۲۵۰

معاویہ کو خوش کر کے کوفے کی عمارت پر اس وعدے کے ساتھ واپس ہوئے کہ کوفے والوں کو اس تجویز سے متفق کرنا میرا کام ہے تو پھر انھوں نے وہاں سے ایک وفد بھی تیار کر کے حضرت معاویہ کے پاس اپنے لڑکے کی سرکردگی میں دمشق بھیجا تھا جو تیس یا چالیس آدمیوں پر مشتمل تھا۔ اس وفد نے یزید کے بڑے گیت گائے اور حضرت معاویہ پر زور دیا کہ ولی عہدی کا تاج بس یزید کے سر پر رکھ ہی دیں۔ تو ان کو مناسب جواب دینے کے بعد حضرت معاویہ نے ابن مغیرہ سے پوچھا کہ تمھارے باپ نے کتنے میں ان سب کا دین خریدا؟ صاحبزادے نے جواب دیا "تیس ہزار میں" ـــــ یا دوسری روایت کے مطابق "چار سو دینار میں"۔

یہ مضحکہ خیز واقعات ہو چکے ہوں اور پھر بھی حضرت معاویہؓ مروان کو ایسے انداز میں خط لکھیں جیسے کہ ولی عہدی کے سلسلے میں کوئی بات کبھی اس سے پہلے ہوئی ہی نہیں کہ کیا یہ کوئی سمجھ میں آنے والی بات ہے؟ مروان تو اندرون خانہ کے آدمی تھے۔ اگر یزید کی ولی عہدی کی تجویز پہلے کسی طرف سے ہو چکی ہوتی اور اس کی تائید کیلئے کہیں سے وفود بھی آ چکے ہوتے تو کہاں ممکن تھا کہ حضرت معاویہ اس معاملے میں مروان کو بالکل انجان سمجھ کر خط لکھتے؟

باب پنجم ۵

ولی عہدی کی بیعت اور اسکے مخالفین کا قصہ

اوپر طبری کی روایت گزری ہے کہ یزید کی ولی عہدی پر پانچ حضرات کے سوا اور سب نے اتفاق کر لیا تھا۔ اس کے بعد کی روایت میں ان پانچ حضرات کے نام طبری نے یہ دیئے ہیں:۔

حسین بن علی۔ عبداللہ بن عمر۔ عبداللہ بن زبیر۔ عبدالرحمٰن بن ابی بکر
عبداللہ بن عباس (رضی اللہ تعالیٰ عنہم)

مگر اس ایک ابتدائی روایت کے سوا حضرت عبداللہ بن عباس کا نام اس اختلاف کے سلسلے میں کہیں نہیں ملتا۔ صرف باقی چار نام مختلف موقعوں پر دہرا دہرا کر آتے ہیں[1] حتیٰ کہ خود اس روایت میں جو آگے بیان ہوا ہے کہ حضرت معاویہ نے ان میں سے ہر ایک سے مل کر بات کی اور وہ بات کی۔ اس میں چار کے بعد پانچویں عبداللہ بن عباس سے حضرت معاویہ کی کوئی بات نقل کرنے کے بجائے یہ لکھا ہوا ہے کہ "قال ولم یذکر ابن عباس" جس کا مطلب ہے کہ روایت کے اصل اور بنیادی راوی خود ایک مجہول اور نامعلوم الاسم

---

[1] مثلاً حضرت معاویہ کی جو وصیت یزید کے لیے بیان کی گئی ہے اس میں یہی چار نام اس حیثیت سے مذکور ہیں کہ ان لوگوں کی طرف سے تم کو اختلاف کا سامنا ہو سکتا ہے۔ طبری ج ۶ ص ۱۶۹-۱۷۰۔

شخصیت " سجل بنخلہ[1] " ہیں۔ ان سے روایت کرنے والے صاحب جن کا نام ابن عون ہے وہ کہتے ہیں کہ نخلہ والے صاحب نے بات چیت کے بیان کے سلسلے میں ابن عباس کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ یعنی بیان کے شروع میں اختلاف کرنے والوں کے جو نام انہوں نے گنائے تھے ان میں تو ابن عباس کا نام تھا۔ مگر ان حضرات سے حضرت معاویہ کی گفتگو کا جو حصہ بیان کیا اُس میں پھر حضرت ابن عباس کا کوئی تذکرہ نہیں آیا۔ پس اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا نام کسی غلطی سے آگیا ورنہ آنا نہیں چاہیے تھا۔ اور بظاہر یہی وجہ ہے کہ ابن اثیر جو طبری کے حرف بحرف مقلد ہیں انھوں نے بھی اس قصّے کے بیان میں چار ہی نام لیے ہیں حضرت ابن عباس کا نام ان کے بیان میں نہیں ملتا۔ ابن کثیر نے البتہ ان کا نام بھی طبری کی پیروی میں باقی رکھا ہے۔ واللہ اعلم کیونکر ؟

نہ صرف ابن عباسؓ بلکہ ابن ابوبکرؓ بھی !

بہر حال ابن عباس کا ذکر اس فہرست میں قطعی طور پر غلط ہے اور حضرت ابن عباسؓ کا نام نہیں غلط ہے بلکہ عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ کا نام بھی محل غور ہے کہ آیا تاریخی اعتبار سے یہ نام سنہ ۵۶ھ کے واقعات کی فہرست میں شامل ہو سکتا ہے یا نہیں ؟ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن ابی بکرؓ کا سن وفات عام طور پر سنہ ۵۳ھ مانا گیا ہے۔ خود ابن اثیر کی یہی روایت ہے[2] چنانچہ اختلافی گفتگوؤں کا لمبا چوڑا حصہ پورے ڈھائی صفحے میں بیان کرنے کے بعد آخر میں وہ یہ لکھنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ :-

وذكر عبد الرحمن بن ابی بکر	اور اس قصے میں عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ
لا يستقيم على قول من يجعل	کا ذکر ان لوگوں کے قول کے مطابق

---

[1] یعنی مقام نخلہ کے ایک صاحب۔ معجم البلدان میں نخلہ نام کے دو مقام ہیں۔ ایک نخلہ شامیہ اور دوسرا نخلہ محمود ز ج ۵ ص ۲۷۹ جدید ایڈیشن۔ واللہ اعلم یہاں کونسا نخلہ مراد ہے۔

[2] ج ۳ ص ۲۴۶ ۔

وفاته سنة ثلاث وخمسين	ٹھیک نہیں بیٹھتا جو اُن کا سنہ وفات
وانما يصح على قول من يجعلها	۵۳ھ بتاتے ہیں۔ یہ صرف ان لوگوں
بعيد ذالك الوقت[1]	کے قول پر ٹھیک بیٹھے گا جو اُن کا
	سن وفات اسکے بعد بتاتے ہیں۔

ہمارے سامنے جو کتابیں ہیں ان میں صرف ابن کثیر کی البدایہ والنہایہ میں یہ قول ملتا ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر کا سن وفات ۵۸ھ ہے اور اس کو وہ "کثیر من علماء التاریخ" کا قول بتاتے ہیں مگر نام کسی ایک کا نہیں لیتے۔ جبکہ اس کے مقابل ۵۳ھ کے قول میں واقدی کا نام ہے، محمد بن سعد کا نام ہے اور ابو عبید وغیرہ کا نام ہے[2] اس "وغیرہ" میں ہم ابن قتیبہ کی المعارف کا اضافہ کرتے ہیں[3]۔

اور خود ابن کثیر کی البدایہ والنہایہ ہی میں اس کا ایک وزنی قرینہ پایا جاتا ہے کہ ۵۳ھ کا قول صحیح نہیں ہے۔ اور وہ قرینہ یہ ہے کہ ۵۸ھ کے وفیات (OBITUARIES) ہی میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کا نام بھی آتا ہے۔ چنانچہ بھائی بہن کے یہ دونوں نام البدایہ والنہایہ میں پہلو بہ پہلو موجود ہیں اور اسی کے ساتھ حضرت عبدالرحمٰن کے تذکرۂ وفات میں یہ بتاتے ہوئے کہ ان کی وفات مکے کے راستے میں مکے سے ۶ یا ۱۲ میل کے فاصلہ پر ہوئی تھی جہاں سے ان کو مکے لے جایا گیا اور بالائی مکہ میں دفن کیا گیا۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ:۔

فلما قدمت عائشة مكة	پس جب حضرت عائشہ مکہ آئیں تو قبر
زارته وقالت لو شهدتك	پر گئیں اور کہا کہ میں اگر تمھاری
لما بكيتك عليك ولو كنت عندك	موت کے وقت) موجود ہوتی تو نہ

---

[1] ج ۳ ص ۲۵۲ [2] ج ۸ ص ۸۹ طبع مطبعۃ السعادۃ مصر [3] ص ۲۶ طبع اول مطبعۃ اسلامیہ الازہر قاہرہ۔

لما انتقلت من موضع الذی مت فیہ	روتی اور تم کو اس جگہ سے منتقل بھی نہ کرتی جہاں تمہاری موت واقع ہوئی تھی۔

اس عبارت سے یہ نہیں معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہؓ اپنے بھائی عبدالرحمٰن کی خبر وفات سن کر مکے گئی تھیں بلکہ عبارت کا تقاضا یہ ہے کہ مکہ ان کا جانا ہوا تو وہ بھائی کی قبر پر بھی گئی تھیں۔ اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد تو ازواج مطہرات کا مکے جانا اگر ہوتا تھا تو وہ صرف حج کے لیے ہوتا تھا۔ ۵۸ھ میں حج کا موسم حضرت عائشہؓ نے پایا نہیں۔ اس لیے کہ ان کی وفات کا مہینہ رمضان اور بقول بعض شوال قرار دیا گیا ہے جیسا کہ البدایہ والنہایہ میں مذکور ہے۔[1] پس اگر یہ واقعہ ہے کہ حضرت عائشہؓ اپنے بھائی عبدالرحمٰن کی قبر پر گئیں تو ضروری ہے کہ حضرت عبدالرحمٰنؓ کی موت ۵۸ھ کے حج سے پہلے کا واقعہ ہو۔ پس اس لیے ۵۸ھ سن وفات نہیں ہو سکتا۔

بہرحال یہ بات مشکوک ہے کہ ۵۶ھ میں یزید کی ولی عہدی سے اختلاف کرنے والے حضرات میں عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ بھی ہوں۔ ہاں اگر الاصابہ فی تمییز الصحابہ (از ابن حجرؒ) کی روایت صحیح ثابت ہو جائے جس کے مطابق حضرت عبدالرحمٰن کا سن وفات ۵۳ھ ہوتا ہے اور وفات کا واقعہ حضرت معاویہ سے گفتگو کے بعد پیش آیا ہو[3] تو پھر یہ بیان صحیح ہو گا کہ حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ بھی ان حضرات میں شامل تھے جنہوں نے یزید کے لیے ولی عہدی کی بیعت سے انکار کیا۔ مگر اس گنجلک کا کیا کیا جائے کہ اس روایت کے متصلاً بعد ابن حجر اس روایت کی تائید میں مورخ ابن سعد وغیرہ کا جو بیان پیش کرتے ہیں اس میں جہاں یہ ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن کا انتقال اسی سال ہوا جس سال

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۹۲۔ [2] ج ۸ ص ۹۳۔ [3] اصابہ ج ۲ ص ۱۹۱ طبع شرفیہ۔ ابن حجر کی بیان کردہ اس روایت میں حضرت عائشہؓ کے سفر مکہ کی بابت یہ صراحت بھی پائی جاتی ہے کہ یہ سفر حج کا سفر تھا۔

حضرت معاویہ یزید کی ولی عہدی کے سلسلے میں حجاز آئے تھے، وہیں یہ بھی ہے کہ:-

وماتت عائشة بعده بسنة	اور عائشہؓ کا انتقال ان کے سال بھر
سنة تسع وخمسين۔	بعد ۵۹ھ میں ہوا۔

یعنی اب حضرت معاویہ کے سفر کا سنہ ۵۶ کے بجائے ۵۸ھ ہو گیا حالانکہ وہ متفقہ طور پر سنہ ۵۶ھ ہے۔

بہتر ہے کہ اس گنجلک مسئلے کو اب چھوڑ ہی دیا جائے کیونکہ اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں کہ عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ اس اختلاف میں شریک تھے یا نہیں شریک تھے۔ مسئلے میں چونکہ شک کا پہلو سامنے آگیا تھا اس لیے ایک طالب علمانہ خواہش یہ تھی کہ صفائی ہو جائے مگر معلوم ہوا کہ آسان نہیں ہے۔ مزید کافی وقت لگ سکتا ہے جس کی گنجائش سردست نہیں۔ اس لیے اس ضمنی مسئلے کو چھوڑ کر اب ہم اصل مسئلے پر آتے ہیں یعنی اختلاف کی جو کہانیاں بیان کی جاتی ہیں دیکھا جائے کہ ان میں کہاں تک صداقت ہے۔

ابن کثیر کا بیان

اختلاف کی کہانی کا بیان اس روایت میں بھی ہے جس کا ذکر ابھی اوپر اس حوالے سے گزرا ہے کہ اس کے بنیادی راوی ایک نامعلوم شخص ہیں جنہیں مقام تہامہ کے ایک صاحب کے نام سے ذکر کیا گیا ہے۔ مگر اس روایت والی کہانی میں ایک تشنگی ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کہیں بیچ سے شروع کر دی گئی ہے شروع کی کچھ کڑیاں رہ گئی ہیں۔ اس تشنگی کو ابن کثیر کا بیان دور کرتا ہے۔ اگرچہ اس میں اختصار ہے اس لیے ہم ابن کثیر کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ زیاد کے مشورے کا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:-

" پس جب زیاد کا انتقال ہو گیا ____ اور یہ اسی سن کی

بات ہے[1] تو معاویہ نے ولی عہدی کے لیے کاروائی شروع کردی۔ یزید کے لیے بیعت طلب کی اور تمام اطراف میں اس کے لیے لکھا۔ پس مملکت کی تمام اقلیموں میں لوگوں نے بیعت کرلی، سوائے عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ اور عبداللہ بن عمرؓ، حسین بن علیؓ، عبداللہ بن زبیرؓ اور ابن عباسؓ کے۔ اس پر معاویہ نے عمرے کے عنوان سے مکہ کا سفر کیا اور مکہ سے لوٹتے ہوئے جب ان کا گزر مدینے میں ہوا تو انہوں نے ان پانچوں میں سے ہر ایک کو الگ الگ بلایا اور ڈرایا دھمکایا۔ ان سب میں سب سے زیادہ سخت اور بے باکانہ جواب دینے والے عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ تھے، اور سب سے زیادہ نرم کلام والے عبداللہ بن عمرؓ۔ پھر معاویہ نے ایک خطبہ دیا اور اس وقت یہ پانچوں ان کے منبر کے نیچے موجود تھے۔ اس خطبے کے بعد لوگوں نے یزید کی ولی عہدی کی بیعت کی۔ یہ پانچوں بیٹھے رہے، نہ انہوں نے موافقت کی اور نہ کوئی اختلاف ظاہر کیا۔ اس لیے کہ یہ ڈرائے دھمکائے جا چکے تھے۔ پس ساری مملکت میں یزید کی باقاعدہ بیعت ہوگئی اور تمام علاقوں سے وفود اس کی تہنیت کے لئے یزید کے پاس پہنچے۔[2]

طبری کی روایت

طبری کی روایت میں اس بیان کا اول و آخر نہیں ہے۔ صرف وہ مکالمہ ہے جو حضرت معاویہ اور ان اختلاف کرنے والے حضرات کے درمیان ہوا، جس کی تفصیل ابن کثیر نے نہیں دی محض حوالہ دیا ہے۔ وہ مکالمہ یہ تھا:۔

"جب معاویہ آئے تو انھوں نے حسین بن علی کو بلوایا اور کہا کہ بھتیجے، سوائے

---

[1] یہ عبارت اوپر گزر چکی ہے اور ہم وہاں تنبیہ کر چکے ہیں کہ یہ سہو ہے، زیاد کا سن وفات ۵۳ھ ہے۔

[2] البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۸۶۔

اُن پانچ آدمیوں کے جن کی قیادت تم کرتے ہو' اور سب لوگ اِس معاملے میں متفق ہو چکے ہیں' تو بتاؤ کہ اس اختلاف کی تمہیں کیا ضرورت پیش آرہی ہے؟ حسینؓ نے جواب میں پوچھا: "میں ان کی قیادت کر رہا ہوں؟" کہا "ہاں تم قیادت کر رہے ہو۔" حسین نے کہا "اچھا تو ان کو آپ بلا لیجئے۔ وہ اگر بیعت کر لیں تو آپ دیکھیں گے کہ میں بھی ان میں کا ایک ہو جاؤں گا ورنہ پھر آپ میرے بارے میں تیز نہ ہوں۔" معاویہ نے کہا "تم ایسا کرو گے؟" کہا "ہاں بالکل۔" اس پر معاویہ نے ان سے اقرار مانگا کہ وہ اس بات چیت کو کسی پر ظاہر نہیں کریں گے۔ حسین نے بچنے کی کوشش کی۔ مگر بالآخر قول دے دیا۔ وہ نکلے تو راستے میں ابن زبیر نے ایک آدمی بٹھا رکھا تھا۔ اس نے کہا کہ آپ کے بھائی ابن زبیر پوچھتے ہیں کہ بڑے میاں سے کیا بات ہوئی ہے؟ حسین نے بچنا چاہا مگر اس آدمی نے پیچھے پڑ کے کچھ نہ کچھ ان سے نکلوا ہی لیا۔ حسین کے بعد معاویہ نے ابن زبیر کو بلوا بھیجا اور ان سے بعینہٖ یہی بات ہوئی۔ جو حسین سے معاویہ نے کہا تھا وہی ابن زبیر سے کہا اور جو جواب حسین نے دیا تھا بالکل وہی ابن زبیر نے دیا۔ معاویہ نے ان سے بھی اقرار مانگا کہ کسی کو بتاؤ گے نہیں۔ ابن زبیر نے اس پر کہا کہ امیر المومنین ہم آپ حرمِ الٰہی میں ہیں[1]۔ اور یہاں آپ سے اقرار گویا اللہ سے اقرار ہے اور یہ بڑی بھاری بات ہے۔ یہ میں نہیں کر سکتا ہوں۔ اس کے بعد وہ گئے تو عبداللہ بن عمر کو بلوایا گیا۔ ان سے معاویہ نے ذرا نرم بات کی اور یہ کہا کہ "دیکھو میں ڈرتا ہوں کہ اپنے بعد امتِ محمدؐ کو ان بکریوں کی طرح چھوڑ جاؤں جن کا کوئی چرواہا نہ ہو۔" اور تمہیں معلوم ہے کہ سب لوگ بیعت کر چکے ہیں

---

[1] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مکہ مکرمہ کا واقعہ ہے۔

صرف وہ پانچ نفر باقی ہیں جن کی قیادت تم کرتے ہو۔ آخر تمھیں کیا ضرورت پیش آرہی ہے"؟ ابن عمر نے جواب دیا کہ میں تمھیں اس مقصد کی ایسی صورت بتاؤں کہ جس سے کوئی برائی بھی نہ آوے اور امت میں فتنہ و فساد کا سدباب بھی ہو جائے، کہا ضرور بتاؤ۔ کہا تم مجمع میں بیٹھو میں آؤں گا اور اس بات پر تمھاری بیعت کروں گا کہ تمھارے بعد جس شخص پر بھی امت متفق ہوگی، میں اس سے بیعت کرلوں گا اگرچہ وہ ایک حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو" معاویہ نے کہا تم ایسا کروگے؟ کہا بے شک۔ اس کے بعد ادھر سے اپنے گھر یعنی قیام گاہ پر آگئے اور عبدالرحمٰن بن ابی بکر کو بلوایا اور کہا کہ ابن ابی بکر تم کس برتے پر میری مخالفت کے درپے ہو؟ ابن ابی بکر نے جواب دیا میں اس میں خیر دیکھتا ہوں، کہا میں تمھیں قتل کر دوں گا، جواب ملا کہ اگر تم نے ایسا کیا تو تم پر دنیا میں اللہ کی لعنت ہوگی اور آخرت میں دوزخ تمھارا ٹھکانہ۔" ابن عون کہتے ہیں نحو والے آدمی نے (پانچویں شخص) ابن عباس کا کوئی ذکر اس مکالمے کے سلسلے میں نہیں کیا۔[1]"

ایک سوال اور اس کا حل

طبری کی اس روایت کو پڑھ کر لازماً یہ سوال پیدا ہونا چاہیے کہ عبدالرحمٰن بن ابی بکر کی کیا خصوصیت تھی کہ ان سے حضرت معاویہ نے بہت کڑے اور کڑوے انداز میں بات کی۔ جب کہ دیگر افراد کے ساتھ ان کا انداز گفتگو یہ نہیں تھا؟ اس سوال کا کچھ حل شاید ابن اثیر کے بیان سے نکلے۔ وہ لکھتے ہیں کہ جب زیاد کی موت کے بعد معاویہ نے یزید کے لیے ولی عہدی کی بیعت حاصل کرنے کا عزم کرلیا تو سب سے پہلے تو انھوں نے

---

[1] طبری ج ۶ صفحہ ۱۷۰۔

عبداللہ بن عمر کو ہموار کرنے کی کوشش کی جس میں ان کو ناکامی ہوئی۔ بعد ازاں مدینے کے گورنر مروان بن حکم کو لکھا کہ:

> "میری عمر بہت ہو گئی ہے، ہڈیاں گھل رہی ہیں اور میں ڈرتا ہوں کہ میرے بعد امت میں (اقتدار کے مسئلے پر) اختلاف رونما ہو۔ اس لیے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اپنے بعد کے لیے کسی آدمی کو نامزد کر جاؤں لیکن میں یہ نہیں پسند کرتا کہ یہ کام ان لوگوں کے مشورے کے بغیر کر لوں جو تمہارے پاس ہیں (یعنی اہل مدینہ) پس تم یہ میری بات ان کے سامنے رکھو اور ان کے جواب سے مجھے آگاہ کرو۔ چنانچہ مروان نے یہ مسئلہ اہل مدینہ کے سامنے رکھا اور ان لوگوں نے جواب دیا کہ ہاں بالکل مناسب بات ہے ہم بھی پسند کریں گے کہ وہ ہمارے لیے کسی کو نامزد کر دیں اور اس میں کوتاہی نہ کریں۔ مروان نے یہ روداد حضرت معاویہ کو بھیج دی۔ وہاں سے جواب میں یزید کا نام آیا۔ مروان نے لوگوں کو جمع کر کے بتایا کہ امیر المومنین نے آپ کے لیے پوری خیر خواہی کے ساتھ اپنے فرزند یزید کو اپنے بعد کے لیے انتخاب کیا ہے۔ یہ سن کر عبدالرحمٰن بن ابی بکر کھڑے ہو گئے اور بولے کہ مروان تم بھی جھوٹے اور معاویہ بھی جھوٹے۔ تم دونوں کی نیت اس انتخاب میں امت محمدیہ کے ساتھ بھلائی کی نہیں بلکہ تم لوگوں کی نیت یہ ہے کہ خلافت کو ہرقلیت بنا دو، کہ ایک ہرقل[1] مرا تو دوسرا آ گیا...... اسی طرح حسین بن علی، عبداللہ بن زبیر اور ابن عمر نے[2] بھی اس تجویز کی مخالفت کی، اور مروان نے پھر اس کی اطلاع معاویہ کو دی۔"

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن کے ساتھ حضرت معاویہ کی تشدد کے پس منظر میں حضرت عبدالرحمٰن کی یہ شدت تھی جو ابن اثیر کی مذکورہ بالا روایت میں نظر آتی ہے۔

---

[1] یہ شاہان روم کا لقب تھا۔ [2] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۵۰

جبکہ دوسروں (حضرت حسین وغیرہ) نے یہ شدت نہیں اختیار کی تھی۔ یہ واقعہ پہلے پیش آچکا تھا اس کے بعد حضرت معاویہ نے حجاز کا سفر کیا ہے۔ شاید اسی لیے حضرت عبدالرحمٰن کے ساتھ ان کا اندازِ گفتگو مختلف تھا۔

وفود کی کہانی

ابن اثیر ہی کے بیان سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مروان کو جب حضرت معاویہ نے یزید کا نام اپنے ولی عہد کی حیثیت سے مدینہ بھیجا تھا کہ اس کے لیے اہل مدینہ کی منظوری حاصل کریں تو ساتھ میں یہ بھی ہدایت کی تھی کہ مدینے سے کوئی وفد بھی اس منظوری کے اظہار کے طور پر دمشق آنا چاہیے۔ اور اسی طرح دوسرے گورنروں کو بھی ان کے علاقے سے متعلق لکھا تھا[1]۔ چنانچہ یہ وفود پہنچے۔ ابن اثیر نے ان میں سے خاص طور پر دو کا ذکر کیا ہے۔ ایک اہل مدینہ کا وفد جس میں سے محمد بن عمرو بن حزم کا نام دیا گیا۔ دوسرا اہل بصرہ کا وفد جس میں احنف بن قیس کا نام مذکور ہوا ہے۔

ابن اثیر نے ان وفود کے اجتماع کی کارروائی جس طرح دی ہے اس سے یہ تاثر ہوتا ہے کہ اس اجتماع سے جو مقصد حضرت معاویہ کا تھا کہ یزید کی ولی عہدی پر تمام مملکت کے نمائندوں کی مہرِ اتفاق ثبت کرا لی جائے۔ یہ مقصد اس اجتماع سے تو حاصل نہیں ہو سکا بلکہ ایک انتشاری کیفیت کے ساتھ اجتماع برخاست ہوا۔ البتہ بعد میں حضرت معاویہ نے لطف و عطا اور مدارات کے ذریعہ لوگوں کو ہموار کیا اور اکثریت سے یزید کی ولی عہدی پر بیعت حاصل کر لی[2] اور اس کے بعد حجاز کا سفر کیا تاکہ وہاں جو لوگ بیعت سے انکار کر رہے ہیں ان کا انکار ختم کرایا جائے۔ انھیں سمجھایا جائے کہ اب جب کہ اور سب ہی لوگ متفق ہو چکے تو کچھ کا اختلاف جاری رہنا مناسب نہیں

---

[1] ابن اثیر ج ۳ ص ۲۵۰ [2] ایضاً ص ۲۵۱

یہی وہ سفر ہے جس کی روداد طبری کے نیز البدایہ والنہایہ کے حوالے سے اوپر پڑھی جا چکی ہے۔

سوالیہ نشان؟

یہ بات کوئی ناممکن نہیں ہے کہ وفود کا اجتماع ناکام رہا ہو اور نہ یہ کہ اس کا تدارک حضرت معاویہ نے مدارات و عطیات اور تالیفات سے کیا ہو۔ ایک آدمی اگر حضرت معاویہ سے حسن ظن رکھتا ہے تو وہ اس بارے میں بلا کسی دقت کے یوں سوچ سکتا ہے کہ یہ سب کچھ انھوں نے نیک نیتی سے اور اچھے مقصد سے کیا تھا۔ لیکن اجتماع کی جو روداد ابن اثیر نے بیان کی ہے اس کا منطقی تقاضا یہ ہے کہ اجتماع اپنے مقصد کے اعتبار سے کامیاب رہا ہو نہ کہ ناکام۔ جبکہ مدارات و عطیات سے کام لینے کی بات جو انھوں نے بلا کسی ثبوت، مثال اور حوالے کے صرف ایک فقرے میں بیان کر دی ہے وہ اپنے لیے کسی وزن کا تقاضا نہیں کرتی۔ بلکہ داد و دہش کا جو تنہا ایک واقعہ انھوں نے اس قصے کے بالکل شروع میں بیان کیا ہے وہ تو اس بات کا ثبوت ہے کہ داد و دہش سے کچھ کام نہیں بنا۔[1]

اجتماع کی روداد جو ابن اثیر نے بیان کی ہے وہ یہ ہے:-

ثم ان معاویۃ قال للضحاک	پھر جب وفود جمع ہو گئے تو معاویہ نے
بن قیس الفہری لما اجتمع	ضحاک[2] بن قیس سے کہا کہ میں اولاً

---

[1] لکھا ہے کہ زیاد کی موت کے بعد یزید کی ولی عہدی کا تہیہ کیا تو حضرت عبداللہ بن عمر کو ایک لاکھ درہم بھیجے جو انھوں نے یہ شبہ ہونے کے بعد لینے سے انکار کر دیا کہ یزید کی ولی عہدی کے سلسلے میں ہیں۔ ص ۲۵۔

[2] کم عمر صحابہ میں سے ہیں۔ بعض احادیث کی روایت بھی ان سے ہے۔ حضرت معاویہ کے مخلص حامیوں میں تھے۔ سنہ ۵۶ھ کے اس اجتماع کے وقت کوفہ کے گورنر تھے۔ بعد میں (بقیہ حاشیہ ص ۱۰۴)

الوليد عنده: انى متكلم فاذا سكت فكن انت الذى تدعوا الى بيعة يزيد وتحثنى عليها فلما جلس معاوية للناس تكلم فعظم امر الاسلام وحرمة الخلافة وحقها وما امر الله به من طاعة ولاة الامر ثم ذكر يزيد وفضله وعلمه بالسياسة وعرض ببيعته فعارضه الضحاك فحمد الله واثنى عليه ثم قال: يا امير المؤمنين انه لابد للناس من والى بعدك وقد بلونا الجماعة والالفة فوجدناهما احقن للدماء واصلح للدهماء وآمن

کچھ کہوں گا پھر جب میں خاموش ہو جاؤں تو تم کھڑے ہو کر یزید کی بیعت کی تحریک کرو اور مجھے اس کے لیے ترغیب دو پس جب معاویہ خطاب کرنے بیٹھے تو اسلام کی عظمت خلافت کی حرمت (SANCTITY) اور اس کا حق اور اولوالامر کی اطاعت کے بارے میں اللہ کے احکام بیان کیے، پھر یزید اور اس کی خوبیوں کا بالخصوص اس کے سیاسی شعور اور آگاہی کا تذکرہ کر کے اس کی بیعت کا مسئلہ پیش کیا۔ اس کے بعد ٹھیک اسی انداز سے ضحاک بولے حمد و ثنا کے بعد کہا کہ امیرالمؤمنین لازم ہے کہ آپ کے بعد کے لیے صاحب امر کا تقرر ہو جائے تاکہ جماعت اور یکجہتی قائم رہے جس کی برکتیں ہم نے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۳ کا) حضرت معاویہ نے ان کو دمشق میں انتظامیہ کی سربراہی سپرد کی۔ حضرت معاویہ کا زمانہ [illegible] یزید کے زمانے میں وہ اپنے منصب پر برقرار رہے یزید کی موت کے بعد ان کی رائے تھی کہ سب لوگ عبداللہ بن زبیر کی بیعت کر لیں اور قریب تھا کہ لوگ بات مان جاتی اور اسلامی جمعیت پھر سے بحال ہو جاتی مگر ابن زیاد نے مروان کو امیدوار بنا کے کھڑا کر دیا۔ سنہ ۶۴ھ میں مروان کے مقابلے میں عبداللہ بن زبیر کی طرف سے جنگ کرتے ہوئے شہید ہوئے۔

اصابہ ج ۲ ص ۲۰۲ سیر اعلام النبلاء ج ۳ ص ۲۴۱ تا ۲۴۵۔

للسبل وخير في العاقبة	آزمائی ہیں کہ اس میں بھائیوں کی حفاظت
والايام عوج رواجع والله	ہے، راستوں کا امن ہے اور
كل يوم هو في شأن ويزيد	عاقبت کی بھلائی ہے۔ زمانہ کی کج
بن امير المؤمنين في حسن	رفتاری کا ہم سب پر روشن ہے اور
هديه وقصد سيرته	اللہ کی شان بے نیازی بھی ہیں سمجھتا
على ما علمت وهو من	ہوں کہ یزید بن امیر المؤمنین اس کام
افضلنا علما وحلما وابعدنا	کے لیے نہایت موزوں ہیں ان کے
رأيا فولّه عهدك و	حسن سیرت کا حال آپ پر عیاں ہے
اجعله لك علما بعدك	نیز علم اور رائے میں وہ ہم سب سے
ومفزعا نلجأ اليه	فائق ہیں۔ پس ان کو اپنے بعد کیلئے
ونسكن في ظله. وتكلم عمرو	نامزد کر کے ہمارے لیے ایک نشان
بن سعيد الاشدق بنحو	رہنما اور ایک پناہ گاہ کا انتظام کیجیے۔
من ذلك. ثم قام يزيد	کہ جس کی پناہ اور سایے میں ہم قرار
بن المقنع العذري فقال	پکڑیں پھر عمرو بن سعید الاشدق بولے

---

[1] کبار تابعین میں ہیں۔ بعض نے صحابہ میں شمار کیا ہے لیکن یہ صحیح نہیں (اصابہ)۔ ابن حزم ان کا ذکر یوں کرتے ہیں کان من سادات المسلمین ومن الکبراء المشہورین (الخ جمہرۃ ص ۲۶) اور یہی اموی کے والد ماجد سعید بن العاص تھے جو حضرت عثمانؓ کی تربیت میں رہے تھے اور حضرت عثمان کے زمانے میں کوفے کے گورنر رہے پھر حضرت معاویہ کے زمانے میں بھی اولاً کوفے کی پھر مدینے کی گورنری پر رہے (اصابہ ج ۳) عمرو بن سعید اس اجتماع کے وقت کسی عہدے پر تھے یا نہیں یہ معلوم نہیں ہو سکا البتہ بعد میں وہ مکے اور مدینے کی گورنری پا چکے ہیں۔ حادثۂ کربلا کے وقت وہ پورے حجاز کے گورنر تھے۔ واقعہ کے بیان میں ان کا ذکر آئے گا۔ غالب گمان یہ ہے کہ سنہ ۵۶ھ کے اس اجتماع کے وقت بھی وہ برسر عہدہ ہوں اور جیسا کہ دستور تھا ان کے والد سعید کے سنہ ۵۲ھ یا سنہ ۵۸ھ میں انتقال کے بعد انہیں کوئی جگہ دے دی گئی ہو۔

فهذا امير المومنين واشار الى معاوية فان هلك فهذا واشار الى يزيد ومن ابى فهذا واشار الى سيفه فقال معاوية اجلس فانت سيد الخطباء وتكلم من حضر من الوفود فقال معاوية لاحنف ما تقول يا ابا بحر فقال نخافكم ان صدقنا ونخاف الله ان كذبنا وانت يا امير المؤمنين اعلم بيزيد فى ليله ونهاره وسره وعلانيته ومدخله ومخرجه فان كنت تعلمه لله تعالى وللامة رضا فلا تشاور فيه وان كنت تعلم فيه

اور کچھ یہی باتیں انہوں نے بھی کہیں۔ اس کے بعد یزید بن مقنع عذری[1] کھڑے ہوئے اور معاویہ کی طرف اشارہ کرکے بولے یہ امیر المومنین ہیں ان کو اگر کچھ ہو جائے تو یزید کی طرف اشارہ کرکے بولے کہ یہ ہیں، اور اس کے بعد اپنی تلوار کی طرف اشارہ کیا کہ جو انکار کرے اس کے لیے یہ ہے۔ معاویہ نے کہا بس بیٹھ جاؤ تم سب سے بڑے خطیب ہو، اس طرح تمام موجودین نے اظہار خیال کیا۔ احنف[2] نہیں بولے تھے، معاویہ نے ان سے مخاطب ہو کر کہا کہ ابو بحر (یہ کنیت ہے) تم بھی تو کچھ کہو۔ اس پر انہوں نے کہا کہ اگر سچ کہوں تو آپ لوگوں کا خوف ہے اور جھوٹ میں اللہ کا خوف۔ امیر المومنین مختصر یہ ہے کہ

---

[1] ان صاحب کا حال معلوم نہ ہو سکا۔ [2] احنف بن قیس بصری تابعین میں ہیں، فتنے کے وقت میں حضرت علی کے خاص ساتھیوں میں تھے، اپنی نیک سیرت، علم، وقار اور دانش کی وجہ سے حضرت معاویہ کے دور میں بھی محترم اور معزز رہے۔ ابو بحر کنیت تھی اور کنیت سے مخاطب کرنا عرب میں تعظیم کی علامت تھی (ابن اثیر ج ۴، اصابہ ج اول)

غیر ذالک فلا تزوده الدنیا
وانت صائر الی الآخرة
وانما علینا ان نقول سمعنا
واطعنا، وقام رجل من
اهل الشام فقال ما ندری
ما تقول هذه المعدیة
العراقیة وانما عندنا
سمع وطاعة وضرب
وازدلاف فتفرق الناس
یحکون قول الاحنف [1]

آپ یزید کے لیل و نہار اور ظاہر و
باطن سے واقف ہیں۔ اگر آپ سمجھتے
ہیں کہ اس کے انتخاب میں اللہ اور
امت کی رضا ہے تو کسی سے مشورے کی
کوئی ضرورت نہیں۔ اور اگر ایسا نہیں
سمجھتے تو پھر اب جب آپ کا چل چلاؤ
ہے اس کی محض دنیا کا بندوبست
مت کیجئے۔ اور ویسے آپ جو بھی طے
کریں گے ہمارا فرض تو سمعنا و اطعنا
ہے۔ اور اس پر ایک شامی کھڑا ہوا
اور بولا ہم نہیں سمجھے کہ یہ عراقی زبان
کہنا کیا چاہتی ہے۔ ہم تو بس سمع
و طاعت جانتے ہیں اور سیدھی
سیدھی باتیں۔ اس پر لوگ منتشر ہو گئے
اس طرح کہ احنف کا قول ان کی
زبان پر تھا۔

اب ذرا غور کیجئے کہ وفود کا اجتماع حضرت امیر معاویہ منعقد کر رہے ہیں۔ وفود بھیجے ہوئے ان کے گورنروں کے ہیں۔ ماحول دمشق کا ہے۔ سب تقریریں یزید کی ولی عہدی کی حمایت میں ہو رہی ہیں۔ بعض تقریروں میں بڑی صفائی، صراحت اور سنجیدگی سے اس کی سیرت اور ان صفات کا حامل بتایا جا رہا ہے جو منصب خلافت کو درکار ہیں۔ ایسے

---

[1] ابن اثیر ج ۳ ص ۲۵۱ - ۲۵۰ ۔

ماحول میں صرف ایک تقریر نہایت مختصر حضرت احنف بن قیس کی ہوتی ہے، جو بہت محتاط اور بند بند طریقے پر کچھ مختلف رائے دیتے ہیں[1] مگر ساتھ میں یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ جو بھی فیصلہ امیر المومنین کر دیں گے ہم اس کی مخالفت نہیں کریں گے۔ فرمانبرداری کریں گے۔ پھر اس تقریر کے بعد ایک شامی کھڑے ہو کر کہتا ہے کہ یہ کیا "نیچے دردل نیچے بردل" کا انداز ہے۔ ہم شامی صرف ایک اور سیدھی بات جانتے ہیں، سمع اور طاعت!

کیا یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ایسے ماحول میں یہ اجتماع بلا کسی فیصلے کے انتشار پر ختم ہوا ہوگا جیسا کہ ابن اثیر بتاتے ہیں؟ بظاہر یہ سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے اور اس لیے وہ نتیجہ جو ابن اثیر بتاتے ہیں کہ:۔

استوثق اکثر الناس	لوگوں کی اکثریت نے توثیق کر دی
وبایعہ[2]	اور بیعت کر لی۔

یہ نتیجہ اسی اجتماع کا ہونا چاہیے جو اسی مقصد کے لیے بلایا گیا تھا نہ کہ اس خیالی مدارات وعطا کا جس کا کوئی ثبوت اور حوالہ دیئے بغیر ابن اثیر اس نتیجہ کو اسی کا کرشمہ ٹھیراتے ہیں۔

دمشق کے اس اجتماع کی کارروائی کے ذکر سے ہمارا مقصد صرف اس کمی کو پورا کرنا تھا جو طبری کی روایت میں رہ گئی تھی۔ تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ اس روایت کے مطابق حضرت معاویہ نے حجاز کا سفر کر کے حضرت حسینؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ وغیرہ سے جو یہ کہا کہ سب لوگ یزید کی ولی عہدی کے لیے بیعت کر چکے ہیں تم ہی لوگ کیوں مخالفت کر رہے ہو؟ تو اس کا پس منظر کیا تھا؟ کب اور لوگوں نے بیعت کر لی تھی اور کس طرح یہ کارروائی ہوئی تھی؟

---

[1] کچھ اسی طرح کی بات وفد مدینہ کے محمد بن عمرو بن حزمؓ سے بھی منسوب کی گئی ہے مگر اسے وفود کا اجتماع کی کارروائی میں نہیں، اس کارروائی سے باہر دکھایا گیا ہے، اجتماع میں انکی شرکت نہیں دکھائی گئی۔ اس لیے ہم نے اس کا ذکر یہاں نہیں کیا ہے۔

[2] ایضاً ص۲۵۱

ابن اثیر اور حضرت معاویہؓ کا سفر حجاز

ابن اثیر کے بیان میں معاملہ کی ایک اچھی خاصی — یا کم از کم فی الجملہ — معقول صورت کو جس طرح خواہ مخواہ بدصورت کرنے کی کوشش کی گئی ہے وہ ابھی ہم نے دیکھی اور یہی وہ باتیں ہیں جنھوں نے ہماری تاریخ کے اس باب کو قطعی یکطرفہ اور نامنصفانہ رنگ دیدیا ہے۔ اب اس کے بعد ابن اثیر کی زبانی حضرت معاویہ کے سفر حجاز کی روداد بھی سن لیجئے، اس میں ابن کثیر کے اس مجمل بیان کی، جو ہم اوپر دے آئے ہیں۔ تفصیل ہے کہ جو — چار یا پانچ — اصحاب مخالفت کر رہے تھے ان کو حضرت معاویہ نے ڈرا دھمکا کر خاموش کیا اور اسی تفصیل کے اجزاء کافی مشہور ہوئے ہیں حالانکہ ان کے بے تکے پن کی انتہا نہیں ہے۔ اس کے باوجود ان کی شہرت و قبولیت کو ہم صرف اپنی روایات پرستی کی معراج کہہ سکتے ہیں[1]

ابن اثیر بتاتے ہیں کہ جب "لطف و عطاء و مدارات" کے ذریعہ "اکثر الناس" کی اور خصوصاً اہل عراق و شام کی بیعت یزید کی ولی عہدی کے لیے حاصل کر لی گئی تو معاویہؓ نے ایک ہزار سواروں کے ساتھ حجاز کا رخ کیا، چلتے چلتے مدینے کے پاس پہنچے تھے کہ اول آدمی جو نظر پڑا وہ حسین بن علیؓ تھے۔ معاویہ انھیں دیکھ کر بولے:

لا مرحبًا ولا اهلاً بدنة	استغفر اللہ یہ کون نظر آیا، قربانی کا بکرا
یترقرق دمها واللہ مهریقها۔	ہے جس کا خون اچھل رہا ہے اور اللہ اسے بہائے گا۔

حسینؓ نے جواب دیا۔

---

[1] اسی روایت پرستی کا ماتم اقبال نے کیا ہے ؎

یہ امت روایات میں کھو گئی   حقیقت خرافات میں کھو گئی

مهلاً فانّی واللّٰه لست باهلٍ		ایسی درشتی مت کیجئے' میں واللہ
لهذه المقالة ۔		ایسی بات کا مستحق نہیں ہوں۔

معاویہ بولے، "اس سے بھی بڑی بات کے مستحق ہو"۔ پھر ابن زبیر ملے انکو دیکھ کر بولے "مکار گوہ جو اپنا سر بل میں گھسا لیتی ہے اور دُم ہلا کرتی ہے لیکن قریب ہے کہ دُم سے پکڑ لی جائے گی اور کمر توڑ دی جائے گی' اسے مجھ سے دور کرو۔" چنانچہ ان کی سواری پر دو ہنٹر مار کر راستے سے ہٹا دیا گیا۔ اس کے بعد عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ ملے معاویہ بولے "لا مرحباً ولا اھلاً۔ بوڑھا ہے جو سٹھیا گیا اور عقل سے بیدل ہوا" یہ کہہ کر ان کو بھی راہ سے ہٹا دیا گیا اور پھر یہی سلوک ابن عمر کے ساتھ کیا گیا۔ تب یہ لوگ معاویہ کے ساتھ ساتھ مدینے کی طرف کو چل دیئے۔ درانحالیکہ وہ ان کی طرف کوئی التفات نہیں کر رہے تھے[1] مدینہ پہنچ کر یہ لوگ معاویہ کے پیچھے پیچھے انکی اقامت گاہ پر بھی پہنچے۔ جہاں ان کا ان کی حیثیت کے مطابق استقبال نہیں ہوا۔ تب یہ لوگ مدینہ چھوڑ کر مکے چلے گئے۔ معاویہ نے مدینے میں ایک تقریر کی جس میں خلافت کے لیے یزید کی اہلیت اور دوسروں پر اس کی فوقیت بیان کر کے مخالفت کرنے والوں کو دھمکایا کہ اسے اب برداشت نہیں کیا جائیگا اس کے بعد ام المومنین حضرت عائشہؓ کے یہاں حاضری دی۔ جہاں ام المومنینؓ نے ان سے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ تم نے حسینؓ وغیرہ کو قتل کی دھمکی دی ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ام المومنینؓ یہ لوگ فی الواقع اس سے بالاتر ہیں ... لیکن آپ مجھے یہ بتائیں کہ میں یزید سے بیعت کر چکا ہوں اور ان لوگوں کے علاوہ سب بیعت کر چکے ہیں' تو کیا اب یہ بیعت توڑ دی جائے؟ حضرت عائشہؓ نے

---

[1] یہاں ایک بار پھر نوٹ کر لیجئے کہ ابن عباسؓ کا نام اس فہرست میں نہیں ہے۔

جواب دیا کہ نہیں، مگر ان کے ساتھ نرمی سے پیش آؤ، مجھے امید ہے کہ جو تم چاہتے ہو وہی ہو جائے گا۔ معاویہ بولے بہت اچھا میں ایسا ہی کروں گا۔ پھر کچھ دن ٹھہر کر مکہ روانہ ہوئے۔ اور اب خواہش کہ ان چاروں (حضرت حسینؓ وغیرہ) سے ملیں جو کہ مکے ہی میں تھے۔ اس خواہش کا علم ان لوگوں کو ہوا تو وہ بطن مر (مرالظہران)[1] میں آ کر ملے۔ سب سے پہلے ملنے والے حضرت حسینؓ تھے۔ انھیں دیکھ کر معاویہ بولے "مرحبا و اھلاً یا ابن رسول اللہ وسید شباب المسلمین" اور حکم دیا کہ ان کے لیے سواری لائی جائے۔ پس اب وہ سوار ہو کر معاویہ کے ساتھ ساتھ چلے۔ علی ہذا باقی تین کے ساتھ یہی معاملہ کیا۔ اور اب ان چاروں کے جلو میں اس طرح چلے کہ کوئی پانچواں اس زمرے میں شامل نہیں تھا۔ اور اسی شان کے ساتھ ان چاروں کو لے کر مکے میں داخل ہوئے، پھر جتنے دن رہے ہر دن نیا اکرام نیا احسان تھا۔ اور دوسری کوئی بات نہیں تھی، حتیٰ کہ عمرے کے ارکان ادا ہو گئے اور چل چلاؤ کا وقت آنے لگا۔ تو ان چاروں نے آپس میں کہا کہ کسی دھوکے میں نہ آ جانا۔ یہ سب جو ہو رہا ہے ہماری محبت میں نہیں ہو رہا ہے۔ "مطلب سعدی دیگر است" لہٰذا جواب سوچ لو کہ جب مطلب کی بات ہم سے کہی جائے گی تو کیا کہنا ہے۔ پس ان لوگوں نے طے کیا کہ بڑے میاں مطلب کی بات کہیں گے تو ابن زبیرؓ ان کو جواب دیں گے۔ چنانچہ وہ وقت آ گیا اور معاویہ نے ان کو طلب کر کے کہا کہ تمھارے ساتھ جو میرا رویہ رہا ہے وہ تم جانتے ہو، تم سے رشتہ داریوں کا جو پاس و لحاظ مجھے رہا ہے وہ بھی تم پر عیاں ہے اور اس کے مقابلے میں جو تم لوگوں کی روش رہی ہے اس کے لیے میرا تحمل بھی تم سے مخفی نہیں۔ اب اس وقت بات یزید کی ہے، وہ تمھارا بھائی ہے،

---

[1] مکے سے چار پانچ میل کے فاصلے پر ایک گاؤں کا نام (معجم البلدان) اسکو وادی فاطمہ بھی کہتے ہیں۔

تمہارا ابن عم ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ خلافت کے عہدے کے لیے تم اسے آگے بڑھاؤ' رہے خلافت کے اختیارات' عزل و نصب' تحصیل خراج' تقسیم دولت' وہ سب تمہارے ہاتھ میں ہوگا۔ یزید تمہارے آڑے نہیں آئے گا۔ یہ لوگ خاموش رہے' کچھ بولے نہیں۔ معاویہ نے دوبارہ کہا کہ تم کچھ جواب نہیں دیتے' پھر ابن زبیر سے مخاطب ہوئے کہ تم بولو۔ تم ہی ان کے خطیب ہو۔ ابن زبیر نے جواب دیا کہ میں تین باتیں آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔

۱۔ اپنے بعد کے لیے ایسے چھوڑ جائیے جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چھوڑ گئے تھے کہ کسی کا تقرر نہیں کیا' لوگوں نے ابوبکرؓ کو منتخب کر لیا۔

معاویہ بولے کہ آج تم میں کوئی ابوبکرؓ جیسا نہیں ہے پس اختلاف ہوگا۔

۲۔ ابن زبیرؓ نے کہا کہ اچھا پھر ابوبکرؓ کی طرح کیجئے کہ خلیفہ نامزد کیا مگر اپنی اولاد یا خاندان کا نہیں۔

۳۔ یا عمرؓ کی طرح کیجئے کہ انتخاب خلیفہ کے لیے شوریٰ نامزد کر دی مگر اس میں اپنی اولاد یا خاندان کے کسی فرد کو نہیں رکھا۔

معاویہ نے کہا اور کوئی صورت تمہارے پاس پیش کرنے کو نہیں ہے! ابن زبیرؓ بولے کہ نہیں۔ باقی لوگوں سے پوچھا تو انہوں نے بھی یہی جواب دیا۔

معاویہ نے کہا اچھا اب بات چیت ختم ہوئی۔ میں نے چاہا تھا کہ تم لوگوں کی رضامندی حاصل کر لوں۔ مگر معلوم ہوا کہ یہ نہیں ہو سکے گا۔ پس حجت تمام ہوئی۔ اب کوئی مجھے الزام نہ دے۔ اب تک میرا معاملہ یہ تھا کہ میں تقریر کرنے کھڑا ہوتا اور تم میں سے کوئی بھی برسر عام میری تکذیب کرنے کھڑا ہو جاتا تو میں اسے برداشت کر لیتا اور درگزر کر جاتا تھا۔ لیکن آج مجھے لوگوں میں کچھ کہنا ہے۔ اس موقع پر اگر تم میں سے کسی نے میری تکذیب کی تو

بھرا اور پھر اگر کوئی لفظ منہ سے نکلا تو اس کے سر پر پہنچ چکی ہو گی۔ یہ کہہ کر اپنے محافظ دستے کے سربراہ کو بلایا اور کہا کہ ان میں سے ہر ایک کے اوپر اپنے دو آدمی شمشیر بکف مسلط کرو۔ اور ہدایت کرو کہ اگر میری تقریر کے دوران ان میں سے کوئی کچھ بولے تو اس کی گردن اڑا دیں۔ اس کے بعد معاویہ اٹھے ان کے ساتھ ہی یہ چاروں بھی چلے حتیٰ کہ معاویہ منبر پر پہنچے اور حمد و ثنا کے بعد کہا کہ یہ حسین، ابن زبیر، ابن عمر، ابن ابوبکر، سادات مسلمین اور عمائدین ملت ہیں۔ جن کے مشورے ہی سے تمام کام انجام پاتے ہیں۔ انہوں نے یزید کی ولی عہدی قبول کی اور بیعت کر لی ہے۔ بس اب آپ سب لوگ بھی اللہ کا نام لے کر بیعت کر لیں۔ چنانچہ سب اہل مکہ نے بیعت کر لی۔ اور معاویہ نے اسی وقت سواری کھنچوائی اور مدینہ کو روانہ ہو گئے۔ اب اہل مکہ نے ان لوگوں سے سوال کیا کہ آپ لوگ تو کہتے تھے کہ ہم ہرگز بیعت نہ کریں گے۔ یہ کیا ہوا؟ ان لوگوں نے کہا کہ خدا کی قسم ہم نے بیعت نہیں کی ہے۔ لوگوں نے کہا پھر آپ نے تردید کیوں نہیں کی۔ اس آدمی کو بولنے کیوں دیا! بولے اس نے ہمارے ساتھ داؤں کھیلا اور ہم ڈر کے مارے نہیں بول سکے۔ اُدھر معاویہ مدینے پہنچ گئے اور مدینے والوں نے بھی بیعت کر لی۔ یہ کام کر کے معاویہ شام روانہ ہو گئے اور بنی ہاشم کے ساتھ اپنے برتاؤ میں سختی شروع کی۔ (یعنی وظائف وغیرہ روک دیئے) اس پر ابن عباس دمشق پہنچے اور کہا کہ یہ کیا قصہ ہے؟ معاویہ نے کہا قصہ کیا ہوتا۔ وہ تمہارے حسین صاحب بیعت نہیں کر رہے ہیں اور تم لوگ ان سے کچھ نہیں کہہ رہے ہے۔ ابن عباس نے کہا: معاویہ تم جانتے ہو کہ میں اگر چاہوں تو بعض ساحلی علاقوں میں جا کر ڈیرا ڈال دوں، اور وہاں کے لوگوں کو تمہارے خلاف کھڑا کر دوں۔ بولے نہیں نہیں ابن عباس تمہیں تمہارے وظائف دیئے جائیں گے۔ تمہیں راضی رکھا جائے گا۔

بلکہ پہلے سے زیادہ دیا جائے گا۔“[1]

ایک لمحۂ فکریہ

ذرا غور کیا جانا چاہیے کہ اس پورے بیان میں سوائے ان دو تین جملوں کے جن کا تبادلہ ام المومنین عائشہ صدیقہؓ اور امیر معاویہ کے درمیان ہوا اور یا پھر سوائے اس مختصر گفتگو کے جو حضرت ابن زبیرؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان انتخاب خلیفہ کے موضوع پر ہوئی کوئی اور بات ہے جس کا کوئی سنجیدہ آدمی یقین کر سکے؟ امیر معاویہؓ کے لیے تو ہر بڑی اور گری بات ہم نے لائق یقین فرض کر رکھی ہے۔ اس لیے انکے مسلّمہ اخلاق، حلم، مدارات، درگزر، رکھ رکھاؤ وغیرہ کے علی الرغم مان لیجئے کہ وہ مدینہ کے پاس حسین بن علیؓ، عبداللہ بن زبیرؓ، عبداللہ بن عمرؓ اور عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ کے ساتھ ایسی ہی بدخلقی سے پیش آئے جیسی بدخلقی مذکورۂ بالا بیان میں دکھائی گئی ہے مگر کیا ایسی ہی آسانی سے یہ بھی ماننے کی چیز ہے کہ یہ معززین مدینہ امیر معاویہؓ کے ہاتھوں سر شہر اس آخری درجہ کی تذلیل و تحقیر کا نشانہ بننے پر بے چون و چرا راضی ہو گئے بلکہ ھل من مزید کہتے ہوئے پھر انہی کے پیچھے لگے رہے، اور بار بار ان کے ہاتھوں تذلیل ہی کے جام پی پی کر کہیں ان کی سیری ہوئی یعنی ناراض ہو کر یا شرمندہ ہو کر چلے جانے کا خیال ان کو آیا ___ لیکن یہ ناراضگی یا شرمندگی بھی پھر کچھ دیرپا ثابت نہ ہوئی جیسے ہی مکے کے قریب پہنچ کر امیر معاویہؓ نے ان کو یاد فرمایا یہ پھر دوڑ کے مکے سے باہر ہی ان کے استقبال کو پہنچ گئے اور پھر ان کی عنایتوں اور عطاؤں سے سرفراز ہونے کو یہ جانتے بوجھتے تیار ہو گئے کہ یہ سب بناوٹ اور یزید کے لیے خواہش بیعت کی تمہید ہے!

استغفر اللہ۔ یہ وہی ابن عمرؓ، ابن ابوبکرؓ، ابن علیؓ اور ابن زبیرؓ ہیں جن کی عظمتوں کے کے

---

[1] ابن اثیر ج ۳ ص ۲۵۱-۲۵۲

ہم پڑھتے ہیں؟ یا جنس عظمت سے عاری ان کے ہم نام چند بونے اور بالشتیے —— یا مسخرے؟ معاویہ دشمنی کا یہ اندھا پن تو دیکھیے ۔!

اور ابھی بس کہاں ہے؟ ہم نے تو اس قصے میں یہ بھی پڑھا کہ یہ جن کے غلغلوں کی دھوم ہے کہ ان کا مرنا اور جینا حق کے لیے تھا، انسانی، روحانی اور اخلاقی قدروں کے لیے تھا ؏

وہ ہم سے بھی زیادہ کشتۂ تیغِ ستم نکلے

وہ حسین ابن علیؓ جنھوں نے اپنی اور اپنی اولاد کی اور اپنے اہل خاندان کی گردنیں کربلا میں کٹوا دیں۔ مگر عبید اللہ بن زیاد کے جبر کے آگے کسی قیمت پر جھکنا گوارا نہ کیا۔ وہ ابن زبیرؓ جو شیروں کی موت مرے ذلت کی زندگی قبول نہیں کی، وہ ابن عمرؓ جنھیں حق بات کہنے سے کبھی کوئی روک نہ سکا اور جبابرہ ان کے رعب حق پرستی کے آگے جھکا، اور وہ ابن ابی بکرؓ جو حسب روایات ولی عہدی یزید کی مخالفت میں ہمیشہ سب سے آگے اور سب سے تیز اور صاف گو رہے۔ ان شیرانِ خدا کے بارے میں اس روباہی کا یقین ہمیں دلایا جا رہا ہے کہ امیر معاویہ نے جو دھمکی دی کہ خبردار اگر زبان کھولی "تو ان سب کے لہو سے وجود پر وہ لرزہ اور سکتہ طاری ہوا کہ معاویہ خانۂ خدا میں مجمع کے سامنے ان کی موجودگی میں ان کے بارے میں یہ غلط بیانی کرتے رہے کہ یہ چاروں یزید کی بیعت کر چکے ہیں، اور ان میں سے کسی کے لب کو جنبش نہیں ہو سکی!

کیسی ناقابل تصور باتیں ہیں! مگر ہمارے یہاں ٹکسالی سکوں کی طرح چل رہی ہیں۔ ابن کثیر جیسا محتاط مورخ بھی معاویہ دشمنی کی اندھی وبا کے اس زہر سے نہیں بچ پایا اور تفصیل سے گریز کے باوجود اتنا بہرحال لکھ دیا —— جیسا کہ گزر چکا —— کہ:

> "معاویہ نے ان میں سے ہر ایک کو الگ بلا کے ڈرایا دھمکایا ...... پھر ان کی موجودگی میں منبر پہ جا کے تقریر کی جس پر لوگوں نے یزید کی بیعت کر لی

اور یہ خاموش بیٹھے دیکھتے رہے کیونکہ انھیں ڈرایا دھمکایا جا چکا تھا۔ ”

اسے اگر معاویہ دشمنی کا اندھا پن نہ کہا جائے تو کیا کہا جائے کہ معاویہ کا چہرہ معاذ اللہ سیاہ کرنے کے جوش میں اس بات کا ہوش بھی کھو دیا گیا کہ اُن کے چمکدار چہروں پر بھی سیاہی پھری جا رہی ہے جن کی خاطر معاویہ سے دشمنی ٹھیرائی ہے!

اور نیز یہ بھی دیکھنے کی چیز ہے کہ یہ واقعہ کس جگہ کا بیان کیا جا رہا ہے؟ ابن اثیر کے بیان کے مطابق حرم مکی (مسجد حرام) کا اور ابن کثیر کے بیان کے مطابق حرم مدنی (مسجد نبوی) کا۔ کیا کسی ”معاویہ“ کی واقعی یہ جرأت تھی کہ ان دونوں حرموں میں سے کسی حرم کے اندر شمشیر بدست لوگوں کو ان حضرات کے سروں پر مسلط کرتا کہ حکم عدولی پر گردن اڑا دی جائے۔؟

سچی بات یہ ہے کہ اگر واقعہ میں یہ سب کچھ ہوا تھا اور یہ حضرات خصوصاً حسین بن علیؓ اور عبد اللہ بن زبیرؓ اس وقت جرأت دکھانے اور جان پر کھیلنے کے بجائے ڈر سہم کر بیٹھ گئے تھے تو پھر یزید کی خلافت کے قیام کی ذمہ داری میں یہ شریک ہوئے اور تین چار سال اسی خاموشی میں گزار کر سنہ ۶۰ھ میں وفات معاویہ کے بعد جو کھڑے ہوئے تو بے جواز بھی کھڑے ہوئے اور بے وقت بھی۔

علیٰ ہذا یہ اضطراب بیان کس بات کی چغلی کھا رہا ہے؟ ابن اثیر کہتے ہیں کہ واقعہ حرم مکی کے اندر پیش آیا۔ جبکہ ابن کثیر کا بیان ہے کہ حرم مدنی میں پیش آیا؟ ایسی روایت پر کس حد تک اعتبار کیا جا سکتا ہے؟

غرض کوئی ایک نہیں سبھی کلیں اس روایت کی ٹیڑھی ہیں اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ جیسے تاریخ اسلام اور مشاہیر اسلام کا مضحکہ اڑانے کے لیے یہ روایت بنائی گئی ہو[1]

---

[1] اس سلسلے کی روایت کا آخری جزو حضرت ابن عباسؓ کی دھمکی والا بھی دیکھ لیجیے اور پھر حضرت معاویہؓ کا جواب بھی۔ کیا اسے مسخروں کی لڑائی کے سوا کچھ اور کہا جائے گا؟ اور یہی وہ معاویہ (بقیہ ص — پر)

مگر ہمارے مؤرخین نے اسے ایک "تاریخی امانت" کے طور پر محفوظ رکھنا ضروری سمجھا۔ واللہ اعلم ان حضرات کے سامنے ــــ جو کہ علم دین کے بھی ماہرین میں سے ہوتے ہیں۔ ۔ کیا چیز تھی جس نے حدیث نبویؐ "کفیٰ بالمرء کذبا ان یحدث بکل ما سمع" (آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے یہ کافی ہے کہ جو بات سنے (بلا تحقیق کئے) نقل کر دے۔ اور آیت قرآنی۔

یا ایہا الذین آمنوا ان جاءکم فاسق بنبأ فتبینوا	اے ایمان والو جب کوئی فاسق کوئی خبر تم کو پہنچائے تو ذرا اس کی تحقیق کر لیا کرو۔

کو تاریخی واقعات کی روایتوں کے سلسلے میں قابل اطلاق نہیں سمجھا جبکہ حدیث کی روایات کے سلسلے میں ان ہدایات کا خیال ضروری مانا گیا۔ ؟

واقعہ کی قرین قیاس صورت

اوپر کی بحث کا مقصد یہ نہیں ہے کہ سرے سے کسی ایسے واقعہ کے وجود ہی کا انکار کر دیا جائے جس میں حضرت معاویہؓ نے رفع اختلاف کی خاطر حجاز کا کوئی سفر کیا ہو اور ان حضرات (حضرت حسینؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ وغیرہ) سے ملے ہوں جن کو یزید کی ولی عہدی قبول کرنے سے ابا (انکار) تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ ہمارے خیال میں تو یہ دعویٰ بھی صحیح نہیں ہوگا کہ ان ملاقاتوں میں کوئی تلخی ترشی ہی نہیں ہوئی۔ لیکن اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ اس طرح کے قصے ہرگز نہیں پیش آئے جو ابن اثیر کی تاریخ نے سنائے ہیں۔ واقعہ کی تمام روایات و بیانات کو دیکھتے ہوئے اور مذکورہ بالا بحث میں اٹھائے گئے نکات و سوالات کو بھی سامنے رکھتے ہوئے روایات کے جو اجزا قابل قبول نظر آتے

حاشیہ ص ــ کا بقیہ) ہیں جو حجاز میں جاکر حجازیوں پر شیر ہو گئے اور اپنے پایہ تخت دمشق میں بالکل بھیڑ!) اللہ اعلم بالسر

بیانات کی روشنی میں سارے قصے کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں معلوم ہوتی کہ حضرت امیر معاویہؓ، جیسا کہ ابن کثیر کا بیان ہے، عمرے کی نیت کر کے شام سے حجاز کے لیے نکلے اور عمرے سے فراغت پا کر مدینہ منورہ میں قیام کیا۔ یہاں انھوں نے مدینے کے ان حضرات سے بات کر کے جو یزید کی ولی عہدی کے مخالف تھے اس الجھن کو دور کرنا چاہا جو ان کی مخالفت کی وجہ سے اس معاملے میں پڑ رہی تھی۔ یہ لوگ تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور حضرت حسین بن علیؓ۔ ان حضرات سے حضرت معاویہؓ کی گفتگو کی روداد کے سلسلے میں طبری کی روایت زیادہ قرین قیاس تھی جو صـ پر گزر چکی ہے۔ کیونکہ:

(الف) یہ چاروں افراد میں سے ہر فرد کے ساتھ علیحدہ گفتگو دکھاتی ہے۔ اور حضرت معاویہؓ جیسے مدبر اور سیاست داں سے ایسے حالات میں کہ ایک مخالف محاذ انھیں توڑنا ہے، یہی بات قرین قیاس ہے کہ وہ ہر فرد سے الگ اور تنہا گفتگو کریں۔

(ب) بیان چار افراد کو تین خانوں میں بانٹتی ہے۔ حضرت حسینؓ اور حضرت ابن زبیرؓ کا ایک خانہ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا اپنا الگ خانہ اور حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ کا ایک تیسرا خانہ۔ اور یہ بالکل واقعی تقسیم ہے۔ یہ چاروں حضرات اسی طرح کی تقسیم کے مستحق تھے۔ اور حضرت معاویہؓ جیسے صاحب نظر اور صاحب بصیرت آدمی سے یہی توقع کی جانی چاہیے کہ وہ ان حضرات کی اسی طرح زمرہ بندی کریں۔ اور ہر ایک سے اس کے زمرے کے مطابق گفتگو کریں۔ چنانچہ حضرت حسینؓ اور حضرت ابن زبیرؓ سے انھوں نے بالکل ایک بات کی اور دونوں نے ایک ہی جواب بھی دیا۔ اور یہی دونوں حضرات تھے جنھوں نے حضرت معاویہؓ کے بعد یزید کی خلافت اور طاقت کو چیلنج کرنے کی یکساں روش اختیار کی۔ یہ گفتگو دونوں طرف سے بالکل سیاسی انداز کی اور نہایت ناپ تول والی نظر آتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی پوری زندگی کی روشنی میں یہ اطمینان کیا جا سکتا تھا

کہ وہ خود اپنے لیے خلافت کے دعویدار نہیں ہو سکتے۔ ان معاملات میں ان کی سب سے بڑی دلچسپی امت کا اتحاد ہے۔ وہ بالآخر یزید پر راضی ہو جائیں گے چنانچہ ان کی گفتگو بھی یہی تاثر دیتی ہے اور حضرت معاویہؓ کی طرف سے بات میں بھی ایک کھلا پن اور اعتماد کی کیفیت نظر آتی ہے۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ اگر ۵۶ھ میں زندہ تھے تو خلافت کے دعویدار نہ ہونے میں تو بظاہر حضرت عبداللہ بن عمرؓ ہی کے زمرے کے آدمی تھے مگر یزید کی مخالفت میں سب سے زیادہ متشدد پائے جاتے تھے اور اسلامی نظام خلافت میں باپ کی طرف سے بیٹے کی نامزدگی کی بظاہر کوئی گنجائش نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے ساتھ حضرت معاویہؓ کی گفتگو دیکھی جائے تو دونوں ایک دوسرے کے لیے ناقابل برداشت نظر آتے ہیں۔ نہ سمجھنے کی کوئی امید پائی جاتی ہے نہ سیاسی مکالمے کی کوئی گنجائش۔ یہ بات کتنی ہی ناخوشگوار ہو لیکن طرفین کی پوزیشن کے پیش نظر سمجھ میں آنے والی ہے۔ طرفین دو انتہاؤں پر تھے۔

طبری کی روایت کے یہ دو پہلو (الف اور ب) ایسے ہیں جو ہمیں آمادہ کرتے ہیں کہ اس روداد گفتگو کو بطور واقعہ تسلیم کر لیں[1] مگر روایت کی دو یا تین کمزوریوں کی وجہ سے ہم اس پر زور نہیں دے سکتے۔

۱۔ روایت کا بنیادی راوی قطعی نامعلوم شخصیت ہے "رجل بنخلة" (نخلہ کا ایک آدمی)، اور پیچھے جہاں روایت گزری وہاں ہم بتا چکے ہیں کہ نخلہ بھی کوئی ایک متعین جگہ نہیں ہے۔ اس نام کی دو بستیوں کا ذکر معجم البلدان میں ہے لیکن دونوں میں سے ایک کا تعین بھی ہو جائے تب بھی مجہولیت تو برقرار ہی رہے گی۔

---

[1] جبکہ ابن اثیر کی روایت میں جو گفتگو بیان کی گئی ہے اس میں مخالفین کی طرف سے حضرت ابن زبیرؓ کی گفتگو تو قرین قیاس ہو سکتی ہے مگر حضرت معاویہؓ کی طرف سے منسوب باتیں بالکل بچکانہ اور خلاف قیاس ہیں۔ اتنے سخت مخالفین سے ایسی بچکانہ بہلاوے کی باتیں حضرت معاویہؓ کے متعلق نہیں سوچی جا سکتیں۔

۲۔ یہ روایت مخالفین میں پانچ آدمیوں کا شمار کرتی ہے۔ اور پانچواں نام حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا دیتی ہے مگر جیسا کہ اوپر ایک جگہ بحث آ چکی ہے، اس نام کا شمار قطعاً غلط ہے اور اس کی ایک دلیل — یا قرینہ — خود روایت ہی میں موجود ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کے ساتھ کوئی گفتگو روایت میں نہیں دکھائی گئی۔

۳۔ اس میں گفتگو کی جگہ کا نام تو نہیں لیا گیا کہ مکہ تھا یا مدینہ، مگر حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی زبان سے یہ الفاظ کہلوائے گئے ہیں کہ "یا امیر المومنین نحن فی حرم اللہ عزوجل" (اے امیر المومنین ہم اس وقت حرم الٰہی میں ہیں)، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بات چیت مکہ مکرمہ میں ہو رہی تھی جبکہ جن لوگوں نے حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ کو اس گفتگو کے وقت تک زندہ بتایا ہے انھوں نے یہ بھی کہا ہے — جیسا کہ پیچھے اسی سلسلے کی بحث میں گزر چکا ہے — کہ وہ حضرت معاویہؓ کے اس سفر ہی کے دوران میں یزید کے لیے ان کی مہم سے ناراض ہو کر مکے چلے گئے تھے اور اسی سفر ہی میں مکہ سے آٹھ دس میل دور رات کو سوتے میں ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ تب اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت عبدالرحمٰنؓ کا اگر ۵۳ھ میں انتقال نہیں ہو چکا تھا (جو کہ عام طور پر ان کا سنہ وفات مانا گیا ہے) اور وہ ۵۶ھ میں حضرت معاویہؓ کے اس سفر کے وقت بقید حیات تھے تو لازماً حضرت معاویہؓ سے ان کی ملاقات کی جگہ مدینہ ہے نہ کہ مکہ۔

ان تین موٹی موٹی باتوں کی وجہ سے طبری کی روایت کے متعلق ہم یہ اطمینان تو نہیں کر سکتے کہ فی الواقع یہی گفتگو ان حضرات کے درمیان پیش آئی ہوگی۔ مگر اس کے حق میں جانے والے قرائن کو دیکھتے ہوئے اور ابن اثیر وغیرہ کے بیانات کے سلسلے میں یہ دیکھتے ہوئے کہ ایک طرف تو وہ قطعاً ناقابل تصور ہیں جیسا کہ تفصیلی بحث کر کے دکھایا جا چکا۔ اور دوسری طرف سرے سے کوئی سند ہی اپنے ساتھ نہیں رکھتے۔ ہمیں روداد گفتگو کی حد تک طبری کا بیان بہرحال قابل ترجیح اور واقعیت سے قریب تر

معلوم ہوتا ہے۔

اور اس گفتگو کے بعد جس میں کوئی خاص امید افزا بات نہیں تھی ظاہر ہے کہ حضرت معاویہؓ کو اس نتیجہ پر پہنچ جانا تھا کہ یہ لوگ فی الحال بیعت کرنے والے نہیں ہیں۔ جبکہ اور سب جگہ بیعت ہو چکی ہے۔ تو اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ یہ بیعت اور ولی عہدی توڑ دی جائے گی کہ رکھی جائے گی؟ اسے مضبوط اور مکمل کیا جائے گا یا ایک غیر مستقل اور غیر یقینی حالت میں رکھا جائیگا؟

حضرت معاویہؓ جیسے ایک مضبوط ارادے کے شخص سے، ایک انتہائی ذمہ دار حیثیت کے شخص سے یہ توقع غالباً نہیں کی جا سکتی کہ وہ ایک ایسے حلقے کے تین چار افراد کے اختلافات کی بنا پر جس کا سیاسی وزن حضرت علیؓ کے مدینے کو چھوڑ کر کوفہ کو دار الخلافہ بنا لینے کے بعد سے ختم ہو گیا تھا۔ اپنی اب تک کی ساری کارروائی لپیٹ کر رکھ دیں گے اور اپنے بارے میں ایک کمزور اور کوتاہ بین حکمران ہونے کا تاثر دیں گے، جبکہ وہ اپنی کارروائی کو ملت کی ایک ناگزیر ضرورت کی نظر سے بھی دیکھ رہے تھے جیسا کہ آگے آئیگا۔

ہمارے نزدیک قرین قیاس ہے کہ انھوں نے ان حضرات کو ان کی ذاتی حیثیتوں کے باوجود نظر انداز کر کے دیگر اہل مدینہ کو خطاب کرنے اور اعتماد میں لینے کا فیصلہ کیا ہو۔ اور یہی وہ خطاب رہا ہوگا جس کا ذکر ابن اثیر کی روایت میں گزرا۔ جس کا خلاصہ ان کے بیان کے مطابق یہ تھا۔

اور معاویہؓ نے مدینے میں خطاب کیا	وخطب معاویة بالمدینة
جس میں یزید کا ذکر کر کے اس کی	فذکر یزید ومدحه
خوبیاں بیان کیں اور باعتبار عقل	وقال من احق منه بالخلافة
فضل اور حیثیت اسے خلافت کے	فی فضله وعقله وموضعه
لیے موزوں تر بتاتے ہوئے کہا کہ	وما اظن قومًا بمنتهین حتی

تصیبھم بوائق تحت اضلعھم	جو لوگ مخالفت کر رہے ہیں میں
وقد انذرت ان اغنت	سمجھتا ہوں کہ وہ اپنے آپ کو تباہ
النذر [1]	کیے بغیر باز آنے والے نہیں ہیں۔

ابن اثیر کے اس بیان کی بھی ایسی کوئی سند نہیں ہے کہ اس کو رد کرنا مشکل ہو۔ بلکہ سرے سے سند ہے ہی نہیں۔ لیکن اس وقت کے جو حالات ہمارے سامنے آ رہے ہیں ان کو دیکھتے ہوئے یہ بات کچھ بعید نظر نہیں آتی کہ حضرت معاویہؓ ان حضرات کے اختلاف سے تنگ آ رہے ہوں اور اپنی ذمہ داری کا تقاضہ سمجھ رہے ہوں کہ سختی کا انداز اختیار کر کے اس اختلاف کو دبایا جائے چنانچہ انہوں نے اپنے اس خطاب میں اس طرح کے جملے بھی کہے ہوں، جن کی ترجمانی ابن اثیر نے مذکورہ بالا الفاظ سے کی ہے۔ مگر سختی کا وہ انداز کہ ان لوگوں کو جلسے میں شریک کر کے زبان بند رکھنے کا حکم دیا جائے اور شمشیر بکف سپاہی ان کے سر پر مسلط کیے جائیں تاکہ خوف کا عالم ان پر طاری رہے۔ یہ قطعی ناقابل یقین بات ہے۔ نہ حضرت معاویہؓ کے بیس سالہ دور میں اس جبر و ستم کی ـــــ اور خاص طور سے ان مؤقر حضرات کے ساتھ ـــــ کوئی مثال ملتی ہے نہ اہل مدینہ سے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ جبر کا یہ مظاہرہ دیکھتے ہوئے خاموش رہ جاتے۔ اور نہ ہی ان بزرگوں کے متعلق تصور کیا جا سکتا ہے کہ وہ اتنے بزدل اور پست ہمت تھے کہ مالک بن انسؒ، احمد بن حنبلؒ اور ابو حنیفہؒ کی مثال بھی پیش کرنے کے اہل نہ ہوئے اور مزید برآں یہ جبر بالکل بیکار تھا۔ اگر ان حضرات کو اس کے بعد پابند نہ کیا جاتا ـــــ ـــــ ـــــ کہ اب یہ اپنا اختلاف کسی پر ظاہر نہ کریں گے۔ مگر اس جبر کے قصے ہی میں ہمیں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جیسے ہی معاویہؓ جلسہ ختم کر کے رخصت ہوئے

---

[1] ابن اثیر ج ۳ ص ۲۵۱ ۔

ویسے ہی ان حضرات نے اس بات کا اظہار بھی کر دیا کہ ان کے متعلق جھوٹ بولا گیا ورنہ انھوں نے نہ بیعت کی ہے نہ وہ اس سے راضی ہیں۔

فیصلہ کن بات

واقعہ یہ ہے کہ اس جبر و دباؤ والے قصے کی روایتیں اتنی مختلف قسم کی ہیں کہ اول تو ان کا اختلاف ہی ان کو ناقابل توجہ بنا دینے کے لیے کافی ہے۔ اور وہ کافی نہ ہو تو جبر و دباؤ کے قصے پر جو اشکالات وارد ہوتے اور سوالات اٹھتے ہیں اُن کی تاب یہ قصہ کسی طرح نہیں لا سکتا۔ اور اس سب پر مزید آخری درجے کی اور نہایت واضح فیصلہ کن بات یہ ہے کہ یہ سب ہی مختلف روایتیں یہ بھی بتاتی ہیں کہ جبر کا عمل کر کے بیعت حاصل کرنے کے بعد معاویہ فوراً ہی دمشق کے لیے روانہ ہو گئے اور ان مجبور حضرات کی زبانی سب اہل مدینہ کے سامنے اس جبر کا راز کھل گیا جس میں (ان حضرات پر جبر کے ساتھ) باقی اہل مدینہ سے جھوٹ اور غلط بیانی بھی شامل تھی۔ سوال یہ ہے کہ۔

کیا کوئی عقل باور کر سکتی ہے کہ اہل مدینہ سے جو بیعت ان کی لاعلمی میں ایسے جبر اور جھوٹ کے بل پر لی گئی اس کے خلاف ان کے اندر کوئی ردعمل اس وقت نہیں ہوا ہو گا جب انھیں فوراً ہی، پتہ چلا ہو گا کہ ان کے امیر المومنین معاویہ ان کے ساتھ کیسا فریب (معاذ اللہ) کر کے گئے ہیں؟ کیا کوئی امکان سوچا جا سکتا ہے کہ ایسی بیعت جوں کی توں قائم رہ جائے۔ ایک آدمی بھی نہ نکلے جو اپنی گردن سے اس دھوکے کی بیعت کو نکال کر پھینکتا ہوا بتایا جائے؟

سب روایتیں بتاتی ہیں کہ جبر کا ماحول فوراً ہی ختم ہو گیا تھا۔ معاویہ اپنے "مسلح سواروں" کو ساتھ لے کر واپس جا چکے تھے۔ لیکن ایک روایت بھی یہ نہیں بتاتی

کہ ادنیٰ شورش اور ادنیٰ ردِ عمل بھی مدینے کی آبادی میں اس "جبر و فریب" کے خلاف ہوا ہو۔ تب کیا یہ جبر اور جھوٹ کے قصے سوائے جھوٹ کے اور کچھ ہو سکتے ہیں اور ان پر کان دھرنا چاہیے؟ مگر افسوس یہ خرافاتی باتیں آج کے تحقیق پسند دور میں بھی ٹکسالی سکوں کی طرح چل رہی ہیں۔ کیونکہ ہم ان باتوں کو دہرانے یا سننے کے پشتہا پشت سے عادی ہو گئے۔ اور جس چیز کے ہم قدیم سے عادی چلے آ رہے ہوں وہ ایک تو عادت کی وجہ سے نہیں چھوٹتی۔ دوسرے اس کی قدامت جیسے ایک طرح کا تقدس اور ایک وزن اسے بخش دیتی ہے۔ اے اللہ تو ہی مدد فرما۔

باب ششم

یزید کی ولیعہدی پر حضرت معاویہ کو اصرار کیوں؟

اور

دیگر حضرات کو اس سے اختلاف کیوں؟

اصرار اور اس کی بنیاد

ہمارے سامنے ایسی کوئی چیز نہیں ہے جس کی بنیاد پر قطعی انداز میں کہا جا سکے کہ امیر معاویہ کو کیوں اصرار تھا کہ اپنے بعد کے لیے اپنے بیٹے یزید کو ولی عہد بنا جائیں۔ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ:۔

وذالك من شدة محبة الوالد لولده ولما كان يتوسم فيه من النجابة الدنيوية وسيما اولاد الملوك ومعرفتهم بالحروب وترتيب الملك والقيام بأبهته وكان يظن

اور یہ بات اس شدید محبت کی وجہ سے تھی جو ایک باپ کو بیٹے سے ہوتی ہے۔ نیز اس کی دنیوی شرافت و اصالت کی بنا پر اور خاص کر وہ جو بادشاہوں کی اولاد میں شمول جنگ اور نظم مملکت سے واقفیت

ان لا یقوم احد من ابناء الصحابۃ
فی ھذا المعنی ولھذا
قال لعبد اللہ بن عمر
فیما خاطبہ بہ انی خفت
ان اذر الرعیۃ من بعدی
کالغنم المطیرۃ لیس
لھا راع[1]

اور شایانِ کرّوفر کی اہلیت ہوتی ہے۔
نیز معاویہ سمجھتے تھے کہ اس سن میں
صحابہ کی اولاد میں کوئی دوسرا نہیں
ہے جو کاروبارِ مملکت سنبھال سکے۔
...چنانچہ عبداللہ بن عمرؓ سے انہوں
نے کہا تھا کہ میں اگر یزید کو نہ بناؤں
تو ڈرتا ہوں کہ رعیت کو اپنے بعد ایسے
چھوڑ جاؤں گا جیسے بارش میں بکریاں
کہ جن کا کوئی چرواہا نہ ہو۔

اسی ذیل میں ابن کثیر نے امیر معاویہؓ کی وہ گفتگو بھی نقل کی ہے جو انہوں نے حضرت عثمانؓ کے بیٹے سعید بن عثمانؓ سے اس معاملہ میں کی تھی۔ ابن کثیر نے تو لکھا ہے کہ سعید نے یزید کے مقابلے میں اپنا استحقاق جتایا تھا اس پر امیر معاویہ نے وہ بات کہی تھی، مگر طبری اور ابن اثیر کے مطابق اصل بات یہ تھی کہ اس زمانے میں جب کہ یزید کی ولی عہدی کا قصہ چھڑا ہوا تھا، سعید گئے اور خواہش کی کہ انہیں خراسان کی ولایت دے دی جائے، امیر معاویہؓ نے معذرت کی کہ وہ علاقہ تو ابن زیاد کی تحویل میں ہے۔ اس پر سعید بگڑ گئے اور کہا کہ تم جو کچھ ہوئے ہو میرے باپ کی وجہ سے ہوئے اور آج تم مجھے اس طرح کا جواب دیکر ٹال رہے ہو، جبکہ اپنے بیٹے کے لیے تم خلافت کا بندوبست کر رہے ہو۔ حالانکہ میں کیا اپنی ذات سے اور کیا اپنے ماں باپ سے، ہر لحاظ سے یزید پر فائق ہوں، اس پر امیر معاویہؓ کا جو جواب نقل کیا گیا ہے وہ ابن کثیر نے اپنے مذکورہ بالا بیان ہی کے ذیل میں نقل کیا ہے کہ امیر معاویہؓ نے جواب میں کہا کہ :-

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۸۶ ۔

بے شک تمہارے والد کے احسانات ناقابلِ انکار ہیں اور تمہارے باپ بیشک
یزید کے باپ سے بڑھ کر ہی تھے، تمہاری ماں بھی یزید کی ماں سے اس بنا پر
فائق کہ وہ قریشی تھیں اور یزید کی ماں بنی کلب کی۔ لیکن تم جو اپنے بارے
میں کہتے ہو تو سنو کہ تمہارے جیسے اگر اتنے بھی ہوں کہ غوطۂ دمشق بھر جائے
تب بھی یزید مجھے تم سب سے محبوب تر ہوگا۔[1]

گویا ابن کثیرؒ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ اگرچہ امیر معاویہؓ کے اس فیصلے میں محبتِ پدری کا بھی دخل تھا مگر تنہا یہ بات نہیں تھی، بلکہ وہ یزید کو کاروبارِ مملکت کے لیے اہل تر بھی جانتے تھے۔

اسی سیاق میں وہ مزید لکھتے ہیں کہ:-

وروینا عن معاویة انه قال یوماً فی خطبته: اللهم ان کنت تعلم انی ولیته لانه فیما اراه اهل لذلک فاتمم له ما ولیته وان کنت ولیته لانی احبه فلا تتمم له ما ولیته۔[2]

ہم معاویہ کے سلسلے میں نقل کر چکے ہیں کہ انہوں نے ایک دن اپنے خطبے میں کہا تھا کہ اے اللہ اگر تو جانتا ہے کہ میں نے اس کو (یزید کو) اس کی اہلیت کی بنا پر ولی عہد بنایا ہے تو اس ولایت کو تو تکمیل تک پہنچا دے اور اگر میرا یہ عمل اس لیے ہے کہ مجھے اس سے محبت ہے، تو پھر اسے تو پورا نہ ہونے دے۔

اس دعا کے پیش نظر جو منبر پر اور مجمع میں کی گئی بعض حضرات کا کہنا ہے کہ اس کے بعد اس بدگمانی کی گنجائش نہیں رہتی کہ یزید کی ولی عہدی بربنائے محبت تھی نہ کہ بربنائے اہلیت[3] اور واقعہ یہ ہے کہ اس دعا کے ثبوت میں اگر کوئی کلام نہ ہو تو پھر بدگمانی واقعی بڑے دل گردے کا کام ہے۔

---

[1] البدایہ والنہایہ ج۸ [2] ایضاً۔ [3] حضرت معاویہ اور تاریخی حقائق۔ از مولانا تقی عثمانی۔

الغرض ابن کثیر کے مذکورہ بالا بیان کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ حضرت امیر معاویہ کو یزید کی ولی عہدی پر اصرار اس لیے نہیں تھا کہ وہ ان کا بیٹا ہے بلکہ بنائے اصرار یہ تھی کہ وہ اسے کارِ خلافت کے لیے موزوں گردان رہے تھے۔ گزشتہ باب (نمبر ۱) میں بھی دو موقعوں پر ہم دیکھ آئے ہیں کہ حضرت معاویہؓ نے ایک تو وفود کی مجلس میں، دوسرے اہلِ مدینہ سے خطاب میں صاف طور پر یزید کی اہلیت اور افضلیت کا حوالہ دیا ہے جس کو بالکل نظر انداز کرنا تو بہرحال مناسب نہیں ہوگا۔

ابن خلدون کا کلام

ابن خلدون نے اپنے شہرۂ آفاق "مقدمہ" میں اس مسئلہ ولیعہدی پر بہت شرح و بسط سے کلام کیا ہے۔ آئیے دیکھیں اس سے کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

"امامت اور خلافت کے معنی اصل میں امت کے دینی و دنیاوی مصالح کی نگرانی اور حفاظت کے ہیں۔ پس امام لوگوں کی مصالح کا امین اور ان کی بہبود کا ذمہ دار ہے۔ اور جب وہ اپنی زندگی میں اس کا ذمہ دار ہے اور اسے مسلمانوں کی فلاح و بہبود عزیز ہے تو قدرتی طور پر اس کی خواہش بھی ہونی چاہیے اور اس کا اخلاقی فریضہ بھی ہے کہ اپنی موت کے بعد کے لیے بھی ان کی بھلائی کی فکر کرے اور کسی ایسے آدمی کو قائم مقام کر جائے جو اسی کی طرح ان کے معاملات کی دیکھ بھال کرنے والا ہو اور لوگ اس سے اسی طرح مطمئن رہیں جیسے اس کے پیشرو سے مطمئن تھے (اسی کا نام ولایت عہد ہے) اور یہ شرعاً بالکل جائز ہے کیونکہ اسکے جواز پر اور اس طرح امامت کے انعقاد پر امت کا اجماع ہو چکا ہے۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے صحابہؓ کی موجودگی میں عمرؓ کو اسی طرح قائم مقام بنا دیا تھا جس کو صحابہؓ نے جائز ٹھہرایا اور عمرؓ کی اطاعت اپنے اوپر لازم کر لی۔ بعد ازاں جب

حضرت عمرؓ کی وفات کا وقت آیا تو آپؓ نے اپنا بار عشرہ مبشرہ میں سے باقی ماندہ چھ اصحاب کو سونپ دیا کہ وہ مشورہ کر کے خلافت کسی ایک کے سپرد کر دیں پھر ان میں سے بعض بعض پر فیصلہ چھوڑتے چلے گئے یہاں تک کہ عبدالرحمن بن عوفؓ کو اختیار کلی دے دیا گیا پس انھوں نے بہتر سے بہتر کوشش کی اور عام مسلمانوں کے خیالات کا جائزہ لیا تو عثمانؓ اور علیؓ پر سب کو متفق پایا۔ اب ان دو میں سے ایک کا انتخاب کرنا تھا تو انھوں نے عثمانؓ کی بیعت کو ترجیح دی کیونکہ وہ نہایت سختی کے ساتھ شیخینؓ (ابوبکرؓ و عمرؓ) کی اقتدا پسند کرتے تھے اور اس باب میں عبدالرحمنؓ کے ہم خیال تھے کہ ہر ایک موقع پر اپنی رائے کے بجائے شیخینؓ کی اقتدا کرنی چاہیے۔ چنانچہ عثمانؓ کی خلافت منعقد ہو گئی۔ اور سب نے ان کی اطاعت اپنے اوپر لازم کر لی ـــــ ان دونوں موقعوں پر صحابہ کرامؓ کی کافی تعداد موجود تھی مگر کسی ایک نے بھی اس بات پر انکار یا اعتراض نہیں کیا پس اس سے ثابت ہوا کہ تمام صحابہ کرام ولی عہدی کے جواز پر متفق تھے۔ اور اجماع جیسا کہ معلوم ہے حجت شرعی ہے پس امام اس معاملہ میں متہم نہیں ہو سکتا اگرچہ وہ یہ کاروائی اپنے باپ یا بیٹے ہی کے حق میں کیوں نہ کرے۔ اس لیے کہ جب اس کی خیر اندیشی پر اس کی زندگی میں اعتماد ہے تو موت کے بعد تو بدرجۂ اولیٰ اس پر کوئی الزام نہیں آنا چاہیے (کیونکہ جو زندگی بھر اپنے آپ کو خیر خواہ ثابت کرے گا مرتے وقت وہ بدخواہی کا الزام اپنے سر لے کر جانا کبھی گوارا نہ کرے گا) بعض لوگوں کی رائے ہے کہ باپ اور بیٹے کو ولی عہد بنانے میں امام کی نیت پر شبہ کیا جا سکتا ہے اور بعض صرف بیٹے کے حق میں یہ رائے رکھتے ہیں۔ مگر ہمیں ان دونوں سے اختلاف ہے۔ ہماری رائے میں کسی صورت میں بھی بدگمانی کی کوئی وجہ نہیں ہے اور خاص کر ایسے مواقع پر کہ جہاں ضرورت

اسی کی دائمی ہو۔ مثلاً کسی مصلحت کا تحفظ یا کسی مفسدہ کا ازالہ اس میں مضمر ہو، تب تو کسی طرح سے سوءِ ظن کی کوئی وجہ ہی نہیں! جیسے کہ معاویہؓ کا اپنے بیٹے یزید کو ولی عہد بنانے کا واقعہ ہے، تو اولاً تو معاویہؓ کا لوگوں کے عمومی اتفاق کے ساتھ ایسا کرنا اس باب میں بجائے خود ایک حجت ہے، اور پھر انہیں متہم یوں بھی نہیں کیا جاسکتا کہ ان کے پیشِ نظر بجز اس کے کچھ نہیں تھا کہ امت میں اتفاق و اتحاد قائم رہے۔ اور اس کے لیے ضروری تھا کہ اہلِ حل و عقد میں اتفاق ہو۔ اور اہلِ حل و عقد صرف یزید ہی کو ولی عہد بنانے میں متفق ہو سکتے تھے کیونکہ وہ عموماً بنی امیہ میں سے تھے اور بنی امیہ اس وقت اپنے میں سے باہر کسی کی خلافت پر راضی نہیں ہو سکتے تھے، (اور ان کی ناراضگی سخت افتراق و اختلاف کا باعث ہوتی۔) کیونکہ وہ قریش بلکہ پوری ملت کا سب سے بڑا با اثر اور طاقتور گروہ ان نزاکتوں کے پیشِ نظر معاویہؓ نے یزید کو ولی عہدی کے لیے ان حضرات پر ترجیح دی جو اس کے زیادہ مستحق سمجھے جاتے تھے اور افضل کو چھوڑ کر مفضول کو اختیار کیا تاکہ مسلمانوں میں جمعیت اور اتفاق باقی رہے جس کی شارع کے نزدیک بڑی اہمیت ہے[1]

مزید لکھتے ہیں کہ:۔

خلفائے اربعہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے دور میں اور معاویہؓ کے دور میں ایک بہت بڑا فرق ہو گیا تھا اور وہ یہ تھا کہ خلفائے اربعہ کے دور میں (بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ شیخین کے دور میں) مسلمانوں کی طبیعتوں پر دین کی گرفت بہت سخت تھی، ان کی پسند و ناپسند اور رضا و عدمِ رضا کا معیار صرف دین تھا اور ان کا

---

[1] مقدمہ ابن خلدون ولی عہدی کا بیان ص ۱۷۵-۱۷۶ مطبوعہ مصر۔

دینی ضمیر انہیں ہر اُس بات سے باز رکھنے کے لیے کافی تھا جو دینی نقطۂ نظر سے نامناسب تھی اور ہر اُس بات پر آمادہ کر دیتا تھا جس میں دینی بھلائی ہوتی۔ پس ان حضرات کے بعد جس نے اپنے بعد کے لیے خلیفہ کے طور پر کسی کو منتخب کیا تو ایسے کو منتخب کیا جو دینی نقطۂ نظر سے منتخب ہونا چاہیے تھا۔ اس کے علاوہ اور کوئی وجہ ترجیح ان کے یہاں نہیں تھی۔ بس یہی کچھ دیکھ کر وہ اپنا بارِ امانت کسی کو سونپ دیتے اور پھر اس شخص کو اس کے دینی ضمیر کے سپرد کر دیتے (جو اس وقت بہت ہی حساس اور قابلِ اعتماد تھا) لیکن ان کے بعد حالت یہ نہ رہی بلکہ معاویہ کا دور جب سے شروع ہوا تو وہ تغیر جو تدریجی طور پر آ رہے تھے اس وقت اچھی طرح ظاہر ہو گئے تھے۔ ایک تو وہ عصبیت جو دین کے تقاضوں میں دب گئی تھی بلکہ دینی عصبیت میں تحلیل ہو گئی تھی اس دباؤ سے نکل کر اپنی طبعی انتہا یعنی ملوکیت پر پہنچ گئی تھی اور دوسرے دینی ضمیر کی روک ٹوک کمزور پڑ گئی لہٰذا اب امت کی شیرازہ بندی اور جماعت و اطاعت کی بقا کے لیے شخصی حکومت اور عصبیت کا سہارا لینا ضروری ہو گیا یعنی یہ کہ سارا اقتدار ایک ایسے فرد واحد کے ہاتھ میں دے دیا جائے جس کو وقت کی سب سے بڑی عصبی طاقت کی پشت پناہی حاصل ہو۔ پس اگر معاویہ کسی ایسے شخص کو اپنا جانشین بنا جاتے جس کو بنو امیہ کی عصبیت نہ چاہتی ہوتی (خواہ دین اسے کتنا ہی پسند کرتا) تو ان کی یہ کاروائی یقیناً الٹ دی جاتی، نظمِ خلافت درہم برہم ہو جاتا اور امت کا شیرازہ بکھر جاتا .... تم نہیں دیکھتے کہ مامون رشید عباسی خلیفہ نے زمانے کی تبدیلی کا یہ حکم نظر انداز کر کے علی بن موسیٰ بن جعفر الصادقؒ کو اپنا ولی عہد نامزد کر دیا تھا تو کیا نتیجہ ہوا۔ عباسی خاندان نے پورے معنی میں بغاوت کر دی، نظامِ خلافت درہم برہم ہو گیا اور مامون کو خراسان سے بغداد پہنچ کر معاملہ کو قابو میں کرنا پڑا۔"[1]

---

[1] ایضاً صـ۱۵۹

اس کلام پر ایک تنقیدی نظر

ابن خلدون کے کلام سے معلوم ہوا کہ ان کی نظر میں معاملہ کی نوعیت یہ تھی کہ ملت کے جس دور میں یزید کے لیے ولی عہدی کا فیصلہ کیا جا رہا تھا اس دور میں ملت کے اتحاد اور اس کی اجتماعیت کے بقا کے نقطۂ نظر سے اس کے سوا کوئی دوسرا فیصلہ ممکن نہیں تھا کیونکہ اس دور میں دینی ضمیر اصل اجتماعی طاقت نہیں رہا تھا بلکہ قبائلی عصبیت نے پھر سے اصل اجتماعی طاقت کا مقام حاصل کر لیا تھا اور حالات کے اس نقشے میں بنی امیہ کی عصبیت سب سے بڑی عصبی طاقت تھی اور یزید بنی امیہ کا وہ فرد جس کے بارے میں سب سے زیادہ اعتماد کیا جا سکتا تھا کہ یہ عصبی طاقت اس کی اطاعت گزار ہو کر ادارۂ خلافت کی پشتی بان ثابت ہوگی۔

اجتماع و عمران کے معاملے میں ابن خلدون کے تجزیوں اور فیصلوں کو جو اہمیت حاصل ہے اس سے انکار کسی کے لیے ممکن نہیں۔ اس لیے ان کا یہ تجزیہ کسی خوش عقیدگی کی بنا پر نہیں بلکہ سنجیدگی کی بنا پر لائق اعتنا ہونا چاہیے کہ یزید کی ولی عہدی کے پیچھے کوئی اور چیز نہیں بلکہ صرف اس اجتماعی مصلحت کا شعور کام کر رہا تھا کہ اس کے انتخاب کے ذریعہ خلافت کا ادارہ ٹوٹ پھوٹ سے بچ جائے گا۔ اور اس تجزیے کی روشنی میں ہمیں پورے اطمینان کے ساتھ یہ سمجھنے کی گنجائش ہے کہ حضرت معاویہؓ کو جو اپنی تجویز پر اصرار تھا اس کی اصل وجہ ملت کی مصلحت ہی تھی ـــــ لیکن یہ سمجھنا کہ یہ مصلحت اندیشی بالکل بجا بھی تھی، اور اس میں کوئی کلام نہیں کیا جا سکتا تھا جیسا کہ بظاہر ابن خلدون کا نقطۂ نظر ہے سو یہ صرف اس وقت ممکن ہے جبکہ ہم ابن خلدون کا یہ بیان بھی تسلیم کر لیں کہ یزید کی ولی عہدی سے اختلاف کرنے والی صرف ایک شخصیت عبداللہ بن زبیر کی تھی[1]

---

[1] مقدمہ ابن خلدون، بیان ولایت عہد ص۱۶۶

بے شک اگر واقعہ میں ایک عبداللہ بن زبیرؓ کے علاوہ کوئی قابلِ ذکر شخصیت نہ تھی جس کو یزید کی ولی عہدی کے مسئلے سے اختلاف ہو رہا ہو تو پھر ابن خلدون کی اس رائے سے اتفاق ہی کرنا پڑے گا کہ "ایک آدھ آدمی" کے اختلاف سے بھلا کہاں بچا جا سکتا ہے اور کیونکر اسے کوئی بڑی اہمیت دی جا سکتی ہے[1]۔ مگر ابن خلدون کا یہ بیان تو بالکل ایک نادر بیان ہے۔ چار اہم شخصیتیں (عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن زبیر، عبدالرحمٰن بن ابی بکر اور حسین بن علی رضی اللہ عنہم) تو ہر تاریخی بیان کے مطابق اس سلسلے میں مخالفت کرنے والی رہی ہیں۔ حتیٰ کہ ابن خلدون نے خود اپنی تاریخ میں ان چاروں کا نام دیا ہے، اور واقعہ کی اس صورت میں کہ یہ چار شخصیتیں بہت صاف اور نمایاں طور پر مخالف تھیں، یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے جو کچھ از راہ مصلحت اندیشی کیا تھا، وہ واقعہ میں بھی پوری طرح مصلحت اندیشانہ بات تھی۔ کیونکہ ان چار آدمیوں کا اختلاف ہوتے ہوئے یہ بات ماننا مشکل ہے کہ یزید کی ولی عہدی کے ذریعہ ملت کو شقاق و انتشار سے بچانے کا اطمینان کیا جا سکتا تھا۔

یہ کیسے چار آدمی تھے؟ عبداللہ بن عمرؓ اور عبداللہ بن زبیر تو اس مرتبے کے لوگ تھے کہ جب حضرت علی اور حضرت معاویہ کے درمیان "تحکیم" کا قصہ پیش آیا کہ "دو حَکَم" بیٹھ کر قرآن کی رو سے فیصلہ کریں کہ اس اختلاف کا حل کس طرح ہونا چاہیے؟ اور ان "دو حَکَموں" (حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ) کا اجلاس اس فیصلے کے لیے منعقد ہوا تو اس کی غیر معمولی اہمیت کی بنا پر اور اس بنا پر کہ بظاہر اسباب اس کے نتیجہ خیز ہونے پر امت کی اصلاح و بقا کا انحصار تھا، جن اہم لوگوں کو حَکَمین نے اس موقع پر بلوانے کی اور ان سے درخواست کرنے کی ضرورت سمجھی کہ وہ ضرور اس موقع پر موجود ہوں تو ان میں یہی دو (عبداللہ بن عمرؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ) تھے جن کا نام کے ساتھ تاریخ ذکر کرتی ہے۔

---

[1] ایضاً

فلما اجتمع الحکمان باذرح	جب حکمین اذرح[۱] کے مقام پر جمع ہوئے
وافاهم المغیرة بن شعبة	تو بہت سے لوگ وہاں پہنچے جن میں
فیمن حضر من الناس فارسل	مغیرہ بن شعبہ بھی تھے نیز ان حکمین نے
الحکمان الی عبد الله بن عمر	عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن زبیر کے
بن الخطاب وعبد الله بن	پاس بلاوا بھیجا کہ وہ اس موقعہ
الزبیر فی اقبالهم فی رجال	پر ضرور آجائیں۔
کثیر[۲]	

طبری کی روایت کے یہ الفاظ ذرا الجھے ہوئے ہیں۔ مصنف عبدالرزاق[۳] میں عبارت بہت صاف ہے لہٰذا ہم اسے بھی نقل کرتے ہیں:۔

فلما حکم الحکمان فاجتمعا	پس جب دو آدمی حکم بنا دیئے گئے اور
باذرح وافاهما المغیرة بن	وہ اذرح میں جمع ہوئے تو مغیرہ بن شعبہ
شعبة وارسل الحکمان الی	بھی وہاں پہنچ گئے اور ان حکمین نے
عبد الله بن عمر والی عبد الله	عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن زبیر کو
بن الزبیر ووافاهما رجال کثیر	(بطور خاص) بلاوا بھیجا اور ان کے
من قریش[۴]……	علاوہ قریش کے بہت سے لوگ پہنچے۔

---

[۱] یہ شام کے حدود میں ایک مقام کا نام ہے۔ [۲] طبری جلد ۶ صفحہ ۳۲۔ [۳] یہ امام ابو بکر عبدالرزاق (الصنعانی م ۲۱۱ھ) کا مرتب کردہ مجموعۂ احادیث و آثار ہے۔ امام عبدالرزاق امام بخاری کے استاذ ہیں۔ اس کتاب کے نسخے اب تک قلمی تھے ۱۹۷۰ء میں پہلی بار مطبوعہ شکل میں سامنے آئی ہے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو ایڈٹ کیا ہے گیارہ جلدوں میں تمام ہوئی ہے [۴] ج ۵ ص ۴۶۲۔ مزید برآں صحیح بخاری میں بھی ایک روایت ہے جس سے حضرت عبداللہ بن عمر کا اس موقع پر بلایا جانا معلوم ہوتا ہے دیکھئے کتاب المغازی باب غزوۃ الخندق کی بارہویں حدیث (۴۱۰۸) ہے۔ عن سالم عن ابن عمر نیز عن عکرمۃ عن ابن عمر۔ صاحب العواصم من القواصم ابو بکر ابن العربی نے بھی ان واقعات کے سلسلے میں نقل کی ہے جن کا تعلق یزید کی ذات سے ہے ص ۲۲۵ پر)

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کی مزید برآں ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ اس موقع پر حکمین کے درمیان ایک متبادل شخصیت کی تلاش میں سب سے پہلا نام عبد اللہ بن عمرؓ ہی کا آیا کہ علیؓ اور معاویہؓ دونوں کو چھوڑ کر ان کو خلیفۂ اسلام مان لیا جائے۔

قال عمرو یا ابا موسیٰ أأنت علی ان تسمی رجلاً یلی امر هذه الامة تسمّه لی فان اقدر علی ان اتابعك فلك علیّ ان اتابعك والّا فلی علیك ان تتابعنی قال ابو موسیٰ أسمّی لك عبد اللّٰہ بن عمر وكان ابن عمر فیمن اعتزل۔[۵]

عمرو بن العاص نے دوسرے حکم ابو موسیٰ اشعری سے جبکہ وہ دونوں تنہائی میں گفتگو کو بیٹھے، کہا کہ ابو موسیٰ کیا تم پسند کرتے ہو کہ ہم امت کی سربراہی کے لیے کسی ایک شخص کو نامزد کر دیں! اگر پسند کرتے ہو تو نامزد کرو، میرے لیے اگر ممکن ہوا کہ تمہارا دیا نام قبول کر لوں تو میں قبول کر لوں گا ورنہ پھر میں جو نام دوں تم اس پر راضی ہو جانا۔ ابو موسیٰ اشعری نے کہا میں عبد اللہ بن عمر کا نام تجویز کرتا ہوں۔۔۔ اور ابن عمر ان لوگوں میں سے تھے جو اس دور کے اختلافات سے الگ رہے تھے۔

الغرض جن افراد کا یہ مقام ہو کہ مسئلہ خلافت کی پیچیدہ گتھی سلجھانے جاتے ہیں ان کی موجودگی بطور خاص ضروری سمجھی جا رہی ہو، دونوں طرف کے حکم ان کا انتظار کر رہے ہوں۔

(بقیہ ص۱۳۴ کا) بظاہر تائید کیلئے حضرت معاویہؓ کی کوششوں سے ہے لیکن یہ کوئی غلط فہمی ہے ورنہ اس حدیث کا تعلق سنہ ۳۷ھ میں حکمین کے اجلاس سے ہے جیسا کہ مصنف عبد الرزاق کی مذکورہ بالا عبارت کے اگلے حصے سے قطعی طور پر معلوم ہوتا ہے۔ دیکھئے مصنف ج ۵ ص ۴۶۶ اور فتح الباری ج ۷ ص ۴۰۳ (مطبوعہ سعودیہ)

[۵] طبری ج ۶ ص ۳۲ ۔ مصنف ج ۵ ص ۴۶۵ ۔ **ایک اہم فائدہ** ۔۔۔ اس فائدہ کے لیے ملاحظہ ہو ضمیمہ اس باب کے خاتمے پر۔

اور مزید برآں ان میں سے ایک کا بعد حیات بھی ہو کر اس کی ذات میں مسئلہ خلافت کی پیچیدگی کا حل دیکھا جا رہا ہو ایسے اشخاص کے اختلاف کے ساتھ کیسے قطعی امید کی جا سکتی تھی کہ یزید کے ماتحت نظم خلافت استوار رہ سکے گا؟ پھر یہ دو ہی نہیں، حضرت حسین بن علیؓ بھی اختلاف کے لیے حتمی طور پر موجود تھے۔ اور تنہا انہی کا اختلاف اس بات کا اندیشہ رکھنے کے لیے کافی تھا کہ یزید کے لیے خلافت کا کاروبار آسان نہیں ہو سکے گا۔ اور اگر عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ بھی ولی عہدی کی کاروائی کے دنوں میں بقید حیات تھے تو وہ تو بالکل شمشیر بے نیام تھے۔ خود حضرت معاویہ کا جو وصیت نامہ یزید کے لیے نقل کیا گیا ہے وہ اگرچہ بعض وجوہ سے مشکوک ہے تاہم اس میں بھی یزید کو ان چار آدمیوں کے اختلاف سے آگاہی اور مناسب ہدایات دی گئی ہیں۔

بہر حال یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت کے حالات میں یزید کے ماتحت ادارۂ خلافت کو کم سے کم خطرہ ہو سکتا تھا۔ لیکن وہ بات جو ابن خلدون نے کہی ہے کہ یزید کی ولیعہدی کے ذریعہ ادارۂ خلافت کو گویا خطرات سے تحفظ عطا کر دیا گیا، یہ کچھ زیادہ ہی بات ہے۔ بیشک عبداللہ بن عمر نے اپنی رائے کے اختلاف کو عملی شکل دینا پسند نہیں کیا جیسا کہ ان کا مزاج تھا اور جیسا کہ ان کے بارے میں حضرت معاویہؓ کا اندازہ تھا اور بے شک حضرت حسینؓ کے معاملے میں بھی حضرت معاویہ کا اندازہ صحیح ہوا کہ اگرچہ کوفی انھیں حرکت میں لائے بغیر نہ چھوڑیں گے مگر وہی یزید کی طرف سے ان کے لیے کافی بھی ہو جائیں گے، جیسا کہ ان کی پرانی عادت رہی ہے۔ مگر عبداللہ بن زبیر کی سرگرم اور پر زور محاذ آرائی جس سے حضرت معاویہؓ کو سچ مچ خطرہ تھا حضرت حسین کی شہادت کے اثرات سے مل کر بالآخر یزیدی خلافت کے لیے موت کا پیام بن ہی گئی۔ ایسی موت کہ پھر اس گھرانے میں سے خلافت نکل گئی۔ اس لیے اگرچہ یہ تسلیم کہ حضرت معاویہ کا یزید کو ولی عہد بنانا آلی مصلحت اندیشی ہی کے ماتحت تھا نہ کہ جذبۂ پدری کے ماتحت، مگر یہ تسلیم کرنا مشکل کہ ایسے اہم افراد کے اختلاف کے

ساتھ یہ تجویز مصلحت اندیشی کا بہترین نمونہ بھی تھی۔

اہلِ اختلاف کے اختلاف کی بنیاد

یزید کی ولی عہدی سے جن حضرات نے نمایاں اختلاف کیا اور آخر تک اختلاف جاری رکھا، یعنی حضرت عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن زبیرؓ، عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ اور حضرت حسین بن علیؓ ان کے اختلاف کے سلسلے میں یہ بات بڑی طرح مشہور ہو گئی ہے کہ یزید ایک فاسق و فاجر انسان تھا اس لیے ان حضرات کو یہ بات قبول نہیں تھی کہ اُسے اسلامی خلافت جیسا مقدس اور محترم منصب دیا جائے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ جو حضرات حضرت معاویہ کی زندگی میں سرگرم اختلاف فرما رہے تھے ان کی زبان سے ہمیں کوئی لفظ ایسا نہیں ملتا جس سے اس شہرت عام کی تصدیق ہو سکتی ہو۔ ان حضرات کا صرف ایک اختلاف ریکارڈ پر ہے کہ یہ اسلام میں قیصریت و کسرویت کی بنیاد ڈالی جا رہی ہے کہ باپ مرے تو بیٹا حکومت سنبھال لے، خلفائے راشدینؓ کے انتخاب کے طرز سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ باب ۵ میں وہ گفتگوئیں طبری اور ابن اثیر وغیرہ کے حوالے سے گزر چکی ہیں جن میں ان اختلاف کرنے والے حضرات نے حضرت معاویہؓ اور ان کے نمائندوں مروان بن الحکم وغیرہ سے اپنے اختلاف کی بنیاد بیان کی ہے۔ ان گفتگوؤں اور بیانات میں اس بنائے اختلاف کے ماسوا کوئی دوسری بات نہیں۔ مگر جن لوگوں کے طفیل یہ بے بنیاد اور بے اصل بات پھیلی اور بالکل ایک تاریخی واقعہ بن گئی ہے کہ حضرت حسینؓ اور ابن زبیرؓ وغیرہ کے اختلاف کی بنیاد یہ تھی کہ یزید ایک زبردست فاسق و فاجر تھا، ان کی جرأتوں کا عالم تو یہ ہے کہ جو افسانے چاہیں تراشیں اور پروپیگنڈے کے زور سے حقیقت بنا دیں کیونکہ صحابہ کرامؓ کو مطعون کرنا ان کا دین و ایمان ہے اور اس کام کا بہت آسان راستہ حضرت معاویہؓ کی ذات میں پایا جاتا ہے کہ یزید کو ابتدائے عمر ہی سے فاسق و فاجر بتا کر یہ خیال مسلمانوں کے دلوں میں ڈالا جائے کہ ایسی نالائق اولاد کو اس شخص نے جسکو

صحابیٔ رسول کہلاتا ہے تخت خلافت پر بٹھایا اور اس وقت موجود کتنے ہی اصحاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں سے بھی دو چار کے سوا کسی کو توفیق نہ ہوئی کہ اس کی مخالفت کرے۔ جناب علی نقی صاحب لکھنوی کی کتاب "شہید انسانیت" کا ذکر پہلے باب میں آچکا ہے۔ ایک افسوسناک غلط بیانی کی مثال وہاں دی گئی تھی اسی طرح کی ایک دوسری مثال اس باب کی یہاں ملاحظہ فرمایئے۔ باب ۵ میں ابن اثیر کے حوالے سے یہ روایت گزری ہے کہ گورنر مدینہ مروان بن الحکم نے حضرت معاویہ کی ہدایت پر اہل مدینہ کے سامنے یزید کی ولی عہدی کی تجویز منظوری کے لیے رکھی جس کو حضرت عبدالرحمن بن ابی بکرؓ نے نہایت سختی سے رد کرتے ہوئے کہا کہ کیا یہ کسرویت و قیصریت کی بنیاد ڈالی جارہی ہے؟ اس تجویز میں ہرگز دین و ملت کا مفاد ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے۔ اس سے زیادہ حضرت عبدالرحمن کا کوئی تبصرہ نہیں تھا، یزید کے کسی فسق و فجور کا ذکر نہیں تھا۔ مگر جناب علی نقی صاحب نے اسی واقعہ کا حوالہ دیتے ہوئے حضرت عبدالرحمن کے منہ میں یہ الفاظ بھی ڈالے ہیں کہ:-

"ہم ہرگز اس شرابی اور زانی کی بیعت نہ کریں گے۔" ص ۱۵۶ ۔

بھلا کون سمجھے گا کہ قبلہ اپنی طرف سے ایک جھوٹ کا اضافہ کر رہے ہیں؟ مگر واقعہ یہی ہے کہ بالکل خالص جھوٹ ہے جس کا کوئی سر پیر نہیں۔ حضرت ابن ابی بکرؓ نے یہ الفاظ نہیں فرمائے۔ کچھ سنی سنائی باتوں پر ایسا خواہ مخواہ ایک گمان یہ تھا کہ قبلہ علی نقی صاحب ایک علمی شخصیت ہیں (اب بہ صیغہ ماضی ہے انتقال ہو چکا ہے) اس گمان میں مزید اضافہ لندن کے "مدرسہ سید خوئی" کے لائبریرین صاحب نے کیا جن کے پاس راقم السطور کچھ کتابوں کی تلاش میں پہنچا تھا۔ لائبریرین صاحب (جن کا میں ممنون ہوں کہ چند کتابیں انہوں نے مجھے چند ہفتے کے لیے مستعار دیں) انہوں نے مجھے کچھ زیادہ ہی اصرار سے یہ مشورہ بھی دیا کہ اس موضوع پر کچھ لکھنے سے پہلے میں مولانا سید علی نقی صاحب کی "شہید انسانیت" ضرور دیکھ لوں۔ یہ مشورہ چونکہ موصوف کے اس خوف و خطر کے پس منظر میں صادر ہوا تھا کہ پتہ نہیں یہ شخص (راقم)

کیا "ستم" ڈھانے کی تیاری کر رہا ہے۔ اس لیے مجھے قدرتی طور پر گمان ہوا کہ "شہید انسانیت" مصنفہ شیعی نقطۂ نظر کے سلسلے میں کوئی علمی وزن کی کتاب ہوگی۔ اس لیے بطور خاص اس کو باہر سے منگانے کا اہتمام کیا گیا۔ مگر اس کا جو حال نکلا وہ اس کتاب سے دی گئی ان مثالوں سے ظاہر ہے۔

بہرحال پروپیگنڈے کے فن سے کام لے کر یہ بالکل بے اصل بات ایک "دائمی حقیقت" بنا دی گئی ہے کہ حضرت حسین وغیرہ کو یزید کی ولی عہدی قبول کرنے سے انکار اس کے فسق و فجور کی وجہ سے تھا۔ حالانکہ تاریخ کے بیانات میں اس کا دور دور کہیں بھی پتہ نہیں ہے بلکہ جیسا کہ اپنے موقع پر آئے گا ولی عہدی کی بیعت کے چار سال بعد سنہ ۶۰ھ میں جب حضرت معاویہؓ کے انتقال پر یزید نے خلافت سنبھالی اور حضرت حسینؓ نے اس کے خلاف کھڑے ہونے کا فیصلہ فرمایا، تب بھی یزید کے ذاتی فسق و فجور کی بات آپ کی زبان پر کبھی نہیں آئی حتیٰ کہ کوفہ کا سفر اور شہادت، ساری منزلیں گزر گئیں۔ کہیں یہ بات "زانی ہے، شرابی ہے" آپ کی زبان پر نہیں آئی۔ بات صرف اتنی ہی تھی کہ باپ کی طرف سے بیٹے کی ولی عہدی ان حضرات کے نزدیک اسلامی اصولِ خلافت کی رو سے صحیح نہیں تھی یا مصلحت نہیں تھی۔ مزید برآں اگر کچھ کہا جا سکتا ہے تو وہ یہ ہے (جس کے واضح شواہد و قرائن موجود ہیں) کہ یہ سب حضرات وہ تھے جو در اصل حضرت معاویہ ہی کو اس منصب کا اہل نہیں سمجھتے تھے اور حالات کی پیدا کردہ ایک مجبوری کے طور پر انھیں گوارا کرتے رہے تھے[1] بلکہ صاف کہا جائے تو ان میں سے شاید ہر ایک اپنے آپ کو ان (حضرت معاویہؓ) کے مقابلے میں فیما بینہ و بین اللہ بہتر سمجھتا تھا۔ حد یہ ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ جن کے ورع و تقویٰ اور کسی بھی منافست سے

---

[1] یہ بات کہ یہ حضرات حضرت معاویہ کی داد و دہش سے استفادہ کرتے اور ان کے ماتحت جہاد کرتے رہے ہمارے اس بیان کے خلاف نہیں جانی چاہیے۔ جہاد تو امیر فاجر کے ماتحت بھی کیا جانا ہے چہ جائیکہ ایک صحابی امام۔ اور داد و دہش ان کی ذاتی نہ تھی مملکت کے مال اور جہاد کے غنائم سے تھی۔

دوری کی بنا پر یہ سمجھنا مشکل ہو سکتا ہے کہ وہ بھی اس معاملے میں بہتری اور برتری کا احساس رکھتے ہوں ان کے بارے میں بھی حوالہ ان کا اپنا بیان بخاری شریف کی اس روایت میں موجود ہے جس کا ذکر ابھی چند صفحات پہلے ایک حاشیہ میں العواصم من القواصم کے حوالے سے گزر چکا ہے اس روایت کے مطابق حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ نے حضرت علی اور حضرت معاویہ کے درمیان "تحکیم" کے موقع پر حکمین کے اجلاس میں اپنے جانے کا قصہ بیان کرتے فرمایا۔

فلما تفرق الناس خطب معاوية[1]	اور جب لوگ منتشر ہو گئے (یعنی تحکیم
قال من كان يريد أن يتكلم في	کا قصہ ختم ہو گیا اور خاص طور سے حضرت
هذا الأمر فليطلع لنا قرنه	علیؓ کے لوگ چلے گئے) تو ایک وقت میں
فلنحن أحق به منه ومن أبيه	معاویہؓ نے (باقی) لوگوں سے خطاب کیا
قال حبيب بن مسلمة فهلا أجبته	اور کہا کہ اگر کسی کو اس معاملہ (خلافت) میں
قال عبد الله فحللت حبوتي	دعویٰ ہو تو اپنا دعویٰ سامنے لائے ہم
وهممت أن أقول أحق بهذا	اس دعویدار سے اور اس کے باپ سے زیادہ
الأمر منك من قاتلك وأباك	حق دار نکلیں گے۔ ابن عمرؓ کا بیان ہے یہ سن کر
على الإسلام فخشيت أن أقول	معاویہ کے ایک طرفدار حبیبؓ بن مسلمہ
كلمة تفرق بين الجمع وتسفك	بولے "تم نے کچھ جواب نہ دیا؟" میں نے
الدم ويحمل عني غير ذلك	کہا کہ ہاں میں نے اپنی نشست بدلی
فذكرت ما أعد الله في	تھی اور چاہا تھا کہوں کہ "تم سے زیادہ حقدار
الجنان۔[2]	وہ ہے جو تم سے اور تمہارے باپ سے اسلام کیلئے
	جنگ کی ہے لیکن مجھے فوراً خیال ہو گیا

---

[1] مصنف عبدالرزاق میں ہے "تفرق الحکمان" اور یہی تعبیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے چنانچہ حافظ ابن حجرؒ نے بھی بیان مفہوم میں مصنف کے الفاظ کا سہارا لیا ہے۔

[2] کتاب المغازی باب غزوۃ الخندق۔

اس وقت کی باجماعت میں تفرقہ ڈال سکتی ہے[1]
خونریزی کی آگ بھڑکا سکتی ہے اور خود میرے
بارے میں غلط فہمی پھیلا سکتی ہے اور اسکے
بعد میں نے اللہ کے وہ انعام و اکرام یاد کیے
جن کا صابر لوگوں کو جنت میں دیے جانے کا وعدہ ہے

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے جو جواب دینا چاہا تھا مگر پھر روک لیا اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ جن لوگوں کو بھی اسلام میں سابقیت اور اس کے لیے قربانیوں کا فخر حاصل ہے وہ منصب خلافت کے زیادہ حقدار ہیں جن میں خود حضرت عبداللہ بن عمرؓ بھی داخل ہوتے تھے۔ لیکن اسی واقعہ کی ایک دوسری روایت بحوالہ الطبرانی کے بارے میں حافظ ابن حجر شارح بخاری بتلاتے ہیں کہ اس میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے یہ الفاظ بھی پائے جاتے ہیں کہ۔

فما حدثت نفسی بالدنیا	یہ پہلا دن تھا کہ میرے دل میں دنیا کی بات
قبل یومئذ (فتح الباری ج ۷ بحدیث ۴۱۰۸)	آئی (یعنی حکومت کے حق کا دعویٰ پیدا ہوا)

ان الفاظ کی رو سے حضرت معاویہؓ کے مقابلے میں حضرت ابن عمرؓ کے دل میں آنے والی یہ بات (اس وقت) تنہا ان کی اپنی ہی ذات سے متعلق ہو جاتی ہے۔

ان کے علاوہ حضرت حسینؓ جیسے خیالات حضرت معاویہؓ کے بارے میں رکھتے تھے وہ تو کوئی ڈھکی چھپی بات ہی نہیں ہے۔ باب دوم میں ان کا ایک خط خود حضرت معاویہؓ ہی کے نام گزر چکا ہے جو صاف الفاظ میں بتاتا ہے کہ وہ ان کی حکومت کو کیا سمجھتے تھے۔

بہرحال یہ بات کوئی راز نہیں ہے کہ ان حضرات نے اگرچہ حضرت معاویہ سے بیعت کر لی تھی، مگر ایک مجبوری کے درجے میں کی تھی، پوری طرح اہل سمجھ کر نہیں کی تھی۔ اور بنیادی وجہ

---

[1] یہ بڑا اہم جملہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تحکیم کا معاملہ کسی ایسی صورت پر ختم ہوا تھا جس سے جماعت کے بحال ہونے کی امید ہو گئی تھی۔ مگر افسوس کہ اس کی کوئی تفصیل کہیں نہیں ملتی۔

[2] صحیح بخاری کتاب المغازی باب غزوۃ الخندق۔

وہی تھی جس کا اظہار حضرت ابن عمرؓ کے مذکورہ بالا بیان سے ہوتا ہے کہ وہ سابقین اور سابقین اولین کے ہوتے ہوئے متاخرین کے لیے خلافت اسلامی کا حق نہیں مانتے تھے الا یہ کہ دوسرے مصالح کی وجہ سے ان کو مجبوراً قبول کر لیا جائے۔ پس کیا گنجائش تھی کہ وہ یزید کو اپنی اور اپنے جیسوں کی موجودگی میں خلیفۂ اسلام ماننے کے لیے تیار ہو جاتے؟ لہٰذا علاوہ ان حضرات کے اس صریح موقف کے کہ باپ کی طرف سے بیٹے کی نامزدگی (اور گویا خلافت بطور وراثت) ایک غیر اسلامی طریقہ ہے۔ یہ بات بھی تقریباً یقینی ہے کہ وہ یزید کو اس بنا پر بھی منصب خلافت کیلئے ناقابل قبول سمجھتے تھے کہ وہ اپنے والد معاویہؓ سے بھی قطعی طور پر مفضول تر تھے۔ لیکن یہ بات قطعی جھوٹ اور افترا ہے کہ یزید کے بارے میں کسی فسق و فجور کا مسئلہ بھی اٹھایا جاتا تھا۔ یہ مسئلہ اگر اٹھا ہے تو حضرت حسینؓ کی شہادت کے تین سال بعد کچھ اہل مدینہ کی طرف سے اٹھا ہے اور اسے رد کرنے والے بھی اسی مدینے میں تھے حضرت حسنؓ و حسینؓ کے بھائی حضرت محمد بن حنفیہ بن حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ ایسے حضرات بھی تھے جن کے رد کا وزن نظر انداز نہیں کیا جا سکتا

یزید اپنے ایک خطبے کے آئینے میں

حضرت معاویہؓ کی وفات کے وقت تک یزید کے مزاج و کردار کا ایک اچھا آئینہ ہمارے خیال میں اُن کا وہ مختصر سا خطبہ ہے جو اہل تاریخ کے بیان کے مطابق انھوں نے اپنے والد حضرت معاویہؓ کی وفات کے بعد دیا تھا۔ اس خطبے کے آئینے میں ان کی شخصیت ایک سنجیدہ باوقار اور ذی علم انسان کی نظر آتی ہے نہ کہ شراب و کباب، رقص و سرود اور لہو و لعب کے ایک رسیا کی۔

ابن کثیر لکھتے ہیں کہ معاویہ کا انتقال ہوا تو یزید حوارین[1] میں تھے۔ ضحاک بن قیس کوتوال شہر نے اطلاع کرائی تب وہ آئے۔ ضحاکؓ نے شہر سے باہر اُن کا استقبال کیا۔ یزید نے باب سے اندرون شہر میں جانے کے بجائے قبرستان کا رُخ کیا۔ والد کی قبر پر نماز جنازہ ادا کی [illegible]

---

[1] یہ مقام شام کے علاقہ حلب میں ہے۔

سے فارغ ہو کر شہر میں آئے حکم دیا کہ "الصلوٰۃ جامعۃ" کی ندا کرائی جائے۔ پھر اپنی اقامت گاہ خضراء میں داخل ہو کر غسل کیا، لباس بدلا۔

ثم خرج فخطب الناس اول خطبة	پھر باہر آئے اور بحیثیت امیر المومنین
وهو امير المومنين فقال بعد	لوگوں سے پہلا خطاب کرتے ہوئے حمد و ثنا کے
حمد الله والثناء عليه ايها	بعد کہا کہ لوگو! معاویہ اللہ کے بندوں میں سے
الناس! ان معاوية كان عبدًا	ایک بندے تھے اللہ نے ان کو نعمتوں سے
من عبيد الله انعم الله عليه	نوازا اور پھر اپنے حضور میں بلا لیا وہ اپنے بعد
ثم قبضه اليه وهو خير ممن	والوں سے بہتر اور پیشروؤں سے کمتر تھے۔
بعده ودون من قبله ولا ازكيه	لیکن میں اللہ کے سامنے ان کا تزکیہ کرنے
على الله عز وجل فانه اعلم	یا ان کی سند دینے کیلئے نہیں کہہ رہا اس لیے
به، ان عفى عنه فبرحمته وان	کہ وہ ان کو زیادہ بہتر جانتا ہے اگر ان سے
عاقبه فبذنبه وقد وليت الامر	درگزر فرمائے تو یہ اس کی رحمت ہوگا اور اگر
من بعده ...... ؎	گرفت فرمائے تو یہ ان کے گناہوں کی وجہ سے
	ہوگا۔ اور آپ جانتے ہیں کہ ان کے بعد
	خلافت کی ذمہ داری مجھ پر ڈالی گئی ہے الخ ؎

ہمارا خیال ہے کہ اس خطبے کی عبارت، اس کا مضمون اور اس کا لہجہ ہر چیز اس شخص (یزید) کے بارے میں اس عام خیال کی تردید کرتی ہے جو کسی واقعی بنیاد کے بغیر صرف اس لیے پھیلنے میں کامیاب ہو گیا ہے کہ اس شخص کی حکومت کے زمانے میں اسی کے حکام اور لشکریوں کے ہاتھوں ریحانۂ رسولؐ جگر گوشۂ بتولؓ حضرت حسینؓ کی شہادت کا المناک واقعہ پیش آیا۔ اور اس نے اپنے حکام سے اس پر باز پرس نہ کی۔ اس لیے ایسے آدمی سے متعلق جو بھی برائی کسی نے سنا دی وہ

؎ البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۴۳

قابل یقین ہو گئی۔ مگر یہ ہے واقعی اسلامی انصاف کے خلاف بات کہ کسی کے ایک جرم کی سزا میں اس جرم سے پہلے کی اس کی زندگی کو بھی خواہ مخواہ بدنام کیا جائے۔ ہاں جن لوگوں کے نزدیک جھوٹ سچ ہر طریقے سے صحابۂ کرامؓ کو بدنام کرنا ایک کارِ ثواب ہے ان کے لیے بالکل ٹھیک ہے کہ وہ پروپیگنڈے کا یہ تیر بھی جو بہت موقع کا ہے صحابۂ کرامؓ ہی کو نشانہ بنانے کی نیت سے چلائیں۔

یزید کا معاملہ اتنا نازک ہے کہ ان کے حق میں بالکل سیدھی اور معقول بات کہتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے، اس لیے یہ بات اچھی طرح سمجھ لی جائے کہ مذکورہ بالا خطبے سے ہم صرف یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ وہ بندروں، ریچھوں کے ساتھ کھیلنے والا، شراب و کباب میں غرق، لہو و لعب میں مست اور زنا و قمار کا رسیا انسان نہیں نظر آتا جیسا کہ بتایا جاتا ہے کیونکہ اس قماش کے لوگ ایسی مواعظ و دانشورانہ اور دین و دنیا کی نزاکتوں پر حاوی زبان نہیں بولا کرتے۔ رہا یہ کہ وہ کوئی بڑا متقی و پرہیزگار ہو، یہ اس خطبے سے نہیں نکالا جا سکتا۔ ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی ہو سکتا۔ اور بظاہر ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ جس نسل اور جس طبقے سے تعلق رکھتا تھا اس کے بارے میں قرنِ اول کی نسل اور صحابۂ کرامؓ کے طبقے والے اتقا و پرہیزگاری کی توقع تو بہرحال مشکل ہی سے کی جا سکتی ہے۔

ابن کثیر نے لکھا ہے کہ:-

وقد كان يزيد فيه خصال محمودة	یزید میں بعض بڑی عمدہ خصلتیں تھیں مثلاً
من الكرم والحلم والفصاحة و	حلم و کرم، شعر و فصاحت، شجاعت اور
الشعر والشجاعة وحسن الرأي	امور سلطنت میں حسن رائے۔ اسی کے ساتھ
في الملك وكان فيه أيضاً إقبال على	اس میں خواہشات نفس کی طرف ایک گونہ
الشهوات وترك بعض الصلوات	میلان اور بعض اوقات ترک صلوٰۃ کا عیب
في بعض الأوقات وإماتتها	بھی تھا اور نمازوں کے بارے میں

وغالب الاوقات[1]   بے اہتمامی تو اس سے کبھار صادر ہوتی تھی۔

اس عبارت میں آخری دو باتیں (یعنی کبھی کبھی ترک نماز اور اکثر نمازوں کے سلسلے میں بے اہتمامی) کے سوا اور جو کمزوریاں بیان کی گئی ہیں وہ ہمارے نزدیک بالکل بعید نہیں۔ فلسفۂ تاریخ کے مطابق ان کمزوریوں کا دور شروع ہو چکا تھا۔ اور ایسی روایتیں ملتی ہیں جو ذمہ دارانہ جرح و تنقید کے عمل سے گزرنے کے بعد اس طرح کی کمزوری کا یزید کے بارے میں گمان قابل قبول بنا دیتی ہیں۔ البتہ آخری دونوں باتیں ایسی ہیں جن کے بارے میں ثبوت کی ضرورت ہے۔ جو ابن کثیر نے فراہم نہیں کیا۔ علاوہ ازیں یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ دو اتنے سنگین عیب یزید میں پائے جاتے اور اس کی ولی عہدی سے شدید اختلاف کرنے والے حضرات ان کی طرف اشارہ نہ کرتے جبکہ یہ چھپے رہنے والے عیب نہیں تھے۔ اور نہ ہی حقیقت میں یہ ہو سکتا تھا کہ حضرت معاویہ ایسے فرزند کو جو ترک نماز اور اماتت صلوٰۃ کا عادی ہو اس امت پر خلیفہ بنا کر مسلط کریں جس کی سب سے بڑی پہچان "اقامت صلوٰۃ" ہے۔ بہر حال وہ بڑا متقی نہ سہی لیکن ان عیبوں کی نسبت اس کی طرف بڑی زیادتی ہے جو مشہور کر دیئے گئے ہیں اور خاص کر یہ تو بالکل ہی بے بنیاد بات ہے کہ اختلاف کرنے والے حضرات اس کے کچھ عیبوں کو بھی اختلاف کی وجہ بتلاتے تھے۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی خدمت میں سوال بھیجا گیا کہ "حضرت معاویہؓ نے اپنے روبرو یزید پلید کو ولی عہد کیا ہے یا نہیں؟ — آپ نے جواب تحریر فرمایا:

"حضرت معاویہؓ نے یزید کو خلیفہ کیا تھا اس وقت یزید اچھی صلاحیت میں تھا۔"

(فتاوی رشیدیہ۔ ایچ۔ ایم سعید کمپنی کراچی ص ۲۸۰)

ایک اور سوال اسی مضمون کا آیا جس پر جواب تحریر فرمایا گیا:

"یزید اول صالح تھا بعد خلافت کے خراب ہوا۔" (فتاوی ص ۲۸۱)

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۲۳۰۔

ضمیمہ

متعلقہ ص ۱۳۵

ایک اہم فائدہ

ہم نے تو یہ روایت صرف یہ دکھانے کے لیے نقل کی ہے کہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان کشمکش کی صورت ختم کرنے کے لیے حکمین نے جب یہ طے کیا کہ خلافت کے لیے کسی اور آدمی کا انتخاب کر لیا جائے تو اس کے لیے سب سے پہلا نام حضرت عبداللہ بن عمرؓ ہی کا لیا گیا۔ لیکن یہ روایت اس لحاظ سے بھی بہت اہم ہے کہ "تحکیم" کے سلسلے میں واقعہ کی شکل اب تک یہ بتائی جاتی رہی ہے کہ حکمین (حضرت ابو موسیٰؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ) کے درمیان یہ بات طے ہوئی تھی کہ نہ علی کی خلافت نہ معاویہؓ کی۔ بلکہ مسلمان کسی تیسرے آدمی کا انتخاب کر لیں، چنانچہ ان دونوں نے اپنی تنہائی کی اس قرارداد کے مطابق یہ طے کیا کہ مجمع کے سامنے آکر علیؓ اور معاویہؓ کی معزولی کا اعلان کر دیا جائے اور یہ اعلان پہلے ابو موسیٰؓ نے کیا اس کے بعد حضرت عمرو بن العاصؓ کھڑے ہوئے تو انہوں نے کہا کہ علی کی حد تک میں بھی ابو موسیٰ کے اعلان سے متفق ہوں لیکن معاویہ کو معزول نہیں کرتا ہوں جس پر دونوں میں بڑی تلخ کلامی ہوئی اور جھگڑا بپا رہ گیا۔ یہ روایت بھی طبری ہی میں ہے (ج ٦ ص ۳۰۔۔۳۹) لیکن جو روایت اوپر نقل کی گئی اس کی رو سے واقعہ کی شکل بالکل مختلف ہو جاتی ہے اور وہ اس لحاظ سے زیادہ قابل قبول بھی ہے کہ اول تو اس میں حضرت معاویہ کو "معزول کرنے" کی بے تکی بات نہیں پائی جاتی۔ حضرت معاویہؓ کو خلافت کا دعویٰ نہیں تھا کہ ان کو "معزول" کیا جاتا۔ خلافت کا دعویٰ حضرت علیؓ کو تھا، حضرت معاویہؓ کو ان کی خلافت اس وقت تک تسلیم کرنے سے انکار تھا۔ جب تک کہ وہ خون عثمانؓ کا قصاص نہ دلوا دیں۔ اس لیے معزولی صرف حضرت علیؓ کی

ہو سکتی تھی نہ کہ حضرت معاویہؓ کی۔ دوسرے، واقعہ کی یہ شکل، جو طبری ج ۶ ص ۳۲ والی روایت کی رو سے سامنے آتی ہے، اس میں اسلامی تاریخ کے ایک ہیرو اور صحابیٔ رسول ﷺ (حضرت عمرو بن العاصؓ) کے دامن پر دھوکہ دہی کا وہ دھبہ بھی نہیں آتا جو نہایت شرمناک اور کسی طرح بھی آسانی سے قابل قبول نہیں کہ ایک بات تنہائی کی مجلس میں طے کی اور مجمع عام میں اس کے خلاف کیا۔

یہاں جو واقعہ کی شکل بیان ہوئی ہے اس کی رو سے حضرت ابو موسیٰؓ نے خلافت کے لیے متبادل نام کے طور پر حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا نام پیش کیا۔ اس کے آگے کا حصہ روایت میں یوں ہے کہ **قال عمرو انی اسمی لك معٰوية بن ابی سفيٰن۔** عمرو بن العاصؓ نے (ابو موسیٰ کا پیش کردہ نام نہ قبول کرتے ہوئے) کہا کہ میں معاویہ بن ابی سفیانؓ کا نام تجویز کرتا ہوں۔ اور اس کے بعد جیسا کہ واقعہ کی دوسری روایت میں، جو کہ مشہور ہے، آتا ہے، دونوں حضرات میں تلخ کلامی ہوئی اور حضرت ابو موسیٰ اپنی مغلوبیت کے احساس سے بوجھل ہو کر بجائے حضرت علیؓ کے پاس جانے کے مکے واپس چلے گئے۔

اس روایت کی رو سے حضرت عمرو بن العاصؓ نے کوئی ایسی بات نہیں کی جس کی بنا پر انہیں بدعہدی اور دھوکہ بازی کا وہ الزام دیا جا سکے جو مشہور روایت کی بنا پر عائد ہوتا ہے، انہوں نے حضرت ابو موسیٰ سے کہا تھا کہ آپ نام پیش کریں اگر میرے لیے قابل قبول ہوا تو لازماً قبول کر لوں گا ورنہ میرا دیا ہوا نام آپ قبول کریں گے۔ اس قرارداد کے بعد حضرت عمرو پر ذمہ داری نہیں آتی تھی کہ وہ حضرت ابو موسیٰؓ کا دیا ہوا نام قبول ہی کر لیں۔ البتہ حضرت ابو موسیٰؓ کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ روایت کے ظاہری الفاظ کے لحاظ سے ان پر ذمہ داری آتی تھی کہ حضرت عمروؓ کا دیا نام قبول کر لیں گے کیونکہ انہوں نے حضرت عمرو بن العاصؓ سے پلٹ کر یہ نہیں کہا کہ میں بھی تمہارے دیئے ہوئے نام کو قبول کرنے کا پابند نہیں بلکہ ان کی یہ بات سن کر کہ ”ورنہ پھر میں جو نام دوں گا آپ اسے قبول کریں گے“ فوراً ایک نام پیش کر دیا۔ البتہ الفاظ کے اس ظاہری مطلب کے برخلاف ہم حضرت ابو موسیٰ کی صفائی میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ ”تحکیم“ کے خاص ماحول میں انہیں یہ گمان نہیں تھا کہ عمرو بن العاص ”معاویہ بن ابی سفیان“ کا نام بھی پیش کر سکتے ہیں۔ ان کے خیال میں شاید یہ مناسب نہیں تھا.......... اس لئے انہوں نے باوجود قول دینے کے اپنے آپ کو اس نام کے قبول کرنے کا پابند نہیں جانا۔ مگر صحیح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ عبارت کا بالکل لفظی مطلب نہ لیا جائے اور سمجھا جائے کہ حضرت

ابو موسیٰ بھی حضرت عمروؓ کی طرح آزاد تھے کہ حضرت عمروؓ کی تجویز مانیں یا نہ مانیں۔ رہا یہ خیال، جیسا کہ شاید حضرت ابو موسیٰ کا تھا کہ عمرو بن العاص نے ایک ایسی بات کی جس کی قول و قرار کے الفاظ کی رو سے اگرچہ پوری گنجائش تھی مگر معاملات کے جس خاص ماحول میں حکمین کو اپنی ذمہ داری ادا کرنی تھی اس ماحول کے اعتبار سے یہ بات مناسب نہ تھی تو یہ ایک نقطۂ نظر ہو سکتا ہے، جبکہ دوسرا نقطۂ نظر یہ ہو سکتا ہے اور بظاہر وہی حضرت عمرو ابن العاص کا تھا کہ عملی اعتبار سے امت کے مفاد میں اس وقت اس سے بہتر کوئی دوسری شکل دستیاب نہ تھی کہ خلافت ــــ یا کہیے اسلامی اجتماعیت کی ذمہ داری ــــ معاویہ بن ابی سفیان کے ہاتھ میں دے دی جائے۔ نظریت کی ترازو میں یہ بات سخت ناروا نظر آنے والی ہے کہ حضرت علی مرتضیٰ کی موجودگی میں معاویہ بن ابی سفیان کو امت کی باگ ڈور سونپ دینے میں امت کی بھلائی سمجھی جائے۔ مگر جب ان حقائق پر نظر ڈالی جائے جو حضرت عمرو بن العاص کے سامنے پھیلے ہوئے تھے کہ مثلاً علی مرتضیٰؓ کو اپنی خلافت میں اتنا اختیار بھی حاصل نہیں تھا کہ وہ اپنی طرف سے حکم بھی اپنی مرضی کے مطابق مقرر کر سکیں۔ ابو موسیٰ اشعری کے تقرر کے حق میں وہ ایک منٹ کے لیے نہیں تھے۔ ہر ممکن کوشش کی کہ ایسا نہ ہو ان کے بجائے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو مقرر کیا جائے۔ کیونکہ ابو موسیٰ اس ڈپلومیٹک کام کے لیے، اول تو موزوں نہیں تھے، دوسرے حضرت علیؓ کے کیمپ میں ہوتے ہوئے وہ حضرت علی کی جنگ پالیسی کے قطعی خلاف تھے اور لوگوں کو جنگ میں شرکت سے روکتے تھے۔ جس کا ذکر اس مضمون کے شروع میں بھی آ چکا ہے۔ مگر بغاوت پر آمادہ سبائیوں نے مجبور کیا کہ ابو موسیٰ ہی جائیں گے۔ اور وہ مجبور ہو گئے۔

حضرت علیؓ کی طرف سے حضرت ابو موسیٰ کے تقرر پر اس سے بہتر تبصرہ نہیں ہو سکتا جو ابن اثیر کے محقق حاشیہ نگار نے کیا ہے کہ ”علیؓ اگر اپنے معاملہ کی نمائندگی کو معاویہ کے ہاتھ میں دے دیتے تو انہیں اتنا نقصان شاید نہ پہنچتا جتنا ابو موسیٰ کے ہاتھ میں معاملہ جانے سے پہنچا۔“ (ج ۳ ص ۱۶۹) بہر حال حضرت علیؓ اپنی ان تمام عظمتوں کے باوجود جن کے آگے سر نیاز جھکے بغیر نہیں رہ سکتا اپنے دائرۂ اختیار میں ...... روز بروز زیادہ بے اختیار اور عاجز و درماندہ ہوتے جا رہے تھے۔ ان کے ساتھی ان کی کوئی بات چلنے نہیں دیتے تھے حتی کہ وہ تحکیم میں اپنی مرضی کا نمائندہ تک نہیں رکھ سکے تھے۔ اس کے برعکس معاویہ بن ابی سفیان نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ نہ صرف اپنی ذات سے معاملات پر پورا قابو رکھتے ہیں بلکہ انہیں جو قوم اور اعوان و انصار ملے ہیں وہ سب اس معاملہ میں ان کی دل و جان سے مدد کرتے ہیں۔ اسکی

حالت میں حضرت عمرو بن العاصؓ کو یہ بات سوچنے کا پورا حق تھا کہ کم سے کم فلاح و بہبود جو خون میں نہائی ہوئی اور عافیت کے لیے سرگرداں، اس امت کے لیے حاصل کی جا سکتی ہے وہ اب صرف اس صورت میں حاصل کی جا سکتی ہے کہ معاملات کی باگ ڈور پوری طرح معاویہ کے ہاتھ میں دے دی جائے۔ جو واحد آدمی ہے کہ حالات کو قابو میں کر سکے …… جیسا کہ ثابت بھی ہوا۔ دوسرا نام حضرت عبداللہ بن عمر کا سامنے آیا تھا۔ ہر واقف کار جانتا ہے کہ اپنی تمام بزرگیوں کے باوجود وہ اس میدان کے سرے سے آدمی ہی نہ تھے۔ اس وقت تو ایک زبردست انتظامی اور قائدانہ صلاحیت رکھنے والے آدمی کی ضرورت تھی، نہ کہ صرف نیک نفس کی۔ یعنی ٹھیک وہی بات۔ جس کا فیصلہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے آخری دور میں کیا (اور اوپر باب سوم میں اس کا ذکر آ چکا ہے) کہ اجتماعی ذمہ داری اور نظم و نسق کے لیے ایک کم معیاری مگر مضبوط (اور بقول حضرت عمرو بن العاصؓ ڈاڑھ دانت والے) مسلمان کو ترجیح دی جانی چاہیے، اعلیٰ درجہ کے مگر کمزور اور کم موزوں مسلمان کو نہیں۔

طبری کی اس روایت میں جو تحکیم کے قصے میں عام طور پر مشہور ہے اور اس روایت میں جو ہم نے اوپر (طبری جلد ۶ ص ۲۹) سے نقل کی ہے، سند کے وزن کے اعتبار سے بھی بڑا فرق ہے۔ مشہور روایت کی سند ایک منقطع اور نامکمل سند ہے اور جو کل دو راوی "ابو مخنف اور ابو جناب الکلبی" امام ابن جریر طبری نے اپنے سے اوپر ذکر کیے ہیں۔ ان دونوں میں ناقدین فن کو کلام ہے (ملاحظہ ہو لسان المیزان ج ۳ ص ۴۹۲ طبع بیروت اور تقریب التہذیب ج ۲ ص ۳۴۶) اس کے برعکس جو روایت ہم نے اوپر طبری ج ۶ ص ۳۲ کے حوالے سے نیز مصنف عبدالرزاق کے حوالے سے درج کی ہے اس کی سند نہایت صاف اور مکمل ہے۔

حدثني عبد الله بن احمد (ابن حنبل) قال حدثني ابي قال حدثني سليمان بن يونس بن يزيد عن الزهري.

ایسی روایت کے مقابلے میں ایک غلط قسم کی روایت مشہور ہو جانے کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ مشہور روایت "اجتماع حکمین" کے عنوان کے ماتحت آئی ہے اور غیر مشہور روایت "رفع مصاحف" کے زیر عنوان درج ہوئی ہے۔ یعنی بے محل ہے۔ واللہ اعلم۔

☆☆☆

بابِ ہفتم

حضرت امیر معاویہؓ کی وفات۔ عہد یزید کا آغاز

حضرت حسینؓ کی ہجرت

سنہ ۵۶ھ میں یزید کی ولی عہدی کے مسئلے سے فارغ ہونے کے بعد حضرت معاویہؓ چار سال زندہ رہے۔ رجب سنہ ۶۰ھ میں آپؓ نے اس سال میں وفات پائی لیکن جن حضرات نے سنہ ۵۶ھ میں یزید کی ولی عہدی قبول کرنے سے انکار کیا تھا ان میں سے جو زندہ تھے وہ اپنے اسی انکار پر قائم تھے۔

یزید کو معاویہؓ کی وصیت

بیان کیا گیا ہے کہ آپ نے موت کے وقت اس سلسلے میں کچھ وصیت بھی یزید کو کی تھی اس وصیت کی روایتیں مختلف ہیں علاوہ وصیت کی باتوں کے اختلاف سے پہلے اس معاملے میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے کہ یہ وصیت بالمشافہ تھی۔ یعنی یزید اس وقت آپ کے پاس موجود تھے یا اس وقت وہ موجود نہ تھے بلکہ وصیت لکھ کر ان کے لیے چھوڑی گئی۔ ابن اثیر نے صراحت کے ساتھ عدم موجودگی کی روایت کو ترجیح دی ہے[1] اور ابن کثیر کا بھی رجحان یہی معلوم

---

[1] الکامل ج ۳ ص ۲۶۰

ہوتا ہے، اگرچہ صریح الفاظ میں یہ بات انھوں نے نہیں کہی ہے۔ موقع کی تفصیلات پر نظر کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہی فیصلہ اور رجحان صحیح ہے۔ وصیت کی روایتوں میں جو اختلاف پایا جاتا ہے اس میں کچھ اختلاف ایسا بھی ہے جو جھوٹ اور سچ کی نوعیت کا حامل ہے۔ غالباً سب سے پہلی روایت جو یزید کو موجود اور بالمشافہ مخاطب بتاتی ہے اس کے مطابق حضرت معاویہؓ نے کہا کہ :-

> "بیٹے میں نے تمھاری طرف سے پوری دوڑ بھاگ کر لی ہے۔ ہر چیز ہموار کر دی ہے، دشمنوں کو زیر کر دیا ہے، کل عرب کی گردنیں تیرے لیے جھکا دی ہیں۔ اور اب سوائے قریش کے چار آدمیوں کے مجھے کسی کی طرف سے اندیشہ نہیں ہے کہ امر خلافت میں تجھ سے نزاع کرے۔ یہ چار ہیں حسین بن علی، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن زبیر، عبدالرحمٰن بن ابی بکر ـــــ پس عبداللہ بن عمر کی بات تو یہ ہے کہ کثرت عبادت نے اب انھیں کسی کام کا نہیں رکھا ہے جب یہ دیکھیں گے کہ اور سب نے بیعت کر لی تو وہ بھی کر لیں گے۔ رہے حسین بن علی تو عراق والے انھیں تیرے مقابلے پر نکالے بغیر چھوڑیں گے نہیں۔ اگر ایسا ہی ہو اور وہ خروج کر بیٹھیں اور تم ان پر قابو پاؤ تو درگذر کرنا اس لیے کہ بہت قریبی رشتہ ہے اور بڑا حق ہے۔ تیسرے ابن ابی بکر ہیں وہ بس اپنے ساتھیوں کے نقش قدم پر چلیں گے۔ ان کی حوصلہ مندیوں کا میدان تو بس عورتیں اور ایسی ہی دوسری لذتیں ہیں۔ ہاں وہ شخص جو تجھ پر شیر کی طرح گھات لگائے گا اور لومڑی والی داؤ چالیں چلے گا کہ ذرا اگر موقع دے تو وہ تجھ پر جست لگائے وہ عبداللہ بن زبیر ہے۔ اگر وہ ایسا کرے اور تجھے اس پر قابو مل جائے تو ٹکڑے ہی کر ڈالنا۔[1]"

اس وصیت میں جھوٹ کی آمیزش کا کھلا نشان حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ کا تذکرہ

---

[1] طبری ج ۶ صفحہ ۱۷۹-۱۸۰۔

ہے، ان کے بارے میں بہت تفصیل سے بحث گزر چکی ہے جس کی رو سے ان کی زیادہ سے زیادہ زندگی سنہ ۵۸ھ تک مانی جا سکتی ہے۔ حضرت معاویہ سنہ ۶۰ھ میں ان کی بابت کوئی وصیت کریں یہ صرف ایک جھوٹ اور جعل ہو سکتا ہے، اس کے سوا کچھ نہیں۔ اور یہ بعد کے زمانے کے کسی ایسے آدمی کی جعل سازی ہے جو اس تاریخی حقیقت سے بے خبر تھا نیز اس حقیقت سے بھی بے خبر تھا کہ حضرت معاویہ کی وفات کے وقت یزید کی موجودگی ثابت کرنا مشکل ہے۔ اسکے مقابلے میں طبری ہی نے اگلی سطروں میں جو وصیت نامہ درج کیا ہے جو یزید کی غیر موجودگی میں دو اہم اشخاص کے سپرد کیا گیا تھا کہ یزید کو دیا جائے اور جو عبدالرحمٰن بن ابی بکر کے بے محل اور بے حقیقت تذکرے سے بھی پاک ہے اس کا مزاج مذکورہ بالا وصیت سے بہت مختلف اور حضرت معاویہ کے دور اندیشانہ، فراخدلانہ، مصلحانہ اور رعایا پرورانہ مزاج سے پوری طرح جوڑ کھاتا ہے۔ اس لیے اس کے بارے میں یقین کیا جا سکتا ہے کہ وہ فی الواقع حضرت معاویہ ہی کا ہوگا۔ اس وصیت نامہ کی روایت کے مطابق :-

> • جب معاویہ کا وقت سنہ ۶۰ھ میں پورا ہوا اور یزید اس وقت موجود نہ تھے تو انھوں نے ضحاک بن قیس فہری کو جو ان کے پولیس افسر تھے اور مسلم بن عقبہ المری کو بلایا اور ان سے کہا کہ میری وصیت یزید کو پہنچا دینا کہ اہل حجاز کا خیال رکھو جو تمھاری اصل ہیں۔ ان میں سے جو کوئی تمھارے پاس آوے اس کا اکرام کرو اور جو نہیں آتا ہو اس کی خبر رکھو اور عراق والوں کا بھی خیال رہے کہ وہ اگر تم سے روز ایک عامل (حاکم) معزول کرنے کا مطالبہ کریں تو ان کا مطالبہ پورا کر دو، اس لیے کہ ایک عامل کی معزولی اس سے کہیں بہتر ہے کہ ایک لاکھ تلواریں تمھارے خلاف حرکت میں آویں۔ اور اہل شام کا بھی خیال رہے کہ انھیں کو تمھارے رازداروں کا مرتبہ ملنا چاہیے۔ کبھی دشمن کی طرف سے کوئی چیلنج آئے تو ان کی مدد حاصل کرو۔ اور جب مہم تمام ہو جائے تو انھیں ان کے ملک کو واپس کر دو۔ اگر وہ غیر ملک میں زیادہ ٹھہرے تو وہاں کی

مصلحتیں اختیار کرلیں گے اور (آخری بات یہ ہے کہ) مجھے قریش میں بس تین آدمیوں کی طرف سے تمہاری مزاحمت کا اندیشہ ہے۔ حسین بن علی، عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن زبیر ——— عبداللہ بن عمر کا جہاں تک سوال ہے تو دین کی شدت نے انھیں بالکل توڑ ڈالا ہے وہ اپنی ذات سے تمہارے مقابل کسی شئی کے طالب نہ ہوں گے۔ رہے حسین بن علی تو وہ ذرا ہلکے آدمی ہیں اور میرا خیال ہے کہ جن لوگوں نے ان کے باپ کو قتل کیا اور ان کے بھائی کو بے سہارا چھوڑا انھیں کے ذریعہ اللہ تمہاری طرف سے بھی ان کو کافی ہو جائے گا۔ اور یہ یاد رکھنا کہ ان کا بہت قریبی رشتہ ہے، بہت بڑا حق ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اہل عراق انھیں میدان میں لائے بغیر چھوڑ دیں گے۔ اگر ایسا ہوا اور تم ان پر قدرت پاؤ تو درگذر کرنا کیونکہ اگر میرے اور ان کے درمیان ایسی صورت پیش آتی تو میں درگزر ہی کرتا اور ہاں! وہ جو ابن زبیر ہے وہ فریب دست داؤں باز ہے۔ وہ سامنے آجائے تو کمر توڑ چھوڑنا۔ ہاں اگر صلح چاہے تو ضرور صلح کرلینا اور اپنی قوم (قریش) کا خون جہاں تک تم سے ہو سکے اس کو بہنے سے بچانا۔"[1]

بہرحال ان اختلاف کرنے والے تین حضرات کے بارے میں جو حضرت معاویہ کی وفات تک زندہ تھے تاریخی روایات کے مطابق حضرت معاویہ نے یزید کو کچھ وصیت کی تھی اور یہ قرین قیاس بھی ہے۔[2]

---

[1] طبری ج ۶ ص ۱۸۱

[2] "خلافت معاویہ و یزید" کے مصنف جناب محمود احمد عباسی مرحوم نے ایسی کسی وصیت سے انکار کرتے ہوئے ایک دوسرا وصیت نامہ اپنی کتاب میں درج کیا ہے جس میں یزید کی خلافت سے کسی کے اختلاف یا اختلاف کرنے والے حضرات کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک مرحوم کے اس طرز کی وجہ یہ ہے کہ ان کی تصنیف پر جو حملے ہوئے ان کے نتیجے میں وہ بعض قطعی طور پر ناقابل انکار باتوں سے بھی انکار کی کوشش کر جاتے ہیں۔ یہ نہیں مانا جا سکتا کہ یزید کی ولیعہدی کے مسئلہ میں جو حضرات اختلاف کر رہے تھے اس کی کچھ اہمیت تھی یا ان کے اختلاف سے متعلق جو بیانات ہیں وہ کسی طور سے ناقابل قبول تھے اور ہم نے بھی ان کو رد کیا۔ الخ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

مخالفین سے بیعت کا مطالبہ

والد کے انتقال کی خبر پاکر یزید کے دمشق پہنچنے کا ذکر گزشتہ باب میں آ چکا ہے، اس خطبے سے فراغت کے بعد جو بطور امیر المومنین انہوں نے دمشق پہنچ کر دیا[1] مورخین کے بیان کے مطابق ان کا پہلا کام یہ معلوم ہوتا ہے کہ مدینے کے گورنر ولید[2] بن عتبہ بن ابی سفیان (یعنی اپنے چچا زاد بھائی کو) حضرت معاویہؓ کی وفات کی اطلاع بھیجی اور ساتھ ہی یہ حکم بھی کہ عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن زبیر اور حسین بن علی سے بیعت لی جائے۔ لیکن دو مختلف قسم کی روایتیں اس بارے میں ہیں، ایک روایت کہتی ہے:-

اما بعد فخذ حسینا و عبد اللّٰہ	کہنا یہ ہے کہ حسین، عبداللہ بن عمر اور
بن عمر و عبد اللّٰہ بن الزبیر	عبداللہ بن زبیر کو بیعت کیلئے پکڑو اس
بالبیعۃ اخذا شدیدا لیست فیہ	سختی کے ساتھ کہ اس میں کوئی نرمی
رخصۃ حتی یبایعوا۔ والسلام[3]	نہیں حتی کہ بیعت کریں۔

لیکن اس سخت ہدایت کے برخلاف ولید کا برتاؤ اس معاملے میں اس قدر نرم دکھایا گیا ہے کہ وہ اپنے سے پیشتر کے اور جہاندیدہ گورنر مروان بن الحکم کو اس حکم کی تعمیل میں مشورے کے لیے بلاتا ہے کیونکہ اس پر اس حکم کی تعمیل بھاری ہو رہی ہے۔ اور یہ مشورہ پاتا ہے کہ

ہم گذشتہ کا تجزیہ ہے تردید مرحوم نے اس انداز سے کی کہ اختلافات کی مکمل کہانی ہی اس تردید میں پلٹ جاتی ہے اور پھر جہاں حضرت معاویہ کی وصیت کے اختلافات کی کہانی ہے وہاں انہوں نے اسطرح اسکی تردید کر دی کہ وصیت کے اس مضمون کو بغیر کسی ثبوت بحث اور تجزیے کے جعلی بتا کر لیکن دوسرا وصیت نامہ البدایہ والنہایہ کے حوالے سے درج کر دیا اس وصیت نامہ میں مضمون کے اعتبار سے کوئی ایسی بات نہیں جو اس اختلاف کو جنم دے حضور بھی پتا کر جس وصیت کا ذکر طبری کی روایت کے بعد البدایہ والنہایہ میں مزید بھی منقول ہے (م) عباسی صاحب انکار کرنا چاہتے ہیں اس کے انکار کی کوئی معقول وجہ جب تک نہ ہو اس وقت تک انکار کا کوئی وزن تو نہیں ہو سکتا۔

[1] یہ بھی گزشتہ باب میں نقل ہو چکا۔ [2] یزید کا چچا زاد بھائی۔

[1] خلافت معاویہ و یزید طبع چہارم کراچی۔ جون ۱۹۶۲ء۔ | [3] طبری ج ۲ صفحہ ۱۸۸۔

عبداللہ بن عمر کی بات تو کچھ ایسی نہیں ہے البتہ باقی دو کو اسی وقت بلاؤ اور بیعت نہ کریں تو گردن اڑا دو اور جب تک بیعت نہ کرلیں یہ بھی مت بتاؤ کہ معاویہ کا انتقال ہوگیا ہے۔ ورنہ ان کا حوصلہ بڑھ جائے گا۔[1] یزید کے سخت حکم اور مروان کے سخت تر مشورے کے باوجود روایت یہ کہتی ہے کہ ولید نے کوئی سختی نہیں کی۔ حضرت ابن عمر کو تو بالکل ہی چھوڑ دیا البتہ حضرت عبداللہ بن زبیر اور حضرت حسین کو بلانے کے لیے آدمی بھیجا۔ عبداللہ بن زبیر تو اس وقت آئے نہیں مگر حضرت حسین آگئے اور حضرت معاویہ کی وفات پر تعزیتی کلمات کہہ کر مطالبۂ بیعت کے سلسلے میں یہ عذر پیش کیا کہ۔

فان مثلی لا یعطی بیعتہ سرًّا ولا	میرا جیسا آدمی تو خفیہ بیعت نہیں کیا
اراک تجتزئ بها منی سرًّا	کرتا اور نہ میں سمجھتا ہوں کہ آپ مجھ سے
دون ان تظهرها علی رؤس	مخفی بیعت کو تم کافی سمجھو گے جب تک
الناس علانیۃ فاذا خرجت	کہ علانیہ سب لوگوں کے سامنے ہو پس
الی الناس فدعوتهم الی	جب تم سب لوگوں کے واسطے بیعت کو
البیعۃ دعوتنا مع الناس	باہر نکل کر بیٹھو گے ہم کو بلا لینا۔ اس طرح
فکان امرًا واحدًا۔[2]	سب کام ساتھ ہو جائے گا۔

اور یہ عذر ولید نے بلا حیل و حجت قبول کر لیا۔

فقال له الولید وکان یحب	پس ولید جو عافیت پسند تھا اس نے کہا
العافیۃ فانصرف علی اسم اللہ	ٹھیک ہے اللہ کے نام پر آپ جائیے۔
حتی تاتینا مع جماعۃ الناس۔[3]	اور پھر لوگوں کے ساتھ آجائیے گا۔

اسی واقعہ کی دوسری روایت

طبری کی اس روایت کے برعکس ابن کثیر نے محمد بن سعد کے حوالے سے یہ روایت درج

---

[1] طبری ج ۶ ص ۱۸۹ [2] ایضاً ص ۱۹۰ [3] ایضاً۔

کی ہے کہ :۔

"۱۵ رجب سنہ ۶۰ھ کی شب میں معاویہ کا انتقال ہوا اور لوگوں نے یزید سے بیعت کی۔ اس کے بعد یزید نے عبداللہ بن ادریس عامری کے ذریعہ ولید بن عتبہ بن ابی سفیان گورنر مدینہ کو مراسلہ بھیجا کہ اپنے وہاں کے لوگوں سے بیعت لیں اور ابتداً اعیان قریش سے کریں۔ ان میں بھی خاص کر حسین ابن علی کو مقدم رکھیں کیونکہ مرحوم امیر المومنین نے مجھے ان کے بارے میں خصوصی طور پر نرمی اور صلح جوئی کی وصیت کی ہے۔ پس ولید نے آدھی رات ہی میں جبکہ یہ پیغام اسے ملا حسین اور عبداللہ بن زبیر کے پاس آدمی بھیجا اور یہ بتلاتے ہوئے کہ معاویہ کی وفات ہو گئی ہے ان سے کہا کہ امیر المومنین یزید کے لیے آپ سے بیعت بھی مطلوب ہے۔ ان حضرات نے کہا کہ اس کو صبح پر رکھیے تاکہ اور تمام اہل مدینہ کا عندیہ بھی ہمارے سامنے آ جائے اور یہ کہہ کر حسین اٹھ پڑے اور ابن زبیر بھی ان کے ساتھ نکلے[1] اور کہا "اس یزید کو ہم جانتے ہیں۔ اس میں نہ حزم ہے نہ مروت"

وقد كان الوليد اغلظ للحسين	اور یہ بات یوں ہوئی کہ ولید نے حسین کے
فشتمه الحسين واخذ بعمامته	ساتھ سخت کلامی کی تھی پس حسین نے اس کو
فنزعها من رأسه فقال الوليد	سخت سست کہا اور اس کے سر سے عمامہ
ان هجنا بابي عبد الله الا اسدًا	کھینچ لیا .... اس پر مروان یا کوئی
فقال له مروان او بعض جلسائه	مصاحب بولا کہ گردن مار دینی چاہیے۔
اقتله فقال ان ذلك لدم	ولید نے کہا کہ نہیں، بنی عبد مناف کا یہ
مضنون به مصون في بني	خون بڑا قیمتی اور قطعی محفوظ
عبد مناف۔[2]	ہے۔

---

[1] اس روایت کے مطابق دونوں حضرات ولید کے پاس آ گئے تھے۔ مگر طبری کی روایت کے مطابق صرف حضرت حسین آئے اور یہی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

[2] البدایہ والنہایہ ج ۸ صفحہ ۱۶۲۔

اس روایت میں معاملہ برعکس نظر آتا ہے کہ یزید کی طرف سے نرمی کی خصوصی ہدایت ہو رہی ہے، مگر ولید ترش کلامی سے پیش آتا ہے۔ لیکن آخر میں یہ بھی ہے کہ اس کی پگڑی کھینچ لیے جانے کا واقعہ بھی حضرت حسین کے ہاتھوں پیش آگیا اور جب مروان یا کسی ہم جلیس نے تلوار اٹھانے کو کہا بھی تو اس نے بالکل وہ جواب دیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے نہ صرف یزید کی ہدایت کا لحاظ تھا بلکہ وہ خود بھی حضرت حسین کے لیے کافی احترام دل میں رکھتا تھا اور یہی بات بعد کے واقعات بھی اس کے لیے ثابت کرتے ہیں جو آگے آ رہے ہیں[1]۔

---

[1] طبری کی جس روایت کا اوپر حوالہ دیا گیا اس میں یہ بات کہ مدینے کے اموی گورنر اور یزید کے عمزاد ولید بن عتبہ بن ابی سفیان حضرت حسین کے لیے نہایت گہرا احترام دل میں رکھتے تھے اور زیادہ کھل کر آئی ہے۔ اس میں ہے کہ ولید نے جب حضرت حسین کے عذر پر یہ کہا کہ درست ہے، آپ تشریف لے جائیں کل ہی کو سب لوگوں کے ساتھ زحمت دی جائے گی تب مروان نے فوراً ہی کہا کہ "کیا غضب کرتے ہو، یہ اگر اس وقت نکل گئے تو بغیر بڑے کشت و خون کے ان سے بیعت کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔" اس پر بھی جب ولید نے اپنا رویہ نہ بدلا اور حضرت حسین کو جانے ہی دیا تب مروان نے پھر ولید سے اپنی بات دہرائی کہ تم نے بہت بڑی غلطی کی ہے، اب یہ قابو میں آنے والے نہیں۔ تب بھی ولید کے الفاظ طبری نے جواب میں یہ نقل کیے ہیں:-

وبخ غيرك يا مروان انك قد	تیرا بھلا ہو مروان تو نے میرے لیے وہ بات پسند کی
اخترت لي التي فيها هلاك ديني	جس میں میرے دین کی بربادی ہے۔ بخدا پوری
والله ما احبّ ان لي ما طلعت عليه	دنیا جس پر سورج طلوع و غروب ہوتا ہے اس کا
الشمس وغربت عنه من مال	مال و ملک بھی مجھے ملتا ہو تو قتل حسین کے بدلے
الدنيا وملكها واني قتلت حسيناً	میں مجھے یہ پسند نہ ہوگا۔ سبحان اللہ میں حسین کو
سبحان الله اقتل حسيناً ان قال	بس اس بات پر قتل کر دوں کہ وہ بیعت نہیں
لا ابايع والله اني لاظن ان امرأً	کرتے ہیں۔ واللہ میرا خیال ہے کہ جس کسی شخص
يحاسب بدم حسين لخفيف الميزان	کو خون حسین کا حساب دینا پڑا وہ قیامت میں
عند الله يوم القيامة - (طبری ج ۶ صفحہ ۱۹۰-۱۸۹)	ہلکی میزان والا ثابت ہوگا۔

نتیجۂ بحث

پس حضرت معاویہ کی وصیت کی روشنی میں، ابن سعد کی روایت کی روشنی میں ـــــ جو یزید کی طرف سے نرمی کی ہدایت دکھاتی ہے ـــــ اور ولید کے اس رویّے کی روشنی میں جس کی گواہی طبری کی پوری روایت دیتی ہے اور ابن سعد کی روایت کا آخری حصہ دے رہا ہے ہمارے لیے انصاف پسندی کی رو سے مناسب صرف یہی ہو سکتا ہے کہ طبری کی روایت میں یزید کی طرف سے جو سختی کی ہدایت پائی جاتی ہے اور ابن سعد کی روایت میں ولید کی طرف جو سخت کلامی منسوب کی گئی ہے، ان دونوں باتوں کو الحاقی کارروائی سمجھا جائے۔ رجب سنہ ۶۰ھ سے لیکر محرم سنہ ۶۱ھ تک جبکہ حضرت حسین کا سانحۂ شہادت پیش آیا، ہمیں طبری کی اس ایک موقع کی روایت کے سوا کوئی دوسری روایت نہیں ملتی جو حضرت حسین کے بارے میں یزید کے سخت رویّے کی شہادت دیتی ہو، حالانکہ وہ اس دوران میں یزید کی بیعت سے بچ کر مدینے سے مکّے چلے گئے، پھر مکّے میں چار پانچ مہینے مقیم رہے جن میں کوفے جانے کی تیاری ہوتی رہی، حتیٰ کہ پھر کوفے کا سفر بھی شروع ہو گیا۔ مگر سمجھانے بجھانے کی کوشش کا ذکر تو یزید اور اس کے حکام کے بارے میں ملتا ہے سختی یا داروگیر کا قطعاً نہیں ملتا جبکہ اس کے برعکس حضرت عبداللہ بن زبیر کے ساتھ اُسی دن سے جس دن سے وہ حضرت حسین کی طرح مدینے سے مکّے کے لیے نکلے ہر طرح کی سختی کی ہدایتیں یزید کی طرف سے ملتی رہیں۔ اور اس کے حکام کی طرف سے داروگیر کی کوششیں مسلسل ہوتی رہیں۔ جیسا کہ آگے آئیگا۔

امام باقرؒ کی روایت

اور کسی کی نہیں خود حضرت امام باقر کی روایت بھی اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ یزید کی بیعت کے سلسلے میں حضرت حسین پر کوئی سختی روا نہیں رکھی گئی۔ ابن جریر طبری

اپنی سند بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

قال حدثنا عمار الدهنی قال
قلت لابی جعفر حدثنی
بمقتل الحسین کانی حضرته
قال مات معاویة والولید بن
عتبة بن ابی سفیان علی المدینة
فارسل الی الحسین بن علی
لیأخذ بیعته فقال له اخرنی
وارفق فاخره فخرج الی
مکة [1]

ہم سے عمار دہنی نے بیان کیا کہ میں
نے ابو جعفر (امام باقر) سے عرض کی کہ
مجھے قتل حسین کا قصہ اس طرح سنائیے
کہ جیسے میں وہاں موجود تھا۔ انہوں نے
فرمایا معاویہ کا انتقال ہوا اور ولید بن
عتبہ بن ابی سفیان اس وقت حاکم مدینہ
تھے پس انہوں نے یزید کی بیعت کے لیے
حسین کو بلوا بھیجا۔ آپ نے کہا کہ ذرا
مؤخر کر دو اور نرمی برتو۔ اس نے مؤخر
کر دیا تب آپ مکے کے لیے نکل گئے

مکہ کو روانگی

بہرحال حضرت حسین کی فرمائش پر کہ بیعت کا معاملہ مؤخر کر دیا جائے (کیونکہ ان کا جیسا آدمی تنہائی میں بیعت کرے یہ کوئی مناسب بات نہیں بلکہ جب تمامی اہل مدینہ بیعت کے لیے بلائے جائیں اسی وقت وہ بھی آجائیں گے اور سب کام ساتھ ہی ہو جائیگا) ولید نے آپ کو رخصت کی اجازت دیدی اور آپ نے جیسا کہ ابھی حضرت امام باقر کی روایت سے گزرا مکہ کی راہ لے لی۔ مکہ کو آپ کی یہ روانگی ۲۷ یا ۲۸ رجب سنہ ۶۰ھ یکشنبہ کی رات میں ہوئی [2]

اوپر طبری کے حوالے سے گزر چکا ہے کہ ولید نے حضرت عبداللہ بن عمر کو تو چھوڑ دیا

---

[1] طبری ج ۶ ص ۱۹۳ [2] ایضاً ص ۱۹۰۔

تھا۔ مگر حضرت حسین اور حضرت عبداللہ بن زبیر کے پاس بیک وقت آدمی بھیجا تھا جس پر حضرت حسین نے تو اسی وقت ولید سے ملنے کا فیصلہ کر لیا اور تشریف لے گئے مگر حضرت زبیر نے اس کو مصلحت نہ جانا اور پھر بار بار تقاضوں کو ٹالتے ہوئے رات ہی میں مکے کے لیے نکل گئے اور پھر اگلی رات میں حضرت حسین نے بھی مکے کی راہ لی[1]۔ طبری میں ہے کہ ابن زبیر کے نکل جانے کی وجہ سے حکومت کی تمام تر توجہ چونکہ ابن زبیر کی تلاش پر مرکوز رہی اس لیے اس صبح کو وہ حضرت حسین کی طرف توجہ ہی نہ کر سکے اور شام کو جب توجہ کی تو آپ نے فرمایا کہ اب تو رات ہو رہی ہے صبح کو دیکھیں گے اور پھر اسی رات آپ بھی مکے کیلئے نکل گئے[2]۔

پورے کنبے کے ساتھ

بتایا گیا ہے کہ حضرت حسین نے اپنے پورے گھرانے کو ساتھ لیا۔

خرج ببنیه واخوته وبنی	آپ نکلے اپنے بیٹوں اور بھائیوں اور بھتیجوں
اخیه وجلّ اهل بیته	کے ساتھ اور گویا تمام کنبہ ہی ساتھ تھا
الا محمد بن الحنفیة۔[3]	سوائے بھائی محمد بن حنفیہ کے۔

جبکہ حضرت عبداللہ بن زبیر نے غالباً وقت کی تنگی اور اندیشوں کی زیادتی کی وجہ سے صرف ایک بھائی جعفر بن زبیر کو ساتھ لے کر سفر کیا۔ ان کے بارے میں یہ بھی تصریح کی گئی ہے کہ

---

[1] طبری ج ۶ ص ۱۹۰، ابن اثیر ج ۳ ص [illegible]، ابن اثیر نے طبری کی مذکورہ روایت کو جن الفاظ میں درج کیا ہے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ بلانے کا واقعہ دن میں پیش آیا تھا اور ابن زبیر اسی رات کے آخری حصہ میں مکے کیلئے نکل گئے۔ ابن کثیر کی روایت جو اوپر درج کی گئی اس کی رو سے بلاوا آدھی رات کو ہوا تھا اور پھر اگلی رات حسین کو ابن زبیر مدینے سے نکلے۔ اور چونکہ یہ مسلّم ہے کہ حضرت حسین ابن زبیر سے ایک رات بعد نکلے ہیں اسلئے گویا حضرت نے بلاوے کے بعد دو دن اور ایک رات مدینے میں گزاری۔ طبری کے الفاظ صاف نہیں ہیں اسلئے ہمارے نظر میں ترجیح ابن اثیر کے بیان کو ہے۔

[2] ایضاً۔ [3] ایضاً۔

"طریق اعظم" (شاہراہ) سے بچ کر ایک ذیلی راستے (طریق الفرع) سے سفر کیا تھا اور یہ کہ جیسے ہی پتہ چلا کہ وہ مدینے سے نکل گئے ہیں اور اندازہ کیا گیا کہ سوائے مکے کے اور کہیں نہیں جا سکتے تو تقریباً اسّی سواروں کے ایک دستے کے ذریعہ ان کی تلاش اور تعاقب کیا گیا مگر چونکہ وہ عام راستے سے نہیں بلکہ غیر معروف راستے سے گئے تھے اس لیے تعاقب ناکام رہا۔[1]

شاہراہ سے سفر

حضرت عبداللہؓ بن زبیر کے بارے میں متقابلاتنا انداز سے کی گئی اس تصریح سے کہ انھوں نے مکہ اور مدینہ کی شاہراہ (طریق اعظم) سے بچ کر کسی ذیلی اور انجبی راہ کو اپنایا از خود بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت حسینؓ نے بچ بچا کر جانے کے بجائے عام راستے سے سفر کیا، مزید برآں چند صفحوں کے بعد طبری کی ایک روایت میں اس کی تصریح بھی آتی ہے کہ آپ کے اہل بیت نے مشورہ دیا تھا کہ شاہراہ سے بچ کر سفر کیا جائے جیسا کہ حضرت عبداللہؓ بن زبیر نے کیا مگر آپ نے اسے منظور نہ فرمایا اور کھلی شاہراہ سے ہی سفر کیا۔[2] آپ کے سفر کے سلسلے میں کسی تعاقب کا ذکر نہیں ہے۔ ۳ شعبان ۶۰ھ شب جمعہ میں آپ بخیر و عافیت پورے قافلے کے ساتھ مکہ معظمہ پہنچ گئے۔[3]

خیر خواہوں اور عقیدتمندوں کے مشورے

۱۔ اوپر ذکر آیا کہ حضرت حسین کے قافلے میں آپ کے بھائی محمد بن حنفیہ[4] ساتھ نہیں ہوئے اس روایت میں وہیں ان کی زبان سے یہ بھی کہلوایا گیا ہے کہ:-

---

[1] طبری ج ۶ صفحہ ۱۹۰ [2] طبری ج ۶ صفحہ ۱۹۶ [3] البدایہ والنہایہ ج ۸ صفحہ ۱۵۱۔ [4] حضرت حسین کے یہ بھائی حضرت فاطمہؓ سے نہیں بلکہ حضرت علیؓ کی ایک دوسری اہلیہ سے تھے۔

"اے جانِ برادر، آپ مجھے دنیا میں سب سے بڑھ کر عزیز ہیں، آپ سے زیادہ اور
کوئی نہیں ہے جس کے لیے خیر خواہی بچا کر رکھوں۔ میری گزارش ہے کہ آپ
جا تو رہے ہیں مگر ایک دم سے کسی شہر کا ارادہ مت کیجئے گا بلکہ شہروں سے
دور رہتے ہوئے اپنے آدمی مختلف علاقوں میں بھیجیے اور اپنی بیعت کی دعوت
دیجیے اگر لوگ قبول کرلیں تو اللہ کا شکر کریں۔ نہ قبول کریں اور آپ کے بجائے
کسی دوسرے پر اتفاق کرلیں تو اس سے نہ آپ کے دین کو کوئی بٹہ لگے گا نہ عقل
کو اور نہ آپ کی خاندانی منزلت میں کوئی فرق آئے گا۔ مجھے ڈر ہے کہ مبادا آپ
ان شہروں میں سے ہی کسی شہر کا رخ کرلیں اور پھر وہاں کے لوگوں میں دو گروہ
ہو جائیں اور جنگ برپا ہو جس کا پہلا نشانہ خود آپ ہی بن جائیں۔ ......
کسی شہر میں اگر جانا ہے تو بس مکے کا رخ کریں، وہاں حالات اگر آپ کے لیے
اچھے ہیں تو ٹھیک ورنہ پھر سفر اور صحرانوردی کے لیے کمر باندھ لیجئے، شہروں سے
دور رہتے ہوئے علاقہ در علاقہ گھومیے۔ حتیٰ کہ پتہ چلے کہ حالات کیا ہیں لوگ
کیا سوچ رہے ہیں۔ اس کے بعد جو رائے قائم ہوگی وہی صحیح رائے ہوگی۔ صحیح
اور دانشمندانہ رائے وہی ہوتی ہے جو حالات کی چھان بین کے بعد قائم کی
جائے اس کے برعکس جو رائے حالات کی طرف پشت کرتے ہوئے قائم کی
جائے اس سے زیادہ باعث پریشانی کوئی دوسری رائے نہیں ہو سکتی۔[1]"

اگر یہ روایت صحیح ہے تو ایک طرف پختہ کاری اور دانشمندی کا اعلیٰ نمونہ ہے، دوسری طرف ایک چھوٹے بھائی کی طرف سے مشاورت اور اظہار رائے میں حسن ادب اور لطافت بیان کا بھی بہترین نمونہ۔ حضرت محمد بن حنفیہ حضرت حسن و حسین کے تیسرے بھائی ہیں شجاعت اور جسمانی طاقت میں اپنے والد ماجد کے خلف تھے۔ حضرات حسنین رض کے لیے

---

[1] طبری ج ۲ ص ۱۹۱-۱۹۰ (قدرے اختصار کے ساتھ)

بیحد محبت اور خلوص رکھتے تھے۔ جنگ جمل اور جنگ صفین میں جہاں تینوں بھائی حضرت علی کے دوش بدوش ہوتے تھے وہاں حضرت علی خود جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں پھولوں (ریحانتی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کی حفاظت پر نظر رکھتے تھے وہاں محمد بن حنفیہ کو بھی ہدایت فرماتے کہ ان کو اپنے سے جدا اور آنکھ سے اوجھل نہ ہونے دینا۔ حالانکہ وہ عمر میں چھوٹے تھے مگر جسمانی طاقت اور قد و قامت میں غیر معمولی جس کے بعض یادگار قصے ہیں۔ مذکورہ بالا عبارت میں حسن ادب اور لطافت بیان کے پردے میں صاف جھلک رہا ہے کہ وہ حضرت حسینؓ کے اندر خیالات کے طوفان کو سمجھ رہے ہیں اس طوفان کے اندر کوفے کی سمت سفر بھی انھیں نظر آ رہی ہے جبکہ وہ دونوں باتوں کے حق میں نہیں ہیں۔ مگر اس انداز سے حق خلوص اور امانت مشورہ ادا کرتے ہیں کہ ادب اور لطافت بلائیں لیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت محمد بن حنفیہؒ حضرت حسنؓ کے ہم رائے تھے اور سنجیدگی کے ساتھ رائے قائم کر چکے تھے کہ ان کے والد کی شہادت حالات کے جس دھارے میں ہوئی ہے اسکو سامنے سے روکنے اور موڑنے کی کوشش میں نقصانات ہیں فائدہ کوئی نہیں[1]۔ چنانچہ آپ نہ صرف یہ کہ حضرت حسینؓ کے ساتھ نہیں نکلے بلکہ اپنی اولاد میں سے بھی کسی کا نکلنا پسند نہیں کیا[2]۔ اور اس سے بھی آگے کی بات یہ ہے کہ جب شہادت حسینؓ کے تین سال بعد تقریباً پورا

---

[1] حضرت عائشہ صدیقہؓ کو حجر بن عدی کے قتل کی خبر پہنچائی گئی (جو حضرت معاویہؓ پر کیے جانے والے اعتراضات میں سے ایک بہت نمایاں اعتراض ہے) تو آپؓ کو اس خبر سے بہت صدمہ ہوا مگر ساتھ ہی یہ فرمایا کہ اگر یہ بات نہ ہوتی کہ ہم نے جب برائی کو بھی روکنے اور بدلنے کی کوشش کی تو نتیجہ میں اس سے بھی بڑی برائی پیدا ہو گئی تو حجر کے قتل پر بھی ہم کچھ کیے بغیر نہ رہتے۔ "لولا انا لم نغیر شیئا الا صارت بنا الامور الی ما هو اشد منه لغیرنا قتل حجر۔ (الکامل ج ۳ ص ۲۴۳) بظاہر یہی نقطۂ نظر حضرت حسنؓ اور حضرت محمد بن حنفیہؒ کا تھا۔ حجر بن عدی کے قتل پر حضرت عائشہؓ کا مذکورہ تاثر ذکر میں آ جانے کے بعد یہ بات بھی ذکر کر دینا مناسب ہے کہ اس قتل کے سلسلے میں حضرت عائشہؓ نے حضرت معاویہؓ کا یہ عذر قبول کر لیا تھا کہ حجر کی زندگی سے جس فتنہ و فساد کا اندیشہ تھا اس کا سد باب ان کی ایک جان کے مقابلے میں زیادہ قابل لحاظ تھا۔ (حوالہ سابق، نیز البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۵۵)

مدینہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے زیر اثر یزید کے خلاف بغاوت کا علم اٹھا کے کھڑا ہوگیا تب بھی حضرت محمد بن حنفیہ ہی اہل مدینہ میں سے وہ تیسرے بزرگ تھے جن کا نام حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے ساتھ آتا ہے کہ وہ صاف طور پر اس بغاوت کے مخالف رہے۔ تیسرا نام حضرت زین العابدین بن علی بن الحسینؓ کا بھی اسی فہرست میں ہے[1]

ایک اور روایت

البدایہ والنہایہ میں مزید برآں ایک روایت اور ہے کہ مکے پہنچنے کے بعد حضرت حسینؓ نے کسی کو مدینے بھیجا تاکہ بنی عبدالمطلب میں سے جو افراد ان کے ساتھ آنے سے رہ گئے ہیں وہ بھی آجائیں۔ چنانچہ جن کو آنا تھا وہ آئے اور بعد ازاں حضرت محمد بن حنفیہ بھی زمانۂ حج کے موقع پر مکہ تشریف لے آئے۔

فأدرك حسيناً بمكة فأعلمه أن	اور بال حسینؓ کو سمجھایا تو ان سے کہا
الخروج ليس له برأي يومه هذا	کہ ان کی رائے میں اس وقت خروج کا خیال
فأبى الحسين أن يقبل	بالکل مناسب نہیں ہے اور یزید کے خلاف
فحبس محمد بن حنفية ولده	اقدام کے خیال سے گزرنے کا ارادہ حسینؓ
فلم يبعث أحداً منهم حتى	نے بالکل قبول نہیں کی۔ اور محمد بن حنفیہ نے
وجد الحسين في نفسه على محمد	اپنی اولاد میں سے کسی کو ان کے ساتھ
وقال ترغب بولدك عن	نہیں بھیجا جس پر حسینؓ کو ان سے رنج
موضع أصاب فيه فقال وما	ہوا اور کہا کہ تم اپنی اولاد کو میری جان سے
حاجتي إلى أن تصاب ويصابون	زیادہ عزیز رکھتے ہو؟ آپ نے جواب
معك وإن كانت مصيبتك	دیا کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیوں آپ

---

[1] دیکھئے سنہ ۶۳ھ کے واقعات کا بیان۔ البدایہ والنہایہ ج ۸ صفحہ ۲۱۸ ۔

اعظم عندنا مصیبۃ[1]	اور کیوں وہ آپ کے ساتھ مصیبت میں پڑیں۔ اگرچہ یہ اپنی جگہ واقعہ ہے کہ آپ کی مصیبت میرے لیے انکی مصیبت سے بڑھ کر ہے۔

دونوں روایتوں کے لہجے کا فرق

طبری کی روایت میں جو لطافت اظہار اور حسن ادب ہم نے محسوس کیا تھا البدایہ والنہایہ کی اس روایت کا لہجہ اس سے بالکل مختلف ہے، ہو سکتا ہے اس میں کچھ دخل کسی راوی کی بے احتیاطی کا ہو لیکن فی نفسہٖ لہجے کے فرق کی وجہ سمجھنا کچھ ایسا مشکل بھی نہیں ہے۔ پہلی روایت کا لہجہ اس وقت کا ہے جب حضرت حسینؓ کا مدینہ چھوڑنا ان کی سلامتی کیلئے ضروری یا کم از کم مناسب سمجھا جا سکتا تھا اور مکہ سے بہتر کوئی جگہ اس کے لیے نہیں ہو سکتی تھی چنانچہ حضرت محمد بن حنفیہ نے مکے ہی کا مشورہ دیا تھا۔ کوفے کے ارادہ کی بات حضرت محمد بن حنفیہ کے لیے اس وقت بس ایک اندیشے اور امکان کے درجہ کی تھی۔ چنانچہ آپ نے کافی سمجھا کہ اشاروں کنایوں کے لطیف انداز میں اس کے خلاف رائے دیدی جائے۔ مگر اس دوسری روایت والی گفتگو کا وقت وہ ہے جب حضرت محمد بن حنفیہ دیکھتے ہیں کہ حضرت حسینؓ ان کے بیحد مخلصانہ، محبانہ اور دور اندیشانہ مشورے کو نظر انداز کر کے نہ صرف خود کوفے کا عزم کر رہے ہیں بلکہ خاندان کے چھوٹے بڑے اور عورت مرد ہر فرد کو ساتھ لیے جا رہے ہیں ۔۔۔ جو ان کے نزدیک موت کے منہ میں جانے والی بات تھی ۔۔۔ تو ان کی شدت خلوص کا تقاضا اب یہ ہوا کہ لہجے کی ادبی لطافتیں ہٹا کر بے لوچ صراحت سے کام لیا جائے جو شاید کام کر جائے۔ محبت کرنے والا چھوٹا اگر بڑے کو موت کے منہ میں جاتا ہوا دیکھے گا تو ذرا بعید نہیں کہ

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۶۵

اس انجام کو روکنے کے لیے بے ادب صاف گوئی کی جرأت بھی کر جائے۔ بعض روایتیں بتاتی ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ بڑے ہونے کے باوجود حضرت حسنؓ و حسینؓ کے نسبی احترام میں چھوٹے بن جایا کرتے تھے مگر آگے آگے جب دیکھا کہ حضرت حسینؓ ان کی سنتے ہی نہیں ہیں خاص کر یہ کہ عورتوں بچوں کو چھوڑنے کے مشورہ پر بھی توجہ نہیں کرتے تو حضرت ابن عباسؓ کے خلوص اور غمخواری کا لہجہ بھی ایسا ہی تیز اور تیکھا ہو گیا تھا ـــــ بہرحال یہ تو قطعی واقعہ ہے کہ حضرت ابن حنفیہ کی اولاد میں سے کوئی فرد حضرت حسینؓ کے قافلے میں شامل نہیں تھا۔ اور یہ خود ایک سخت موقف کی دلیل ہے۔

۲ـــ طبری کے سلسلۂ روایات میں دوسرا نام حضرت عبداللہ بن مطیع کا آتا ہے۔ یہ ان کم عمر صحابہؓ میں ہیں جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں سنِ تمیز کو نہیں پہنچ پائے تھے۔ یعنی حضرت حسینؓ سے کچھ چھوٹے تھے۔ واقعۂ کربلا (سنہ ۶۱ھ) کے بعد سنہ ۶۳ھ میں جو واقعۂ حرہ پیش آیا ہے۔ جو یزید کے خلاف اہل مدینہ کی بغاوت اور معرکہ آرائی کا نام ہے اس کے دو نمایاں قائدوں میں سے ایک یہی عبداللہ بن مطیع تھے اس معرکہ کی ناکامی کے بعد حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے پاس مکے چلے گئے اور وہاں آپؓ ہی کے ساتھ حجاج سے مقابلہ میں شہید ہوئے[۱]۔ ان عبداللہ بن مطیع کے بارے میں آتا ہے کہ جب حسینی قافلہ مدینے سے مکے جا رہا تھا تو یہ بھی کہیں سے (شاید مکے ہی سے) آتے ہوئے ملے اور سفر کا قصہ جاننے کے بعد بصد ادب والحاح گزارش کی کہ کوفہ کا قصد ہرگز نہ فرمائیے گا۔ ان لوگوں کے کردار کو بھول نہ جائیے گا[۲]۔

۳ ۔ ابن سعد کی روایت یہ ہے کہ حضرت حسینؓ اور حضرت ابن زبیرؓ ایک ہی رات میں مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ کیلئے نکلے تھے۔ اس روایت کے حوالے سے ابن کثیر نقل کرتے ہیں کہ ان کو راہ میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ بھی عمرہ سے واپس آتے ہوئے ملے اور ان دونوں صاحبان سے کہا کہ:

---

[۱] الاصابہ فی تمییز الصحابہ ج ۵ ص ۶۴-۶۵ [۲] طبری ج ۶ ص ۱۹۶

اذکرکما اللہ الا رجعتما فقد خلتما	میں اللہ کا واسطہ دیکر تم دونوں سے
فی صالح ما یدخل فیہ	کہتا ہوں کہ لوٹ چلو تاکہ جو مناسب بات
الناس وتنظرا فان اجتمع	لوگ اختیار کریں تم بھی اس کو اختیار
الناس علیہ فلم تشذا وان	کرلو اور دیکھو۔ پھر اگر لوگ پوری طرح
افترقوا علیہ کان الذی	ایک بات پر متفق ہو گئے تو تم انحراف
تریدان[1]	کرنے والوں میں سے نہیں ہوگے اور اگر اختلاف
	ہوا تو تمہاری مراد پوری ہوجائیگی۔

نیز خاص طور سے حضرت حسینؓ سے کہا کہ:۔

"اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو اختیار دیا تھا کہ دنیا اور آخرت میں سے جس ایک کو چاہیں پسند کرلیں۔ آپ نے آخرت پسند فرمائی اور تم آپ ہی کا ٹکڑا اور آپ کی ذات کا حصہ ہو اسلئے تمہیں دنیا نہ مل سکے گی۔ پس یہ ارادہ خروج چھوڑ دو۔" یہ کہکر آپ نے حضرت حسینؓ کو گلے سے لگایا اور رو پڑے[2]۔

اس سلسلۂ بیان میں آگے بتایا گیا ہے کہ حضرت ابن عمرؓ رنج و قلق کے ساتھ فرمایا کرتے تھے کہ:۔

"غلبنا حسین بن علی بالخروج" حسین بن علیؓ نے کوفے کے قصد کے معاملے میں ہماری بات نہ مانی حالانکہ انہوں نے اپنے باپ اور بھائی کا عبرت انگیز حال دیکھا تھا کہ کیسے فتنے اٹھائے گئے تھے اور نتیجۂ میدان میں انکا ساتھ دینے سے انکار کر دیا گیا تھا[3]۔ انہیں تو عمر بھر کسی خروج کا نام نہ لینا تھا اور لوگوں کے عمومی فیصلے میں شامل ہوجانا تھا اسلئے کہ جماعت میں خیر ہے[4]۔"

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۶۲۔ [2] ایضاً ص ۱۶۳ طبری میں یہ واقعہ اس وقت کا بتایا گیا ہے جب حضرت حسینؓ مکے سے کوفے کیلئے روانہ ہو گئے۔ یہیں کہا گیا ہے کہ حضرت ابن عمرؓ مکے سے باہر گئے ہوئے تھے انہیں جونہی اطلاع ملی تو آپ تیزی سے ان کے پیچھے روانہ ہوئے اور راہ میں آ لیا۔ کذا روایات کی طبری ج ۶ ص ۱۹۳۔ [3] حضرت حسینؓ نے کربلا کے میدان میں جب اپنے بلانے والوں ہی کو اپنے مقابل صف آرا پایا تو انہیں مخاطب کیا تھا ان میں یہ دو نام بھی لکھے تھے شبث ابن ربعی اور قیس ابن اشعث۔ ان میں سے شبث تو خود ان لوگوں میں تھا جن کی طرف حضرت ابن عمرؓ کا اشارہ ہے۔ اور قیس کے والد اشعث صفین میں ایسے سب لوگوں کے سرگروہ تھے۔ حضرت حسینؓ کا خطاب آگے اپنی جگہ پر آئیگا۔ [4] البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۶۲۔

باب ہشتم

مکہ میں ورود ـــ اہلِ کوفہ کے خطوط ـــ اور وفود

مسلم بن عقیل کا مشن

بہرحال حضرت حسینؓ شعبان سنہ ٦٠ھ کی ۳ تاریخ کو مکے پہنچ گئے اور دارِ عباسؓ میں قیام کیا[1]۔ جیسا کہ ہونا ہی چاہیے تھا آپ کے پاس لوگوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی۔ ان میں اہلِ مکہ بھی تھے اور عمرہ وغیرہ کے لیے آنے والے بیرونی لوگ بھی۔ خبر کوفے بھی پہنچ گئی۔ اور رمضان میں وہاں سے شیعانِ علیؓ کے خطوط لے کر ان کے قاصد پہنچنا شروع ہو گئے۔ ایک کے بعد ایک چار یا پانچ تھیلیوں میں کم سے کم کوئی ڈیڑھ سو خطوط پہنچے جو نمایاں لوگوں کے تھے، یہ خطوط دعوتی تھے کہ آپ یہاں تشریف لے آئیے جانثاران چشم براہ ہیں۔ پہلے خط کا مضمون جو طبری نے دیا ہے اس طرح ہے:-

> "سلیمان بن صرد، مسیب بن نجبہ، رفاعہ بن شداد، حبیب بن مظاہر اور جملہ شیعانِ کوفہ کی طرف سے حسین بن علیؓ کے نام۔ بعد از سلام! خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے آپ کے دشمن جابر کا قصہ پاک کیا جس نے ناحق حکومت پر قبضہ کر رکھا تھا[2]۔ اب اس وقت ہمارا کوئی امام نہیں ہے۔ آپ تشریف لے آئیے کہ شاید اللہ

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ٨ صفحہ ١٦٢ ۔ [2] یعنی حضرت معاویہؓ کے انتقال کی طرف اشارہ ہے۔

آپ کے ذریعہ ہم لوگوں کو حق پر جمع کر دے۔ یہاں جو اموی گورنر نعمان بن بشیر ہیں ہم ان کے پیچھے جمعہ اور عید تک نہیں پڑھتے اور اگر ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ آپ ادھر کے لیے روانہ ہو گئے ہیں تو ہم انشاء اللہ ان کا بستر باندھ کر انہیں شام بھیج دیں گے۔ [1]

اس طرح کے خطوط کی جو بارش ہوئی اور طبری کے بیان کے مطابق ہر دو دن کے فصل سے ایک کھیپ روانہ ہوئی۔ [2] تو حضرت محمد بن حنفیہ کا ڈھکا ہوا اور عبداللہ بن مطیع کا کھلا ہوا نہایت اخلاص اور الحاح کے ساتھ مشورہ کہ کوفے کا رخ ہرگز نہ کیجئے گا، بے اثر ہو گیا اور ان حضرات نے جس قدر زور دے کر یہ بات کہی تھی اس سے لگتا ہے کہ ان کو خطرہ بہت تھا کہ کوفے والے بلائیں گے اور حسینؓ اپنے آپ کو روک نہ پائیں گے۔ بہرحال ان بلاووں کا اثر ہوا اور تاریخ کے بیان کے مطابق آپ نے طے کیا کہ اپنا ایک آدمی کو تو بھیج کر اطمینان کریں کہ کیا واقعی یہ لوگ جو کچھ لکھ رہے ہیں وہ قابل اعتماد ہے؟

مسلم بن عقیلؓ کوفے کو

اس مقصد کے لیے آپ نے اپنے چچیرے بھائی مسلم بن عقیلؓ کا نام طے کیا اور کوفے کے جو لوگ خطوط لیکر آئے ہوئے تھے انکو اس مضمون کا جواب لکھ کر روانہ کر دیا کہ، میں اپنے چچیرے بھائی مسلم بن عقیل کو آپ لوگوں کے پاس بھیج رہا ہوں کہ یہ میرے قائم مقام بن کر حالات کو دیکھیں اور مجھے اطلاع دیں۔ پس اگر انہوں نے اطمینان ظاہر کیا اور لکھا کہ آپ لوگ جو کچھ مجھے لکھ رہے ہیں اس پر آپ کے تمام معززین اور اہل رسوخ و اہل رائے کا اتفاق ہے تو میں بلا تاخیر چلا آؤں گا۔ اس لیے کہ قسم میری جان کی امام تو وہی ہے جو کتاب اللہ پر عامل، انصاف کا خوگر، حق کا تابع اور اپنے آپ کو ذات حق سے وابستہ رکھنے والا ہو۔

---

[1] ج ۶ ص 197

والسلام[1]" اور فوراً ہی سفیر مسلم بن عقیل کو دو کو قبول کے ساتھ ان کے مشن پر روانہ کر دیا۔

والیٔ کوفہ حضرت نعمان بن بشیرؓ کا انتباہ

مسلم بن عقیل کوفہ پہنچے تو ان کی آمد زیادہ دن چھپی نہیں رہ سکی۔ ان کی سرگرمیاں مخفی رہیں جو وہ حضرت حسینؓ کے واسطے لوگوں سے بیعتِ امامت لینے کے سلسلے میں کر رہے تھے۔ حضرت نعمان بن بشیرؓ جو انصار مدینہ میں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی تھے، حضرت معاویہؓ کے وقت سے کوفہ کے گورنر سے چلے آ رہے تھے۔ ان کو اطلاع ملی تو مسجد میں لوگوں کو جمع کرایا اور تقریر کی کہ :-

> "اے لوگو فتنہ آرائی اور تفرقہ انگیزی میں مت پڑو۔ اس میں ناحق جانیں جاتی ہیں خون بہتا ہے اور مال چھنتے ہیں۔ میری پالیسی اس معاملہ میں سن لو کہ جب تک مجھ پر حملہ نہیں ہوگا میں کسی پر حملہ نہیں کروں گا، نہ تمہیں برا بھلا کہوں گا، نہ شبہے اور تہمت میں پکڑوں گا۔ لیکن تم نے اگر اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنایا، بیعت توڑی اور امام (یزید) کے خلاف کھڑے ہوئے تو قسم ہے خدائے پاک کی میں تم پر تلوار چلاؤں گا جب تک بھی میرا ہاتھ اس کے قبضہ پر رہے گا، چاہے تم میں سے کوئی بھی میرا ساتھ دینے والا نہ ہو۔ ویسے مجھے امید ہے کہ تم میں وہ لوگ زیادہ ہوں گے جو حق کا حق پہچانتے ہیں، بہ نسبت ان لوگوں کے جو باطل کیلئے حق کا نام لیتے ہیں[2]۔"

امیر یزید کو شکایت

عبداللہ بن مسلم حضرمی نامی ایک صاحب جو بنی امیہ کے حلیفوں میں سے تھے انھوں نے گورنر کی یہ تقریر سن کر کہا یہ تو مناسب پالیسی نہیں نہایت کمزور پالیسی ہے جو فتنہ انگیزوں کو

---

[1] طبری ج ۶ ص ۱۹۸

[2] طبری ج ۶ ص ۱۹۹

تیز کر دے گی۔ حضرت نعمان بن بشیرؓ اس کے باوجود بھی اپنی پالیسی میں تبدیلی کرنے کو تیار نہ ہوئے۔ بنی امیہ کے خیر خواہوں نے یہ صورت حال امیر یزید کو لکھ کر بھیجی اور لکھا کہ اگر تمہیں کوفہ پر حکومت رکھنے کی ضرورت ہے تو فوراً کسی مضبوط آدمی کو یہاں بھیجو، نعمان کمزور آدمی ہیں یا دانستہ کمزوری دکھا رہے ہیں۔ اور بھی چند لوگوں نے اسی مضمون کے خطوط یزید کو لکھے[1]

عبید اللہ بن زیاد کا تقرر

یزید نے ان اطلاعات کے بعد اپنے اہلِ مشورہ کی رائے کے مطابق حضرت نعمان بن بشیرؓ کی جگہ عبید اللہ بن زیاد کا تقرر کیا۔ اس سے پہلے وہ بصرہ کا حاکم تھا۔ اب بصرے کے ساتھ کوفے کی حکومت بھی اسی کے سپرد کی گئی اور ہدایت دی گئی کہ فوراً پہنچ کر مسلم بن عقیلؓ کی گرفتاری کا بندوبست کرے۔ وہ ایک جوان اور اپنے باپ کی طرح سخت گیر منتظم تھا۔ بصرے والوں کو دھمکا کر کہ کوئی شخص کسی مخالفانہ حرکت کا مرتکب نہ ہو، وہ سیدھا کوفے پہنچا اور وہاں کے لوگوں کو جمع کر کے تقریر کی کہ:-

کوفے میں تقریر

> "امیر المومنین نے تمہارے شہر اور اس کے متعلقات کا انتظام میرے سپرد کیا ہے۔ مجھے حکم دیا ہے کہ مظلوم کے ساتھ انصاف کروں، محروم کو اس کا حق دوں، اطاعت گزاروں کے ساتھ بھلائی کروں اور شر پردازوں کے ساتھ سختی۔ اور میں لوگوں میں ٹھیک ٹھیک ان کے حکم کے مطابق کروں گا۔ نیکوکاروں کیلئے میں مہربان باپ کی طرح رہوں گا اور فرمانبرداروں کیلئے ہمدرد بھائی۔ میری تلوار اور میرا کوڑا صرف اس کے لیے ہے جو میرے حکم کی خلاف ورزی کرے گا۔ پس ہر آدمی اپنا برا بھلا سمجھ لے"[2]

---

[1] حوالہ سابق [2] الکامل فی التاریخ (از ابن اثیر) ج ۴ ص ۲۳ مطبوعہ دار صادر بیروت ۱۹۶۵ء۔

عملی کاروائی

اس تقریر کے بعد اس نے تمام لوگوں اور بالخصوص قبائل کے ذمہ داروں (چودھریوں) کو حکم دیا کہ کسی کے یہاں کوئی پردیسی ٹھہرا ہوا ہو، امیر المومنین کا اشتہاری مجرم ہو یا کوئی خارجی اور مخالف حکومت خیالات پھیلانے والا، تو لازم ہے کہ ایسے لوگوں کے ناموں سے تحریری طور پر مطلع کیا جائے، جو کوئی ایسا کر دے گا وہ ان لوگوں کے اعمال کی ذمہ داری سے بری ہوگا۔ جو ایسا نہ کرے وہ اس بات کی تحریری ذمہ داری دے کہ اس کے حلقے اور اس کی جماعت سے حکومت کے خلاف کسی طرح کی کوئی شورش نہیں ہوگی جو کوئی ایسا نہیں کرے گا اس سے ہم بری الذمہ ہوں گے، اس کا مال اور اس کی جان حلال ہوگی۔ جس عریف (چودھری) کے حلقے میں امیر المومنین کی حکومت کا کوئی ایسا قانونی مجرم پایا گیا جس کی رپورٹ نہیں کی گئی تو اس عریف کے دروازے پر ہی اسے پھانسی دی جائے گی، اس کے حلقے کا وظیفہ بند کر دیا جائے گا، اور عریف کو شہر بدری کی سزا دی جائے گی۔[1]

مسلم کی تبدیلئ مکان

مسلم کوفہ پہنچے تھے تو مختار بن ابی عُبید کے گھر اترے تھے۔[2] جب ابن زیاد کوفے پہنچا اور اس کی یہ سخت آگاہی حضرت مسلم کے کان تک پہنچی تو آپ نے جائے قیام تبدیل کر دی اور ہانی بن عُروہ نامی شخص کے مکان میں آ گئے۔[3]

ایک معمہ

ہماری جو تاریخ کی کتابیں ہیں وہ صرف روایات اور بیانات کا مجموعہ ہیں۔ ان

---

[1] تاریخ طبری ج ۶ صفحہ ۲۰۱ [2] ایضاً صفحہ ۱۹۹ [3] ایضاً صفحہ ۲۰۳

روایات میں بہت سے پہلو ایسے آجاتے ہیں جن پر کچھ گفتگو یا توضیح و توجیہہ کی ضرورت ہوتی ہے، یہ چیز ان کتابوں میں کہیں مشکل ہی سے اور وہ بھی بس نام کو ملتی ہے۔ مختار بن ابی عبید ہماری تاریخ کے اُس دور کا جس میں واقعۂ کربلا پیش آیا بڑا معروف نام اور ایک پُراسرار کردار ہے۔ یہ شخص واقعۂ کربلا کے پانچ سال بعد ایک بجلی کے کڑکے کی طرح مسلم خانہ جنگی کے میدان میں آیا اور بس سال بھر میں ایک قیامت بپا کے گذر گیا۔ یہ خونِ حسین کے انتقام کے نام پر اٹھا تھا اور واقعی کشتوں کے پشتے لگا دیئے۔ ابن زیاد اور عمرو بن سعد وغیرہ تمام قاتلانِ حسین اسی کے حصے میں آئے۔ اور اس کا تعلق بھی کوفے ہی سے تھا۔ اس لیے قدرتی طور پر خیال ہوتا ہے کہ یہ مختار بن ابی عُبید جس کے گھر پر مسلم بن عقیل ٹھہرے تھے یہ وہی مختار تو نہیں ہے؟۔ لیکن پھر خیال ہوتا ہے کہ یہ وہی مختار کیسے ہو سکتا ہے؟ اس نے تو حضرات حسنینؓ کے ساتھ بڑے ہی خراب کردار کا ثبوت دیا تھا جبکہ حضرت علیؓ کے بعد حضرت حسنؓ جانشین ہوئے تھے حضرت علیؓ کی شہادت ایسے وقت پیش آئی جبکہ آپ نے حضرت امیر معاویہ سے ایک فیصلہ کن جنگ کی تیاری کی ہوئی تھی۔ اُس چالیس ہزار کی فوج کو لے کر جو حضرت علیؓ نے تیار کی تھی حضرت حسنؓ روانہ ہوئے تو مدائن کے قریب پڑاؤ تھا کہ لشکر کے کچھ مفسد ایک افواہ کا بہانہ پاکر حضرت حسنؓ کے خیمہ ہی پر ٹوٹ پڑے، لوٹ مار مچائی، زخمی کر دیا۔ مدائن میں حضرت علیؓ کی طرف سے حاکم اس مختار کے چچا سعد بن مسعود ثقفی تھے۔ یہ واقعہ پیش آنے کے بعد حضرت حسنؓ مدائن میں ان کی قیام گاہ پر آگئے تو جیسا کہ تاریخ کا بیان ہے مختار نے خالص "کوفی" روایت کے مطابق چچا سے کہا کہ "چچا اگر دولت اور عزت کی ضرورت ہو تو انھیں باندھو اور معاویہ کے پاس پہنچا دو" چچا شریف تھے، انھوں نے کہا کہ تجھ پر خدا کی لعنت۔ ابن بنت رسول اللہ کے ساتھ میں یہ حرکت کروں گا۔[1]

---

[1] طبری ج ۲ صفحہ ۹۲ اس شخص کا کیرکٹر واقعتہً یہی تھا یعنی دولت و عزت کیلئے سب کچھ روا ہے۔ چنانچہ اولاً اس نے عبداللہ بن زبیر کے ساتھ اقتدار میں حصہ بنانے کی کوشش کی جبکہ وہ اموی حکومت سے برسرپیکار تھے (باقی آئندہ صفحہ پر

ایک اور معمہ

اس قصے کے علاوہ یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ جن لوگوں نے حضرت حسینؓ کو خطوط بھیجے تھے جن کے نتیجے میں مسلم بن عقیلؓ کو کوفہ بھیجا گیا تھا، ان کے ناموں میں کوئی نام مختار بن ابی عبید نہیں ہے۔ قاعدے سے تو مسلم کا قیام انہی لوگوں میں سے کسی کے گھر ہونا چاہیے تھا![1] اور پھر اسی طرح ہانی بن عروہ کا نام بھی ان ناموں میں نہیں ہے۔ تو مختار کے گھر سے منتقل ہوتے تب بھی اسی جیسے ایک کے گھر پہنچے! یہ آخر قصہ کیا ہے؟ ان آٹھ دس آدمیوں میں سے کسی کے گھر میں کیوں جگہ نہیں تھی جنھوں نے دعوتی خطوط لکھے تھے؟

مزید برآں

اور پھر بات اتنی ہی نہیں، ہانی بن عروہ کے گھر بالکل تن تنہا اور ایک قطعی ناخواندہ مہمان کی طرح پہنچتے ہیں۔ ابن جریر (طبری) ہوں یا ابن اثیر یا ابن خلدون سبھی لکھتے ہیں کہ:-

> "مسلم کے کان تک جب ابن زیاد کی تقریر پہنچی تو وہ مختار کے مکان سے نکل کر ہانی ابن عروہ کے مکان تک پہنچے، ہانی نکل کر آئے اور مسلم کو دروازے پر دیکھا تو بڑا برا منھ بنایا۔ مسلم نے کہا بھائی میرے تمہارے پاس پناہ کے لیے آیا ہوں، تمہارا مہمان ہونا چاہتا ہوں۔ ہانی نے جواب دیا، تم نے تو مجھے بڑی مصیبت میں ڈال دیا ہے، اگر میرے معاملے کے اندر نہ آ گئے ہوتے تو میں کہتا کہ مجھے معاف کرو۔ لیکن اب تو کچھ نہیں کہہ سکتا۔ آجاؤ"[2]

(بقیہ صفحہ گذشتہ) وہاں دال نہیں گلی تو حضرت حسینؓ کے نام پر خود ایک محاذ کھول دیا اور وہ وہ سوانگ بھرے اور جھوٹ بولے کہ اللہ کی پناہ۔ تفصیل کے لیے تاریخ دیکھیے۔

[1] ایک دوسری روایت یہ بھی ملتی ہے کہ ان کا قیام مسلم بن عوسجہ کے یہاں ہوا تھا۔ طبری ج ۶ ص ۱۹۲ مگر روایت مختار یہی ہے کہ قیام مختار کے یہاں فرمایا۔ "شہید انسانیت" کے مصنف جناب علی نقی صاحب نے بھی اسی روایت کو اختیار فرمایا ہے۔

[2] طبری ج ۶ ص ۲۰۶ ابن اثیر ج ۳ ص ۲۹۹ دار الفکر بیروت۔

کیا ہونا چاہیے تھا؟

مسلم بن عقیلؑ جیسا معزز مہمان جو حضرت حسینؑ کا قاصد ہی نہیں اُن کا بھائی بھی ہے جس کے آتے ہی شیعان علیؑ و حسینؑ کی سرگرم آمد و رفت اس کے پاس شروع ہو گئی تھی، اٹھارہ ہزار آدمی اس کے ہاتھ پر بیعت کر چکے تھے، وہ ابن زیاد کی دھمکی سن کر احتیاطاً اپنی جائے قیام بدلنے کا فیصلہ کرتا ہے تو اس فیصلے میں کوئی مقامی آدمی شریک تک نظر نہیں آتا! ایک غریب الدیار بے یار و مددگار کی طرح خود ہی منہ اٹھا کر کہیں کو چل دیتا ہے اور ایسے ناروا سلوک سے دوچار ہوتا ہے!

یہ چند در چند سوالات ہیں جن کا کوئی جواب ہمیں ابھی ان تاریخی کتابوں میں نہیں ملتا لیکن ان روایتوں کا تعلق کسی ایسی بات سے نہیں ہے جس کی وجہ سے کسی راوی کے متعلق جھوٹ کا گمان کیا جائے۔ البتہ یہ خیال ہوتا ہے کہ مختار کے گھر سے ان کا بے یار و مددگار حال میں ہانی کے گھر پہنچنا اور ہانی کے یہاں "ایک آفت و مصیبت" کہہ کر ان کا استقبال کیا جانا؛ ان میں سے کوئی ایک بات بھی اس کے لیے کافی تھی کہ کوفیوں کے بارے میں یہ فیصلہ کیا جاتا کہ یہ ہرگز ہرگز قابل اعتبار نہیں ہیں۔ اور اسی وقت کوفے سے نکل جانے کی کوئی تدبیر سوچی جاتی۔ یا کم از کم حضرت حسینؑ کو یہ صورت حال بتا دینے کی سعی کی جاتی جن کو اس سے پہلے بالکل مختلف صورت حال کی اطلاع کی جا چکی تھی۔

لیکن قضا و قدر کے فیصلے کون بدل سکتا ہے؟ جناب مسلم نے ان حالات میں بھی ہانی بن عروہ کے گھر میں پناہ گیری ہی قبول نہیں کر لی بلکہ بظاہر اپنے مشن کے بارے میں بھی اُن کی رائے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ وہ حضرت حسینؑ کو خط بھیج چکے تھے کہ فوراً آجائیے۔ یہاں حالات بالکل سازگار ہیں، بس آپ کے آنے کی دیر ہے۔ اپنی اس رائے میں تبدیلی انہوں نے اس وقت کی جب کہ وہ دشمن کے پنجے میں گرفتار ہو گئے[1] اور یہ ٹھیک وہ دن تھا جس دن حضرت

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۱۱

حسینؓ ان کے خط پر مکّے سے روانہ ہو رہے تھے۔ یعنی ۸ر ذی الحجہ سنہ ۶۰ھ جو تاریخی روایتوں میں مکّے سے حضرت حسینؓ کی کوفہ کو روانگی کا دن بتایا گیا ہے[1]

جناب مسلم کا انجام

کوفے کے ایسے ناوفادار اور طوطا چشم ماحول میں عبیداللہ بن زیاد جیسا چُست، چالاک اور سخت گیر منتظم پہنچ جائے تو مسلم بن عقیل جیسے ایک سادہ مزاج، پردیسی اور اجنبی کی کہاں خیر۔ اس نے ان کا پتہ نکال لیا کہ ہانی بن عروہ کے گھر پر مقیم ہیں۔ ہانی کے والد عُروہ پر عبیداللہ کے والد زیاد کا بڑا احسان تھا۔ زیاد نے سنہ ۵۰ھ میں حضرت مغیرہ بن شعبہ کے بعد کوفے کی گورنری سنبھالی تھی تو حضرت علیؓ کے حامی سرداروں کو سختی سے دبایا تھا لیکن عروہ کو جانے کیوں اس نے اپنے احسان و کرم کا نشانہ بنایا[2]۔ عروہ کے بیٹے ہانی کے ساتھ بھی اس نے یہی معاملہ رکھا اور اسی کے مطابق اپنے باپ کے بعد ابن زیاد نے معاملات رکھے۔ اس لیے اُس کو اس انکشاف سے بڑی چوٹ لگی کہ مسلم جو اس کے آقا یزید بن معاویہ کا تختہ اُلٹنے کی مہم پر آئے ہیں، ہانی کے گھر پر مقیم ہیں۔ اور وہی گھر ان کی خفیہ سرگرمیوں کا مرکز ہے۔ اس نے ہانی کو بلوایا جو بڑی مشکل سے آنے کو تیار ہوئے۔ ان کو در اصل ابن زیاد کے کوفے پہنچنے پر اور بحیثیت گورنر پہنچنے پر از خود ہی اس کے پاس آنا چاہیے تھا لیکن جناب مسلم کے قیام کی شرم ہی بظاہر دامن گیر تھی جو وہ ملنے نہیں آئے۔ اس چیز سے ابن زیاد کو اس اطلاع پر اور زیادہ بھروسہ ہوا ہوگا کہ مسلم بن عقیل ہانی کے گھر پر مقیم ہیں اور وہیں سے حضرت حسینؓ کی حمایت کے لیے بیعت کا سلسلہ چلایا جا رہا ہے اور اسی سے اس روایت کو تقویت ملتی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ جناب مسلم جب مختار کے گھر سے نکل کر ہانی کے گھر پناہ لینے پہنچے تو ہانی ان کو دیکھ کر اتنے پریشان ہوئے کہ اپنی پریشانی بے حجابانہ ظاہر کر ڈالی اور

---

[1] طبری ج ۷ ص ۱۷۲

[2] اسی سلوک کے لیے ایک دوسرا نام حُجر بن عدی کا بھی عروہ کے ساتھ لیا گیا ہے جن کا قصہ بعد میں کچھ اور ہوا۔

عربوں کی روایتِ مہمان نوازی بھی بھلا بیٹھے۔

بہرحال ہانی کسی طرح آ گئے تو ابن زیاد نے بہت ہی آڑے ہاتھوں لیا۔ اور اپنے اور اپنے باپ کے احسانات یاد دلا کر کہا کہ تمہارے گھر میں امیرالمومنین کی حکومت اور عامۃ المسلمین کے امن و امان کے خلاف فتنہ و فساد کی یہ کھچڑی پک رہی ہے! ہانی نے انکار کر دیا مگر یہ نہ چلا تو ایک بار پھر انہوں نے وہی کمزوری دکھائی جو جناب مسلم کو اپنے دروازے پر پا کر دکھائی تھی۔ کہا کہ واللہ میرا یقین کرو، میں انکو اپنے گھر نہیں لایا تھا ہاں وہ میرے دروازے پر آ کر کھڑے ہوئے تو میں انہیں دھتکار نہ سکا۔ تم مجھے موقع دو، میں ابھی جا کر انہیں رخصت کرتا ہوں کہ وہ جہاں چاہیں چلے جائیں۔ ابن زیاد نے کہا، یہ نہیں ہو سکتا۔ ہاں تم اس کام کے لیے جا سکتے ہو کہ انہیں میرے پاس لے کر آؤ۔

شکر ہے کہ ہانی کو اس مرحلے پر اپنے مہمان اور پناہ گیر کا حق یاد آ گیا اور وہ ابن زیاد کی یہ فرمائش پوری کرنے کو تیار نہیں ہوئے۔ نتیجۃً ان کے ساتھ سختی کا معاملہ ہوا اور اس کی خبر کچھ مبالغے کے ساتھ جیسا کہ ایسے موقعوں پر ہوتا ہے، ہانی کے گھر پہنچی تو عورتوں کی آہ و فغاں نے مسلم بن عقیل کو مجبور کیا کہ وہ اپنے محسن کو ابن زیاد کے پنجے سے نکالنے کی تدبیر کریں۔ انکی سمجھ میں جو تدبیر آئی وہ یہ تھی کہ جن لوگوں سے انہوں نے حضرت حسینؓ کے لیے جاں نثاری کی بیعت لی تھی، جن کی تعداد عام طور سے اٹھارہ ہزار بتائی گئی ہے، ان کی طلبی کیلئے مقررہ نعرہ بلند کرائیں اور انہیں لے کر دارالامارۃ ــــ گورنر ہاؤس ــــ پر حملہ کر دیں۔ اس نعرہ پر عام روایتوں کے مطابق چار ہزار آدمی اسی وقت جمع ہو گئے۔ اور جناب مسلم کی سرکردگی میں دارالامارۃ پر جا پہنچے۔

حملے کی پسپائی اور مسلم بن عقیلؓ کی بے کسی

مگر یہ چار ہزار بہرحال کوئی ہی تھے، ابن زیاد نے صرف حسن تدبیر سے یہ ساری

جمعیت آناً فاناً منتشر کردی۔ سرداران قبائل جو خواستہ یا ناخواستہ گورنر کے دباؤ میں رہتے تھے کچھ اس فوج کے سامنے آگئے کہ خود بھگائیں یا کچھ اپنے قبیلوں میں چلے گئے کہ ان لوگوں کی ماؤں بہنوں کو باہر بھیج دیں جو انہیں سمجھا کر لے جائیں۔ بہرحال تھوڑی دیر میں بھیڑ چھٹ گئی اور جو کچھ رہ گئے تھے وہ بھی رات کے اندھیرے میں اضافے کے ساتھ کم ہوتے ہوتے جناب مسلم کو بالکل اکیلا چھوڑ گئے کہ وہ خود ہی اپنے لیے جو کچھ کر سکتے ہوں کریں۔

رات کو تو، روایت کے مطابق کہیں پناہ مل گئی مگر دن کا اُجالا ہونے پر ان کا پتہ نشان ابن زیاد تک پہنچ گیا اور اُس نے انہیں ایک فتنہ جو اور مفسد قرار دیکر سر قلم کرا دیا اور پھر یہی انجام ہانی بن عروہ کا بھی کرایا۔ یہ واقعہ ۹ ذی الحجہ کا بتایا گیا ہے[1]

---

[1] جناب مسلم اور ہانی کا یہ پورا قصہ کچھ اور زیادہ تفصیلات کے ساتھ طبری ج ۶ میں ص ۲۰۵ سے ۲۱۱ تک بیان ہوا ہے

بابِ نہم

قافلۂ حسینؑ اپنی آخری منزل کی طرف

مسلم بن عقیلؑ جب ۸؍ ذی الحجہ سنہ ۶۰ھ کی صبح گرفتار کیے گئے تو جو صاحب اُن کی گرفتاری کے لیے فورس (FORCE) لے کر آئے تھے[1] یہ محمد بن اشعث کہلاتے تھے اور جناب مسلمؑ کے گھرانے کے لیے اجنبی نہ تھے۔ ان کے والد اشعث بن قیس حضرت علیؑ کے بہت نمایاں ساتھیوں میں تھے۔ لیکن جنگ صفین کی خونریزی دیکھ کر حضرت علیؑ کے بہت سے ساتھیوں میں جو ایک برگشتگی آئی یہ اس میں بہت نمایاں ہوئے اور تحکیم کے لیے حضرت علیؑ کی طرف سے بادلِ ناخواستہ حضرت ابوموسیٰ اشعری کی نامزدگی زیادہ تر انہی کے دباؤ کا نتیجہ تھی۔ کیونکہ حضرت ابوموسیٰ کا جو رویہ اس خانہ جنگی کے بارے میں شروع ہی سے رہا تھا اُس کی بنا پر ان کے بارے میں یہ یقینی تھا کہ وہ ہر قیمت پر آئندہ جنگ کا سدِ باب ہی کریں گے۔ یہ محمد بن اشعث اُس مجلسِ خواص کے شرکا میں بتائے گئے ہیں جو مسلم بن عقیلؑ کی کوفے میں آمد پر دارِ مختار میں پہلے دن ہوئی۔ لیکن ان کے بارے میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جبکہ اور شرکا تن من دھن سے جناب مسلمؑ کے مشن میں تعاون کی پُرجوش یقین دہانی کر رہے تھے یہ بالکل خاموش رہے تھے۔ اور پوچھے جانے پر کہا تھا کہ میں دل سے آپ لوگوں کی تمناؤں میں شریک ہوں مگر قتل

---

[1] مشہور روایات کے مطابق اس گرفتاری کے لیے بڑی فورس بھیجی گئی تھی اور بڑا معرکہ رہا، مگر طبری کی ص ۲۱۳ کی ایک روایت کے مطابق ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔

قتال کا معاملہ ہو تو اس میں شرکت کا روادار نہیں[1]

بہر حال جب ابن زیاد کے صریح اور محکم عزم کے آگے وہ لوگ بھی اپنا قبلہ بدلنے پر تیار ہو گئے جنھوں نے حضرت حسینؓ کو کوفے کی دعوت بھیجی تھی[2] تو محمد بن اشعث تو پہلے ہی کنارے پر کھڑے تھے انھیں حکم ہوا تو مسلم بن عقیلؓ کی گرفتاری کا فریضہ طوعاً کرہاً انھیں ادا کرنا کیوں کچھ زیادہ مشکل ہوتا؟

روایت میں ہے کہ گرفتاری کے بعد لے جائے جا رہے تھے تو رونے لگے، محمد بن اشعث کو تعجب ہوا کہ اتنے بڑے مشن کا آدمی رو رہا ہے، جواب دیا کہ رونا اپنے لیے نہیں ہے، حسینؓ اور ان کے قافلے کے لیے ہے جو آج ہی میرے خط کی بنا پر مکے سے چل رہے ہوں گے۔ تم اگر احسان کر سکو تو اتنا کر دینا کہ انھیں میرے واقعے کی اطلاع کرا دو تاکہ وہ اب ادھر کا ارادہ ختم کر دیں۔ روایت کے مطابق محمد بن اشعث نے اس کا وعدہ کر لیا تھا لیکن ظاہر ہے کہ اس پیغام کو پہنچنے میں تو ابھی کافی وقت لگنا تھا۔[3]

حج سے ایک دن پہلے روانگی

سیدنا حسینؓ جو آثار و قرائن کی روشنی میں بظاہر کوفے ہی کا خیال لے کر مدینے سے نکلے تھے وسط رمضان میں مسلم بن عقیلؓ (چچیرے بھائی) کو کوفہ بھیجنے کے بعد منتظر تھے کہ وہاں سے مناسب حالات کی خبر آئے تو اپنی منزل کی طرف روانہ ہوں، غالباً ذوالقعدہ میں یہ خبر آ گئی[4] آپ نے

---

[1] طبری ج ۲ صـ ۱۹۹۔ [2] شبث بن ربعی اور حجار بن ابجر عجلی وغیرہ ملاحظہ ہو طبری ج ۲ صـ ۱۹۵ اور صـ ۲۰۰۔

[3] یہ خط حضرت حسینؓ کو راستے میں آخر ذی الحجہ یا شروع محرم میں ملا جبکہ کوفہ قریب رہ گیا تھا۔ یہ اس بنا پر کہا جا رہا ہے کہ سفر کی جس منزل پر اس خط کے ملنے کا ذکر روداد سفر میں آگے آ رہا ہے اس منزل پر آپ کے پہنچنے کا وقت حساب سے یہی بنتا ہے۔ [4] اس خط کے پہنچنے کی تاریخ بتانے والا کوئی بیان ہماری نظر سے سوائے البدایہ والنہایہ کے کہیں نہیں گزرا۔ ج ۸ صـ ۱۷۱ پہ ہے کہ و کان کتاب مسلم قد وصل الیہ قبل ان یقتل بسبع و عشرین لیلۃ۔ لیکن اس میں اشکال یہ ہے کہ خط کے قتل سے (بقیہ صفحہ آئندہ پر)

مقدوری تیاری کی اور ٹھیک حج سے ایک دن پہلے یعنی ۸ ذی الحجہ کو جو کہ "یوم الترویہ" کہلاتا ہے اور حجاج کے قافلے اس دن مکے سے منیٰ کو روانہ ہوتے ہیں۔ آپ اپنے قافلے کے ساتھ کوفے کی سمت روانہ ہو گئے اور جیسا کہ ابھی گزرا یہ وہی دن تھا جب کوفے میں مسلم بن عقیلؓ اہلِ کوفہ کی روایتی غداری کا شکار ہو کر زیاد کے ہاتھوں گرفتار ہو رہے تھے۔

خیر خواہ ایک بار پھر روکتے ہیں

حضرت محمد بن حنفیہ، عبداللہ بن مطیع اور عبداللہ بن عمرؓ کی کوشش کا ذکر پہلے آ چکا ہے کہ ہر ایک نے کوفے کے ارادے سے باز رہنے کی ہر ممکن فہمائش اور درخواست کی مگر جیسے کہ تقدیرِ الٰہی میں ایک بات طے ہو چکی ہو، کسی کی بات مؤثر نہ ہوئی۔ آپ نے اہلِ کوفہ کی دعوت کو مشروط طور سے قبول کر کے مسلم بن عقیلؓ کو حالات کی تصدیق کے لیے وہاں بھیجا۔ اور ان کی تصدیق آتے ہی روانگی کا عزم کر لیا۔ اس عزم کی اطلاع دوسرے لوگوں کو کس طرح ہوئی اس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ شاید سفر کی تیاریاں اور کچھ دوسری علامات قرینہ بن گئیں۔ بہرحال اس آخری موقع پر کچھ اور لوگ بھی روکنے کے لیے سامنے آئے۔

۱۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ

حضرت عبداللہ بن عباس بزرگِ خاندان تھے۔ انھیں کے آبائی مکان میں آپ ٹھیرے ہوئے بھی تھے۔ انھیں ارادۂ سفر کی اطلاع نہ ہونے کا سوال ہی کیا۔ علاوہ ازیں ایک روایت یہ بھی ہے کہ یزید نے حضرت حسینؓ کے مکہ آ جانے پر حضرت ابن عباسؓ کو بزرگِ خاندان کی

(حاشیہ صفحہ گزشتہ) بقیہ

۶، ۷ دن پہلے پیچھے کی بات کہی جا رہی ہے اور بظاہر عبارت قتل سے قتل حسین مفہوم ہوتا ہے۔ اور یہ مانا جائے گا کہ گویا ۱۳ ذی الحجہ کو خط ملا۔ حالانکہ روانگی کی روایت ۸ ذی الحجہ کی ہے اور اس پر یہ مسلم ہے کہ خط ملنے کے بعد ہی روانگی ہوئی تھی۔ البتہ قتل سے قتل مسلم مراد لے لیں تو کسی درجہ میں بات بن جائے گی۔

حیثیت سے لکھا بھی تھا کہ آپ انھیں سمجھائیں کہ وہ جو کچھ سوچ رہے ہیں وہ مناسب نہیں ہے۔ البدایہ والنہایہ ج ۸ میں صفحہ ۱۶۳ پر اس خط کا اور اس کے جواب کا تذکرہ خلاصۂ مضمون کے ساتھ ہے[1]۔ جواب کا خلاصہ یہ دیا گیا ہے کہ :-

انی لأرجوا ان لا یکون خروج	مجھے امید ہے کہ حسین کا مدینے سے
بالحسین لامر تکرهه ولست	نکلنا کسی ایسی بات کے قصد سے نہیں ہوا
أدع النصیحة له فی کل ما تجتمع	ہوگا جو تمہارے لیے باعث تکلیف ہو اور
به الالفة وتطفی بها النائرة۔	میں (پھر بھی) کوئی دقیقہ انھیں اس بات
	کے سمجھانے میں نہیں چھوڑوں گا جس سے
	ہم لوگوں کی الفت باہمی برقرار رہے اور
	فتنہ دبے[2]

اس خلاصۂ جواب کے بعد بتایا گیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ حضرت حسینؓ کے پاس آئے اور بڑی دیر تک گفتگو کی جس میں آپ نے کہا کہ "خدا کے لیے عراق کا ارادہ نہ کرو اور اپنی جان کھونے کو وہاں نہ جاؤ اور نہیں تو کم از کم اتنی بات مانو کہ موسم حج گزر جانے دو، حج میں آنے والے لوگوں سے مل کر وہاں کے حالات کا اندازہ کرو اور پھر طے کرو جو کچھ طے کرنا ہو۔" اس گفتگو کا جملہ ہے کہ "یہ واقعہ عشرۂ ذی الحجہ کا ہے" یعنی بالکل اس وقت کا جبکہ روانگی ہونے والی تھی۔

حضرت ابن عباسؓ کی مذکورہ گفتگو کو اگر ہم یزید کی اور آپ کی خط و کتابت کا نتیجہ سمجھیں جیسا کہ البدایہ کی طرز تحریر سے ظاہر ہوتا ہے تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ یزید نے حضرت ابن عباسؓ کو بالکل آخری مرحلہ میں لکھا جبکہ ذی الحجہ کا مہینہ شروع ہو چکا تھا اور حضرت حسینؓ روانگی کی تیاری کر رہے تھے۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ یہ گفتگو اگرچہ البدایہ والنہایہ میں اس

---

[1] دونوں کا تفصیلی متن حیاۃ الامام الحسین بن علی از باقر شریف القرشی جلد ثانی میں ہمارے سامنے ہے۔

[2] اس جواب ہی سے یزید کے خط اور اس کی اسپرٹ کا اندازہ ہو جاتا ہے یعنی [illegible] البدایہ ج ۸ ص ۱۶۳

طرح درج کی گئی ہے جیسے کہ اوپر کی خط و کتابت کا نتیجہ ہو لیکن واقعہ میں یہ گفتگو اس سے الگ بالکل آخری مرحلے کی ہو۔ جبکہ یزید کا خط بظاہر اُس مرحلے میں آیا ہوگا جب حضرت حسینؓ کے مکے آنے کے بعد وہاں کوفیوں کی آمد شروع ہوئی اور مسلم بن عقیل کوفے بھیج گئے۔ ہمارے نزدیک قرین قیاس یہی بات ہے۔ یعنی یہ مذکورہ بالا گفتگو دوسری بار کی ہے ورنہ اصل گفتگو آپ نے خط آنے کے فوراً بعد ہی کی ہوگی۔ ہوسکتا ہے کہ اس وقت جو گفتگو حضرت ابن عباس اور حضرت حسین کے درمیان ہوئی وہ ریکارڈ میں نہ آئی ہو۔ البتہ جب حضرت حسین کوفے کے قصد پر مُصر رہ کر پابرکابی کے مرحلے میں داخل ہو گئے ہوں تب حضرت ابن عباسؓ نے ایک بار پھر انھیں سمجھانے کی کوشش کی ہو اور وہ روایت ہو کر ابن کثیر تک پہنچی ہو۔ بہر حال آگے روایت کا بیان یہ ہے کہ حضرت حسین نے حضرت ابن عباس کا مشورہ قبول نہیں فرمایا فابی الحسین إلّا ان یمضی الی العراق (حسین عراق جانے کے ارادے پر مُصر ہی رہے) فقال لہ ابن عباس (اس پر حضرت ابن عباس نے ان سے فرمایا:-

واللہ انی لاظنک ستُقتل	واللہ مجھے لگتا ہے کہ تم کل اپنی بیویوں
غداً بین نسائک وبناتک	اور بیٹیوں کے درمیان اسی طرح قتل
کما قُتِل عثمان بین نسائہ	کیے جاؤ جیسے عثمان اپنی بیویوں اور
وبناتہ واللہ انی لاخافُ	بیٹیوں کے درمیان قتل ہوئے تھے
ان تکون انت الذی یقادبہ	واللہ مجھے تو یہ بھی خوف ہے کہ تم قصاص
عثمان فانا للہ وانا الیہ	عثمان میں قتل کیے جانے والے بنوگے پس
راجعون	(تم نہیں مانتے تو) انا للہ وانا الیہ راجعون۔[1]

لیکن حضرت حسین کے لیے یہ مکرر تفہیم بھی کچھ مؤثر نہ ہوسکی بلکہ جیسا کہ آگے روایت میں ہے

---

[1] طبری کی روایت میں یہ آخری جملہ نہیں ہے اور حضرت ابن عباس کی زبان کے ساتھ اس جملے کا جوڑ قابل یقین بھی نہیں ہے۔ یزید کے بارے میں ان کے اس طرح کے خیالات ہونگے کہیں ثبوت نہیں ملتا۔ [2] البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۶۰

آپ نے اس اندازِ تفہیم پر ایک گونہ ناگواری کا اظہار فرمایا۔

۲۔ **ابوبکر بن عبدالرحمن**[1]: یہ مدینہ کے مشہور فقہائے سبعہ میں سے تھے۔ ان کے والد عبدالرحمن بن الحرث بن الہشام بن المغیرہ المخزومی القرشی خود بڑے صاحبِ فضائل تھے۔ غالباً حج کو آئے ہوئے تھے کہ حضرت حسین کے قصدِ کوفہ کا چرچا سنا تو از راہِ خلوص و محبت حاضرِ خدمت ہوئے۔ اور حسبِ روایت طبری[2] عرض کیا کہ:۔

> "آپ ایک ایسے ملک کا ارادہ فرما رہے ہیں جو خالی نہیں پڑا ہوا ہے بلکہ وہاں اس کے امراء و حکام موجود ہیں جن کے ہاتھ میں خزانے ہیں اور لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ روپے پیسے کے بندے ہیں۔ پس وہی لوگ جنھوں نے آپ کی مدد کا وعدہ کیا ہے وہ آپ کے خلاف لڑنے کو آ جائیں گے۔" الخ

مسعودی کی روایت میں ان کا پیرایۂ بیان کچھ اور زیادہ مؤثر ہے۔ فرمایا کہ:۔

> "دیکھیے آپ کے والد ماجد آپ سے زیادہ حوصلہ اور طاقت رکھتے تھے۔ لوگ ان کی بات سنتے بھی زیادہ تھے۔ اہل شام کو چھوڑ کر باقی سب ان کی شخصیت پر جمع ہو گئے تھے۔ وہ ان کو لیکر معاویہ کے مقابلے پر چلے۔ معاویہ کی ان کے مقابلے میں کچھ حیثیت نہ تھی۔ مگر پھر بھی لوگ دنیا اور دنیوی زندگی کی محبت میں اُن کا حق بھول گئے۔ انھیں خون رُلایا حتیٰ کہ اسی حالت میں وہ دنیا سے رخصت ہو گئے۔ پھر جو کچھ ان لوگوں نے آپ کے بھائی کے ساتھ کیا وہ سب بھی آپ جانتے ہیں۔ اور پھر ابھی غداروں کا بھروسہ کر کے آپ اُن لوگوں سے لڑنے جا رہے ہیں جو آپکے مقابلے میں زیادہ قوی اور تیار ہیں لوگ ان سے امیدیں بھی زیادہ کر سکتے ہیں اور ڈرتے بھی زیادہ ہیں[3]۔"

---

[1] ان کا نام مورخ مسعودی کے سوا اور لوگوں نے عمر بن عبدالرحمن لکھا ہے مگر صحیح نام ابوبکر ہی معلوم ہوتا ہے۔ اصابہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ ملاحظہ ہو الاصابہ لابن حجر ج ۴ ص ۲۶۔ [2] جز ۶ ص ۲۱۶۔

[3] مروج الذہب دار الاندلس بیروت ج ۳ ص ۵۶

۳۔ کچھ اور مخلصین ۔ اسی طرح اور کئی نام آتے ہیں جن کا تعلق مخلصین کے گروہ سے تھا کہ انہوں نے یا اس عنوان سے کوفے کے قصد کی مخالفت کی کہ کوفی بالکل ناقابلِ اعتبار ہیں اور حالات ناسازگار یا اس عنوان سے کی کہ اس اقدامِ خروج کا کوئی جواز نہیں ہے۔ ابن کثیر نے ایک ہی جگہ یہ نام اور ان کے اقوال جمع کر دیئے ہیں[1]۔ حضرت ابو سعید الخدری، جابر بن عبداللہؓ، واثلہ بن واقد اللیثی اور مسور بن مخرمہ سب اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، اور یہ سب مخلصین حضرت علیؓ ہی سے تھے۔ حضرت ابو سعید خدری کے متعلق بتایا گیا ہے کہ آپ نے فرمایا:۔

> "اپنی جان کے بارے میں اللہ سے ڈریئے اپنے گھر ہی میں رہیے اور اپنے امام پر خروج مت کیجئے۔"

حضرت جابر بن عبداللہؓ نے فرمایا:۔

> "اللہ سے ڈریئے اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے مت ٹکرائیے۔"

واثلہ بن واقد اللیثیؓ نے فرمایا کہ:۔

> "آپ کا خروج بجا نہیں ہے آپ صرف اپنی جان دینے جا رہے ہیں اس سے باز رہیے۔"

مسور بن مخرمہ نے لکھا کہ

> "اہلِ عراق کے خطوط سے دھوکہ میں نہ آئیے اور نہ ابن زبیر کے اس قول سے کہ وہ لوگ آپ کی مدد کریں گے۔"

لیکن سب ہی کی خواہشیں، منتیں اور دلیلیں ناکام ہو گئیں اور حضرت حسینؓ ۸ ذی الحجہ کو دوپہر کے وقت جبکہ حجاج منیٰ کے لیے روانہ ہوئے عمرہ کے ارکان ادا کر کے کوفے کی سمت روانہ ہو گئے[2] گویا آپ نے احرام باندھا ہوا تھا مگر وہ احرام حج کا نہیں عمرے کا تھا۔

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۶۳۔

[2] طبری ج ۶ ص ۲۱۷۔ اپنے عزم و ولولے پر حضرت حسینؓ کی اس درجہ پختگی بھی ایک حل طلب سوال ہے وہ تحریر سامنے نہیں لیکن یاد آتا ہے کہیں یہ روایت نظر سے گزری ہے کہ آپ نے کہا (بقیہ صفحہ آئندہ پر)

عبداللہ بن جعفر کی سعی

حضرت کے عم زاد عبداللہ بن جعفرؓ حجاز کی بڑی اہم شخصیت تھے۔ عم زاد ہونے کے علاوہ حضرت کی ہمشیرہ حضرت زینب کبریٰ کے شوہر بھی تھے۔ قیام مدینے میں رہتا تھا۔ غالبًا حج کے لیے آئے ہوں گے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ حضرت حسینؓ کی روانگی سے پہلے اُن کی کسی ملاقات کا ذکر کیوں نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے حضرت حسینؓ کے اس رُخ سے جو وہ یزید کے سلسلے میں اختیار کر رہے تھے، ناخوش ہوں، کیونکہ وہ حضرت معاویہ کے زمانے سے اس خاندان کے ساتھ بہتر تعلقات رکھتے آئے تھے۔ جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ کا بھی معاملہ تھا۔ اور عمر میں حضرت حسینؓ سے بڑے بھی تھے، بہرحال جو بھی وجہ ہو۔ روایت ہے کہ ان کو اطلاع ملی کہ حسینؓ روانہ ہو گئے تو وہ اپنے دو بیٹوں کو حضرت حسینؓ کے تعاقب میں روانہ کر کے کہ ذرا آگے بڑھ کر ان سے کہو کہ اول تو لوٹ آئیں ورنہ کم از کم ذرا سا ٹھہریں، میں آ رہا ہوں، اور یہ کہہ کر وہ خود سعید سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) خواب دیکھا تھا جس میں اس ارادے کے لیے تائیدی اشارہ پایا جاتا تھا۔ پس گویا یہ اسی خواب کا اثر تھا کہ آپ اس ارادے پر نظرِ ثانی کے لیے تیار نہ تھے۔ مگر جب ہم آگے چل کر دیکھتے ہیں کہ آپ اس ارادے کو فسخ کر کے درمیان راہ سے واپسی پر بھی تیار ہو گئے تھے مگر تقدیرِ الٰہی مساعد نہ ہوئی اور واپسی ممکن نہ ہو سکی۔ تو یہ روایت کچھ معتبر نہیں رہتی اور اس کے بعد جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ تاریخی بیانات کی روشنی میں، جن میں سے کچھ اس کتاب کے پچھلے ابواب میں مذکور بھی ہوئے ہیں، آپ کے خیالات کے مطابق حضرت معاویہ کا دور بھی محض حالات کی مجبوری سے قبول کیا جانے والا دور تھا نہ کہ خوشی سے۔ اور پھر جب آخر میں یزید کی ولیعہدی کا مسئلہ سامنے آ گیا تب تو روایات کی رو سے یہ سوال بھی آپ کے سامنے آنے لگا تھا کہ "میں معاویہ کے خلاف جہاد نہ کر کے اللہ کو کیا جواب دے سکوں گا"۔ پس گمان یہ ہوتا ہے (بلکہ اس کا بھی روایتوں سے تقریباً ثبوت نکلتا ہے) کہ یزید کی ولیعہدی کا عمل میں آ جانے کے بعد گویا آپ نے طے کر لیا تھا کہ اگر ان کی خلافت کی نوبت بھی آتی ہے تو پھر بشرطِ حالات آپ اس خلافت کو الٹ دینے کی کوشش میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کریں گے۔ لگتا ہے یہی تہیہ تھا جسے آپ ایک دینی تقاضا سمجھتے تھے اور اس لیے اس وقت تک اس میں کسی تبدیلی کے روادار نہ ہوئے جب تک ایسے حالات سامنے نہ آ گئے کہ ان میں آپ نے اپنے لیے عنداللہ عذر سمجھا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

والیٔ حرمین عمرو بن سعید کے پاس گئے کہ دیکھو حسین چلے گئے ہیں تم مجھے ایک خط اُن کیلئے لکھ دو کہ وہ لوٹ آئیں اور یہ کہ تم ان کے ساتھ حسنِ سلوک اور صلہ رحمی سے پیش آؤ گے۔ کسی طرح کی کاروائی اُن کے خلاف نہیں ہوگی۔ روایت کہتی ہے کہ عمرو نے عبداللہ بن جعفر سے کہا کہ تم خود خط لکھ لو اور مجھ سے دستخط کرا لو۔ چنانچہ یہی ہوا۔ پھر ابن جعفر نے کہا کہ مزید اطمینان کے لیے اپنے بھائی یحییٰ کو میرے ساتھ کر دو اور یہ خط تمہاری طرف سے وہی حسین کو دیں۔ چنانچہ یہ بھی ہوا۔ یہ دونوں صاحبان حضرت حسین کے پاس پہنچے۔ مگر دوسرے تمام لوگوں کی طرح ناکام ہی رہے[1]

والیٔ حرمین کی طرف سے بجبر روکے جانے کی روایت

عبداللہ بن جعفر اور والیٔ حرمین عمرو بن سعید کے بارے میں جو روایت ابھی مذکور ہوئی اس کی روشنی میں طبری ہی کی یہ دوسری روایت کسی طرح قابلِ اعتبار نظر نہیں آتی کہ جیسے ہی قافلہ مکے سے نکلا حاکمِ مکہ عمرو بن سعید کے فرستادے ان کے بھائی یحییٰ بن سعید کی قیادت میں ان کا راستہ روکنے اور بجبر مکہ واپس لانے کے لیے پہنچے۔ مگر یہ لوگ کامیاب نہیں ہو سکے تھوڑی سی زور آزمائی اور مار پیٹ کے بعد یہ فرستادے نامراد لوٹنے پر مجبور ہوئے[2]۔ دونوں روایتوں میں اتنا تضاد ہے کہ کوئی ایک ہی ٹھیک ہو سکتی ہے۔ دونوں بیک وقت نہیں ہو سکتیں۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ دوسری والی روایت پہلی والی روایت میں مذکور واقعہ ہی کی بگڑی ہوئی شکل ہے اور کچھ نہیں۔ ویسے بھی کیا تک تھا کہ جس حاکم نے سوا چار مہینے حضرت حسین سے پلٹ کر نہیں پوچھا کہ آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟ جبکہ اُسے معلوم تھا کہ آپ نے مدینہ کیوں چھوڑا ہے۔ رمضان تک تو وہ خالی حاکمِ مکہ ہی تھا۔ رمضان میں مدینے کی حکومت بھی اس کے سپرد کر دی گئی تھی۔ اور اس سپردگی کے ساتھ ہی اس نے عبداللہ بن زبیر کے

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۱۹-۲۰ [2] ایضاً ص ۲۱۸-۱۹

غلات ـــــ جو حضرت حسین ہی کے ساتھ مکے میں آئے تھے ـــــ گرفتاری کے لیے کاروائی بھی شروع کر دی تھی۔[1] اس کے برخلاف کوئی ایک بھی روایت نہیں ملتی کہ اُس نے حضرت حسین کو چھیڑا ہو' ان کے معاملات میں کسی طرح کا دخل دیا ہو۔ حالانکہ اہلِ کوفہ کے وفود ان کے پاس آ رہے تھے' اُن کے فرستادے کوتے جا رہے تھے' وہ سفر کی تیاریاں کر رہے تھے۔ تقریباً اسّی نوّے آدمیوں کا قافلہ جانے کو تھا اس کی تیاریاں دو چار دن پہلے سے تو بالکل صاف نظر آنے ہی لگی ہوں گی۔ اب اس تمام مدت میں تو حاکم مکہ ان سے تعرض نہیں کرتا۔ مگر جب وہ مکہ سے نکل جاتے ہیں تو اُن کی پکڑ کو آدمی دوڑاتا ہے۔ کوئی تُک کی بات تو نہیں۔

نیز خود اس روایت کا ایک دوسرا جزو بجائے خود اس بات کی دلیل بن سکتا ہے کہ حاکم مکہ کی طرف سے تعاقب کی کہانی درست نہیں ہے۔ وہ دوسرا جزو یہ ہے کہ قافلہ حاکم مکہ کے فرستادوں کو پسپا کر کے آگے بڑھا تو ایک قافلہ ملا جو یمن سے سالانہ معمول کے مطابق دارالخلافہ دمشق کے لیے بہت سے قیمتی سامان لیے جا رہا تھا' حضرت حسین نے اس پر قبضہ کر لیا اور شتربانوں سے کہا کہ تم میں سے جو چاہے یہاں سے لوٹ جائے اور جو چاہے ہمارے ساتھ کوفے تک چلے ہم دونوں کو معاوضہ دیں گے ـــــ ہمارا خیال یہ ہے کہ روایت کے دونوں جزوں میں سے کوئی ایک ہی ٹھیک ہو سکتا ہے' ورنہ کیسے یہ بات قابلِ تصور ہے کہ ابھی حاکم مکہ کے آدمیوں سے ٹکراؤ ہوا تھا جس کے بعد پورا اندیشہ ہو جانا چاہیے تھا کہ شاید وہ مزید کمک لے کے آتے ہوں اور ابھی ایک ایسا کام کیا جانے لگا (یعنی سرکاری قافلے کے اموال پر قبضہ کرنا) کہ پسپا شدہ لوگ کسی کمک کے ساتھ دوبارہ نہ بھی آتے ہوں تو اس نئے واقعہ کے بعد حاکم پر بالکل فرض ہو جاتا ہے کہ وہ سرکاری مال کی بازیابی اور شتربانوں کی امداد کے لیے کوئی مؤثر کاروائی کرے۔ اور جب روایت میں یہ بھی ہے کہ جن شتربانوں نے آگے جانا قبول نہیں کیا ان کا بے باق حساب کر دیا گیا۔[2] تب تو حاکم مکہ کو واقعہ کی فوری اطلاع ہونے کا بھی سامان ہو گیا تھا اور

---

[1] طبری ج ۶ ص ۱۹۲-۹۳

[2] طبری ج ۶ ص ۲۱۸

کسی کارروائی کا اندیشہ نہ ہونے کا سوال ہی نہ تھا۔ بہرحال روایت کے دونوں اجزاء میں سے ایک ضرور غلط ہے اور اس صورتِ حال کے نتیجہ میں یہ بھی سوچا جا سکتا ہے کہ دونوں ہی غلط ہوں[1]۔

نوٹ کرنے کی بات

بہرحال نہ صرف یہ کہ جبر و اکراہ والی یہ روایت کسی طرح قابلِ قبول نظر نہیں آتی۔ بلکہ یہ بات بھی نوٹ کی جانی چاہیے کہ جس طرح حاکمِ مدینہ ولید بن عتبہ بن ابی سفیان نے حضرت حسینؓ کے ساتھ قاعدہ و قانون کے بجائے لحاظ و احترام کا معاملہ کیا۔ اور حضرت عبداللہ بن زبیر کے برخلاف آپ کو بالکل آپ کے حال پر چھوڑ دیا۔ اسی طرح حاکمِ مکہ ــــ اور بعد میں حاکمِ حرمین ــــ عمرو بن سعید بن العاص ــــ المعروف اشدق ــــ نے آپ کے ساتھ یہی معاملہ رکھا۔ کوئی تعرض آپ سے نہیں کیا اور کیا تو وہ بھلائی کا معاملہ کیا جو عبداللہ بن جعفرؓ نے ان سے چاہا تھا۔ ہمارے خیال میں یزید کے بارے میں حضرت حسینؓ کے سخت مخالفانہ رویے کی روشنی میں یہ بات نہیں سوچی جا سکتی کہ مقامی حکام احترام، نرمی اور چشم پوشی کا یہ معاملہ مرکزی حکومت اور دارالخلافہ دمشق کی مرضی کے بغیر کر رہے ہوں۔ لازماً یہ رویہ یزید کے ایماء پر ہونا چاہیے اور حضرت عبداللہ بن عباس کے نام کے خط سے بھی جس کا اوپر تذکرہ ہوا یہی ظاہر ہوتا ہے کہ یزید کی طرف سے حضرت حسینؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیر کے معاملہ میں ویسا فرق تھا جس فرق کی حضرت معاویہ نے اُسے وصیت کی تھی[2]۔

---

[1] شہیدِ انسانیت کے مصنف جناب علی نقی صاحب نے اسی اشکال یا کسی دوسرے اشکال سے بچنے کی راہ یہ اختیار فرمائی ہے کہ قافلہ کو محض ایک قافلہ بتایا ہے کہیں کا سرکاری قافلہ نہیں بتایا۔

[2] شیعہ مصنفین نے مدینے سے حضرت حسینؓ کے خفیہ کوچ کا بدیہی جواز ثابت کرنے کے لیے اور اسی طرح مکہ سے قبل از حج کوچ کے لیے عجیب عجیب الزامات حکامِ مکہ و مدینہ اور حکومتِ دمشق پر لگا دیے ہیں مگر سب بے بنیاد اور محض افتراء ہیں۔ چنانچہ ان کے لیے کوئی حوالہ نہیں دیا گیا ہے (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ذی الحجہ کی ۸ ر یا ۱۰ ر

محمود احمد عباسی مرحوم نے اپنی کتاب (خلافت معاویہ و یزید) میں ایک خاص بحث یہ کی ہے کہ حضرت حسینؓ کے قافلے کا سفر ۸ ر ذی الحجہ کو حج سے پہلے شروع ہوا تھا یا ۱۰ ر کو؟ وہ کہتے ہیں کہ ۸ ر کی جو روایت عام طور پر مؤرخین کے یہاں پائی جاتی ہے وہ صحیح نہیں ہے صحیح ۱۰ ر ذی الحجہ ہے۔ یعنی آپ حج کر کے روانہ ہوئے تھے۔ اس کے انہوں نے بہت سے دلائل جمع کیے ہیں۔ منجملہ ان کے ایک یہ ہے کہ دمشق کو جانے والے یمنی قافلے کو پکڑنے کی جو روایت آئی ہے اس میں اس واقعہ کا مقام تنعیم کو بتایا گیا ہے۔ جو کہ مکہ سے شمال مغرب کی جانب ۳ میل کے فاصلے پر مشہور جگہ ہے۔ اس کو چھوٹا عمرہ بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ عمرہ کا احرام باندھنے کے لیے حدود حرم سے باہر جانا پڑتا ہے تو اس کام کے لیے یہ قریب ترین جگہ ہے)۔ عباسی صاحب کہتے ہیں کہ تنعیم کا محل وقوع اس سمت جنوب مشرق سے، جس سمت میں آدمی مکے سے کوفے کو جاتا ہے، بالکل مخالف سمت، شمال مغرب میں راہِ دمشق پر ہے۔ تو مکے سے کوفے کو جاتے ہوئے تنعیم کا یہ واقعہ کیسے پیش آگیا؟ اور کیسے یہ قافلہ جو حج کے ایام میں مکے سے گزر رہا تھا بغیر حج کیے ہوئے مکے سے آگے بڑھ کر تنعیم پہنچ گیا ہوگا؟ عباسی صاحب کا یہ سوال تو بالکل صحیح ہے مگر اس کے ذریعہ جو وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اگر اس حج کے بعد ۱۱ ر ذی الحجہ میں حضرت حسین کا سفر مانا جائے تو یہ

(باقی حاشیہ صفحہ گزشتہ کا) مثلاً شہید انسانیت ص ۲۲۵ پر ہے کہ ولید حاکم مدینہ نے یزید کو حضرت حسین کے بیعت سے انکار کی خبر دی تو اس نے حکم بھیجا کہ بیعت کرنے سے منع کرنے والوں کی فہرست بھیجو جس کے ساتھ حسین کا سر بھی ہونا چاہیے۔"

یہ اگر واقعہ ہوتا تو آخر مکہ بھی تو یزید کی قلمرو میں شامل تھا پھر کیوں اس نے مکے کے حاکم کو فرمان بھیجا کہ حسین مدینے سے نکل کر مکے پہنچ گئے ہیں تم ان کو گرفتار کرو۔ حالانکہ وہاں آپ کا تین مہینے سے اوپر قیام رہا تھا۔۔۔؟

واقعہ ممکن ہو سکتا ہے، یہ بالکل بھی قابلِ قبول بات نظر نہیں آتی۔ کیونکہ حج کرنے کی صورت میں حضرت حسینؓ اور ان کا قافلہ تنعیم سے، اسی مخالف سمت میں جس سمت میں راہِ کوفہ ہے، اس وقت کے مقابلے میں اور زیادہ دور ہو جاتا تھا جس وقت آپ ۸ ذی الحجہ کو مکہ مکرمہ میں تھے، حج کے ارکان منیٰ، مزدلفہ اور عرفات میں ادا ہوتے ہیں، اور یہ مقامات مکہ سے بجانب مشرق (یا جنوب مشرق) ۲½ میل سے لیکر ۱۲ میل تک کے فاصلے پر ہیں۔ جبکہ تنعیم مکہ سے خود عباسی صاحب کے قول کے مطابق بھی ___ بجانب شمال مغرب ۳۔۴ میل کے فاصلے پر ہے۔ پس مکہ سے ۳۔۴ میل مخالف سمت میں اگر اس واقعہ کا تصور مشکل ہے تو اسی مخالف سمت میں ۱۵۔۱۶ میل کا فاصلہ ہو جانے پر اور بھی زیادہ مشکل ہو جانا چاہیے۔

دوسری دلیل عباسی صاحب نے البدایہ والنہایہ کے الفاظ "و ذالک فی عشر ذی الحجۃ" کو بنایا ہے جس کا مطلب ان کے خیال میں یہ ہوتا ہے کہ حضرت حسینؓ ۱۰ ذالحجہ کو روانہ ہوئے۔ مگر اسی البدایہ والنہایہ میں یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ:

فاتفق خروجہ من مکۃ ایام	پس آپ کا مکہ سے خروج ایام ترویہ
الترویۃ قبل مقتل مسلم بیوم	میں قتل مسلم سے ایک دن پہلے ہوا
واحد۔ فان مسلماً قتل یوم	مسلم کا قتل یوم عرفہ میں ہوا
عرفۃ[1]	تھا۔

پس اس کی روشنی میں "عشر ذی الحجۃ" کا مطلب ۱۰ ذی الحجہ نہیں بلکہ عشرۂ ذی الحجہ" لیا جائے گا۔

علاوہ ازیں معاملہ کا یہ پہلو بھی عباسی صاحب سے نظر انداز ہو گیا کہ اگر حضرت حسینؓ نے سفر کا آغاز حج کے بعد کیا ہوتا تب وہ ۱۲ تاریخ سے پہلے سفر نہیں کر سکتے تھے، حاجی کو کم از کم ۱۲ تک منیٰ میں رک کر رمی جمرات کرنا ہوتی ہے۔ اور اس صورت میں عباسی

---

[1] ج ۸ ص ۱۵۹۔

صاحب کے دیئے ہوئے پیمانۂ رفتارِ سفر کے مطابق ۲ محرم کو کربلا میں نہیں پہنچ سکتے تھے جو وہ ثابت کرنا چاہتے ہیں۔

ہمیں بذاتِ خود ۸ یا ۱۰ ذی الحجہ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ لیکن عباسی صاحب کے قارئین میں سے کسی کی نظر سے ہمارے یہ صفحات گزریں تو اُسے خیال ہو سکتا ہے کہ ایک سوال جو حضرت حسینؓ کی تاریخ روانگی کے سلسلے میں اتنی اہمیت سے ایک مصنف نے اٹھایا تھا جواب والے دوسرے مصنف نے اس سے بالکل اعتنا ہی نہیں کیا۔ اس لیے اپنا نقطۂ نظر اس بارے میں عرض کرنا مناسب سمجھا گیا۔

کربلا تک کی رودادِ سفر اور یومِ شہادت کی روایتیں

آغازِ سفر کے ساتھ جس طرح کی روایتیں ابھی آپ کے سامنے آئیں کہ ایک کا مضمون دوسرے کی نفی کر رہا ہے۔ بلکہ خود ایک ہی کے اندر کے دو حصے ایک دوسرے سے تضاد رکھتے ہیں۔ ان کے بعد جو اور روایتیں کربلا تک کے سفر اور یومِ شہادت کی روداد بیان کرتی ہیں، وہ بعینہٖ اس کیفیت کی حامل اگرچہ نہ ہوں مگر دوسرے متعدد اسباب سے ان کا بیشتر حصہ مشکوک اور ناقابلِ اعتبار ہے اور کوئی خاص اہمیت بھی اس پوری روداد کے بیان کی ہے نہیں، مثلاً آپ راستے میں کہاں کہاں ٹھہرے؟ کیونکہ اکثر یہ جگہیں وہ ہیں جو قاری کے لیے ایک جائے مجہول کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان کا علم اُسے ہو یا نہ ہو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یا کتنی دیر تک دو منزلوں کے بیچ میں چلے اور کتنی دیر اور کون سے وقت آپ کس منزل پر ٹھہرے، اور کتنا پانی کہاں سے بھر کے لیا تھا لیا۔ اور کس منزل کی کیفیت کیا تھی؟ یہ سب باتیں وہ ہیں جو اس واقعہ کے بارے میں اُس خاص نقطۂ نظر کے ساتھ جو شیعہ حضرات کا ہے اور جو اعتقادات حضرت حسینؓ اور ان کے اہلِ بیت کے بارے میں شیعہ حضرات رکھتے ہیں اُن اعتقادات کے ساتھ تو ان تفصیلات میں جانے کے

کوئی معنی ہو سکتے ہیں۔ لیکن ان اعتقادات اور اس نقطۂ نظر کے بغیر ان تفصیلات میں جانا کوئی بامعنی کام نہیں ہوگا اس لیے ہم تفصیل برائے تفصیل کے بجائے اس روداد کی صرف وہی باتیں یہاں بیان کریں گے جن میں ہر اعتقاد اور ہر نقطۂ نظر کے لیے کوئی افادیت کا پہلو ہے۔

فرزدق سے ملاقات

فرزدق عربی شاعری کا مشہور نام ہے۔ حضرت علی اور آپ کے اہل بیت کے حامیوں میں سے تھا۔ عراق ہی وطن تھا۔ طبری نے دوران سفر حضرت حسین سے اسکی ملاقات بتانے والی دو روایتیں دی ہیں۔ ایک بتاتی ہے[1] کہ مقام صفاح پر اس کی ملاقات ہوئی جو کہ حدود حرم سے باہر تقریباً دس میل کی مسافت پر ہے، اور اس ملاقات کے راوی ایسے دو کوفی ہیں جو یوم ترویہ میں مکہ مکرمہ پہنچے جو کہ حضرت حسین کی روانگی کا دن تھا۔ اور آپ کو رخصت کر کے حج کے قافلوں میں شامل ہو گئے۔ اس سفر کی بہت سی روایتیں انہی دو کے حوالے سے ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ ہم حج سے فارغ ہو کر شتابی سے حضرت حسین کے تعاقب میں نکلے ـــــ شریک سفر ہونے کے لیے نہیں بلکہ تماشہ دیکھنے کے لیے کہ کیا ہوتا ہے۔ ہم "صفاح" پہنچے تو دیکھا کہ فرزدق ہے جو حضرت حسین سے مل رہا ہے۔ اور ان دونوں کی بات چیت ختم ہوئی تو حضرت حسین نے اپنی سواری کو حرکت دی اور السلام علیکم کہہ کر دونوں الگ ہو گئے۔ ان الفاظ سے صاف طور پر یہی مفہوم ہوتا ہے کہ فرزدق عراق کی طرف سے آرہا تھا جدھر کو حضرت حسین تشریف لے جا رہے تھے۔

عراق کی سمت سے آنے کا یہ کون سا وقت تھا۔ جبکہ حج ہو چکا ہے؟ اور حضرت کو صفاح پہنچتے پہنچتے جو کہ بمشکل دس میل پر ہے ایسے کتنے دن لگ گئے کہ وہ دو کوفی

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۱۸۔

(عبداللہ بن سُلیم اور المنذری بن مشمعل جو واقعہ کے راوی ہیں) حج کرنے کے بعد حضرت حسین کے پیچھے نکلے تو اس وقت تک حضرت حسین کا قافلہ صفاح تک ہی پہنچا تھا؟ جبکہ یہ دونوں حج کے ارکان ادا کرنے کے بعد ۱۲ رذی سے پہلے نہیں روانہ ہو سکے ہوں گے یعنی حضرت حسین کی روانگی کے چار دن بعد ان کی روانگی ہوئی ہو گی!

دوسری روایت[1] جس کا راوی خود فرزدق کو بتایا گیا ہے، وہ بتاتی ہے کہ فرزدق سنہ ۶۰ھ کے ایام حج میں (اپنی والدہ کو حج کرانے کے واسطے لیے ہوئے) حرم (یعنی حدود حرم) میں داخل ہوا تو اسے ایک قافلہ مکے سے نکلتا ہوا ملا جو تلواروں اور ڈھالوں کے ساتھ تھا۔ معلوم کرنے پر کہ یہ کس کا قافلہ ہے پتہ چلا کہ حضرت حسین بن علی کا۔ فرزدق نے لپک کر دعا سلام اور کچھ بات چیت کی جس میں یہ سوال بھی تھا کہ اے ابن رسول اللہ آپ حج چھوڑ کے کہاں جا رہے ہیں؟

پس پہلی روایت کے رو سے حج (یوم عرفہ) ہوئے بھی قریب چار پانچ دن ضرور ہو چکے تھے جب فرزدق عراق سے آتے ہوئے صفاح کے مقام پر حضرت حسین سے ملا۔ اور دوسری روایت کی رو سے فرزدق ۸ رذی الحجہ کو حرم شریف پہنچ گیا تھا اور حضرت حسین سے ملاقات مکے سے آپ کے نکلتے وقت ہوئی۔

اور ایک تیسری روایت بھی ہے جو بعض شیعہ مصنفین نے اپنے ماخذ سے لی ہے[2] وہ اس ملاقات کے واقعہ کی ایک تیسری شکل بتاتی ہے کہ فرزدق حج کر کے لوٹ رہا تھا۔ تب ایک پڑاؤ پر ملاقات ہوئی۔ غرض "شد پریشان خواب من از کثرت تعبیرہا" کا مضمون ہے۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ یا کہہ لیجئے (اندھوں کی فیل شناسی) کہ جس اندھے نے ہاتھی کے جس حصے کو چھوا اسی کی شکل و صورت اور سائز کو پورے ہاتھی کی شکل اور سائز بنا دیا۔

روداد سفر کی روایتوں کا یہی وہ حال ہے جس کی بنا پر عرض کیا گیا کہ بالکل قابل اعتبار

---

[1] ایضاً۔ [2] عبد الرزاق الموسوی المقرم نے مقتل الحسین میں ص ۲۷۵ پر۔

نہیں ہیں۔ فرزدق کی ملاقات کے سلسلے میں طبری کی دونوں روایتیں یہ بتاتی ہیں کہ حضرت حسین نے فرزدق سے پوچھا کہ "اپنے پیچھے (یعنی عراق میں) کیا حال چھوڑ کر آئے ہو؟" فرزدق نے جواب دیا کہ،

> "دل آپ کے ساتھ ہیں اور تلواریں بنی امیہ کے ساتھ اور قضا و قدر اللہ کے ہاتھ میں۔ جس پر آپ نے فرمایا "سچ کہتے ہو" اور رخصت ہو گئے۔"[1]

یہاں قدرتی طور پر حیرت ہوتی ہے کہ حضرت حسین نے تو یہ سفر پوری طرح اس اطمینان پر شروع کیا تھا کہ کوفے کے لوگ آپ کی حمایت پر مستعد اور آپ کی آمد کے لیے چشم براہ ہیں پھر فرزدق کی اس سے بالکل مختلف بات پر اظہار تعجب کرنے کے بجائے آپ نے تصدیق و تصویب فرمائی! بعد میں آنے والی کچھ اور روایات بھی ایسی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ فرزدق والی گفتگو کی شاید کوئی اصلیت نہیں ہے۔ یہ روایات آگے آ رہی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ فرزدق سے ملاقات سے کافی دنوں بعد تک حضرت حسین کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ اب کوفہ ان کے ساتھ نہیں ہے

انجامِ حضرت مُسلم کی خبر

حضرت حسین کا قافلہ کوفے کی طرف سرگرمِ سفر تھا۔ مُسلم بن عقیل کا خط ملنے کے بعد سے وہاں کے حالات میں جو تبدیلی ہوئی تھی مثلاً خود جناب مُسلم اور ہانی بن عروہ کو دی جانے والی سزائے موت، اس کا کوئی علم کسی ذریعہ سے نہ ہوا تھا۔ راہ میں ایک منزل زُبالہ آتی ہے جہاں سے کوفہ زیادہ دور نہیں رہتا۔ اس منزل پر آپ کو وہ قاصد[2] ملا جسے کوفے سے محمد بن اشعث نے مسلم بن عقیل کی وصیت کے مطابق ان کا یہ پیغام دے کر بھیجا تھا:

---

[1] طبری ج ۶ صفحہ ۲۱۸

[2] طبری ج ۶ صفحہ ۲۲۱۔

"میں یہاں گرفتار کیا جا چکا ہوں۔ آپ شاید چل بھی نہ پائیں کہ میرا قتل ہو جائے۔ بس آپ جہاں بھی یہ پیغام پائیں لوٹ جائیں۔ کوفہ والوں کا بھروسہ نہ کریں۔ ان لوگوں نے آپ سے بھی جھوٹ بولا تھا اور مجھ سے بھی جھوٹ ہی بولا۔ اور یہ تو آپ کے والد کے وہ ساتھی ہیں کہ جن کی وجہ سے وہ موت یا قتل کی تمنا کرنے لگے تھے۔[1]"

ایک روایت کے مطابق آپ نے درمیان سفر میں مقام حاجر سے اپنے رضاعی بھائی عبداللہ بن یقطر کے ہاتھ (یا حسب اختلاف روایت ایک دوسرے شخص کے ہاتھ) اہل کوفہ کے نام اپنی روانگی کی اطلاع بھی روانہ کی تھی۔ اسی منزل زبالہ پر ان کے بارے میں بھی خبر ملی کہ وہ کوفے سے پہلے قادسیہ کے مقام پر گرفتار کر لیے گئے اور پھر مقتول ہوئے۔[2]

ساتھیوں کو آگاہی

کہا گیا ہے اور بالکل قرین قیاس ہے کہ زبالہ کی منزل پر یہ پوری صورت حال کو بدلنے والی جو اطلاعات حضرت حسینؓ کو موصول ہوئیں تو آپ نے ضروری سمجھا کہ ساتھیوں کو آگاہ کریں اور اجازت دیں کہ اس نئی صورت حال میں جو شخص قافلے سے علاحدہ ہونا چاہے وہ علاحدہ ہو جائے۔ یہ بات روایات کے مطابق آپ نے خاص طور پر ان ساتھیوں کے پیش نظر کہی تھی جو راستے کی منزلوں پر آپ کے بارے میں یہ سمجھ کر ساتھ ہو گئے تھے کہ کوفہ آپ کے تابع ہے اور آپ وہاں حکومت کرنے جا رہے ہیں۔ اور یہ زیادہ تر بدوی لوگ تھے۔ جو منفعت کی امید میں ساتھ لگ گئے تھے۔ چنانچہ ایسے سب ہی لوگ یہ خبر سن کر منتشر ہو گئے اور آپ کے ساتھ شریک سفر صرف وہی لوگ رہے جو مکہ سے ساتھ تھے۔[3]

---

[1] طبری ج ۴ ص ۲۹۸ [2] ایضاً ص ۲۲۶ [3] ایضاً

واپسی کا مشورہ

طبری نے اسی صفحہ (۲۲۶) پر اگلی روایت دی ہے کہ زبالہ کے بعد والی منزل بطن عقبہ پر قیام ہوا تو وہاں ایک شخص نے آپ کے حالات جاننے کے بعد باصرار مشورہ دیا کہ برائے خدا آگے نہ جائیے ان حالات میں آگے جانا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ آپ نے اس رائے سے اتفاق کیا مگر فرمایا کہ "اللہ کے ارادوں پر کوئی غالب نہیں ہو سکتا" اور سفر جاری رکھا۔

ایک صفحہ قبل یعنی (۲۲۵ پر) طبری نے ایک اور روایت بھی ایسے ہی مشورے کی نقل کی ہے، یہ مشورہ ان دونوں کوفیوں نے دیا تھا جن کا ذکر ہم نے فرزدق کی ملاقات والی روایتوں کے ضمن میں کیا ہے کہ یہ حج کے بعد سے حضرت حسینؓ کے قافلے کے پیچھے بطور تماشا لگ گئے تھے۔ ان کی روایت ہے کہ زرود کے مقام پر کوفے سے آنے والے ایک شخص سے ہم کو مسلم اور ہانی کے مارے جانے کی خبر ملی جو ہم نے ثعلبیہ[1] کی منزل پر حضرت حسینؓ کی خدمت میں راز داری کے ساتھ پہنچائی اور پھر ذرا توقف دیکر عرض کیا کہ "للہ آپ آگے نہ جائیے۔ اب کوئی گنجائش نہیں ہے"۔ کہتے ہیں کہ سنتے ہی بنو عقیل چلائے کہ ہرگز نہیں واللہ ہم اس کے بغیر نہیں رہ سکتے کہ یا تو اپنے بھائی مسلم کا انتقام لیں اور یا ہم بھی انکے والے انجام سے دوچار ہو جائیں"۔ کوفی راوی کہتے ہیں کہ اس پر آپ نے ہماری طرف دیکھا اور فرمایا کہ ان (بچوں) کے بعد بھلا زندگی میں کیا رہ گیا؟ یعنی آپ نے سفر جاری رکھنے کا فیصلہ فرما لیا۔ ص۲۲۶ والی روایت میں جو الفاظ بطن عقبہ کی منزل کے آئے ہیں کہ "تم ٹھیک کہتے ہو مگر اللہ کے ارادوں پر کون غالب آ سکتا ہے"؛ ان الفاظ کو دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ غالباً کوفیوں والی وہ روایت صحیح ہے جو ابھی گزری جس کے مطابق بظاہر آپ (دو منزلیں پہلے ثعلبیہ کے مقام پر) یہ فیصلہ کر لینا چاہتے تھے کہ آگے نہ بڑھا جائے مگر بنو عقیل

---

[1] ثعلبیہ اس راہ کی مشہور منزلوں میں ہے۔ مکہ کی طرف سے جاتے ہیں تو زبالہ سے ایک منزل پہلے پڑتی ہے۔

کا رُخ دیکھ کر اس کو مناسب نہ سمجھا اور ان کے اصرار کو آپ نے سمجھا کہ یہ تقدیر الٰہی ہے۔

حضرت محمد الباقر کی روایت

طبری نے روداد سفر اور واقعۂ شہادت کے سلسلے میں دوسری بہت سی روایتوں کے ساتھ ایک مسلسل روایت ٹکڑوں میں بانٹ کر حضرت حسین کے پوتے حضرت محمد الباقر کی بھی درج کی ہے۔ اس روایت کے پہلے ٹکڑے کا ایک اقتباس ہم پیچھے دے چکے ہیں (باب ۸) اس کے دوسرے ٹکڑے میں آتا ہے۔

فاقبل حسین بن علی بکتاب	حسین بن علی مسلم بن عقیل کا خط پانے
مسلم بن عقیل کان الیہ حتی	کے بعد کوفے کی طرف متوجہ ہو گئے حتی کہ
اذا کان بینہ وبین القادسیۃ	جب آپ وہاں پہنچے کہ قادسیہ[1] کے اور
ثلاثۃ امیال لقیہ الحر بن یزید	آپ کے درمیان تین میل کا فاصلہ
التمیمی فقال لہ این ترید	تھا تو وہاں حر بن یزید التمیمی سے ملاقات
قال اریدھذا المصر قال	ہوئی۔ حر نے دریافت کیا، کہاں
لہ ارجع فانی لم ادع لک	کا ارادہ ہے؟ فرمایا اسی شہر کا۔ حر
خلفی شیئاً ارجوہ فہم ان	نے عرض کی کہ آپ لوٹ جائیں اسلئے
یرجع وکان معہ اخوۃ مسلم	کہ میں (جو وہیں سے آ رہا ہوں) آپ
بن عقیل فقالوا واللہ لا نرجع	کے لیے کوئی اچھی صورت حال چھوڑ کر
حتی نصیب بثأرنا	نہیں آ رہا ہوں۔ اس پر آپ نے واپسی
او نقتل، فقال لا خیر فی	کا ارادہ فرمایا۔ لیکن مسلم بن عقیل کے

---

[1] قادسیہ اسلامی تاریخ فتوحات کا نہایت مشہور نام ہے۔ کوفے سے تقریباً ۴۵ ـ ۵۰ میل بجانب جنوب مغرب اس کا محل وقوع ہے۔ اس میں گزر کر ہی کوفے کا سیدھا راستہ ملتا تھا۔

حیاتنا بعدکم فسار...[1]

بھائی آپ کے قافلے میں تھے، وہ بولے
کہ خدا کی قسم ہم تو بغیر بدلہ لیے یا اپنی
جان دیئے بغیر واپس نہیں ہوں گے اب
آپ نے فرمایا کہ تمھارے بعد میرے
لیے زندگی میں کیا رہ گیا ہے؟ اور یہ کہہ کر
آپ آگے کو چل دیئے۔

حضرت محمد الباقر کی اس روایت کے بعد۔ جو اگر سنداً صحیح روایت ہے اور یقیناً انھوں نے اپنے والد ماجد حضرت علی بن الحسین (زین العابدین) سے سنی ہوگی۔ جو اس سفر میں اپنے والد ماجد حضرت حسین کے ساتھ تھے[2] ۔ یہ بات بالکل یقینی ہوجاتی ہے کہ حضرت حسین نے حالات کے مکمل انقلاب کا علم و یقین حاصل ہوجانے کے بعد واپسی کا ارادہ فرما لیا تھا۔ اگرچہ وہ برادران مسلم کی وجہ سے عمل میں نہ آسکا۔

سمت سفر کی تبدیلی اور نزول کربلا

جیسا کہ اوپر کی روایت میں آیا آپ نے برادران مسلم کی بات سن کر واپسی کا ارادہ ترک کیا اور آگے کو چل دیئے۔ مگر پھر یہی روایت بتاتی ہے کہ آگے کو بڑھتے ہی ابن زیاد کا گھڑسوار دستہ سامنے آگیا ___ جو قادسیہ میں متعین تھا ___ اسے دیکھ کر آپ نے اپنا رخ قادسیہ اور کوفے سے ہٹا کر کربلا کی طرف کر دیا[3] ۔

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۲۰ [2] خود محمد الباقر بھی اس وقت دو ڈھائی سال کی عمر کے تھے، یعنی قافلۂ کربلا میں شامل تھے۔ [3] کربلا قادسیہ سے بجانب شمال اور کوفے سے بجانب شمال مغرب ۱۲-۱۰ کلومیٹر آگے ہے۔ اور حضرت حسین جنوب مغرب سے کوفہ کی طرف کو بڑھ رہے تھے۔

سار فلقيه اوائل خيل عبيد الله فلما رأى ذالك عدل الى كربلاء فاسند ظهره الى قصباء وخلا كي لا يقاتل إلا من وجه واحد فنزل وضرب ابنيته وكان اصحابه خمسة واربعين فارسا ومائة راجل[1]

(پس آپ آگے کو چل دیئے) مگر چلتے ہی آپ کو عبید اللہ بن زیاد کا مقدمۃ الجیش نظر آیا۔ اسے دیکھ کر آپ نے کربلا کی طرف رخ موڑ لیا۔ وہاں آپ نے بانس اور نرکل کے جنگل کو اپنی پشت پر لیا اور مضبوطی سے جم گئے تاکہ دشمن سوائے ایک طرف کے کہیں اور سے حملہ نہ کر سکے۔ یہاں نزول فرما کر آپ نے اپنے خیمے لگوا دیئے اور آپ کے ساتھی پینتالیس سوار اور سو پیادے تھے۔

---

[1] طبری ج ۶ صـ ۲۲

باب دہم ۱۰

کربلا کی سرگذشت

عمرو بن سعد کی آمد

حضرت محمد الباقر کی جس روایت کے الفاظ پر گزشتہ باب ختم ہوا ہے، اسی روایت میں آگے بیان ہوا ہے کہ عمر بن سعد بن ابی وقاص ہی کو ابن زیاد رے[1] کا حاکم بنا کر بھیج رہا تھا، حضرت حسین کا معاملہ سامنے آجانے پر ابھی ابن سعد کو یہ حکم ہوا کہ پہلے تم اس معاملے سے نمٹتے جاؤ (عربی کے الفاظ ہیں اکفنی ھذا الرجل) انھوں نے اس خدمت سے معافی چاہی، مگر مجبور ہونا پڑا اور حضرت حسین کے نزول کربلا کی اطلاع پاکر کربلا کا رُخ کیا۔

صلح کی بات اور ناکامی

فلمّا اتاہ قال لہٗ الحسین	پس جب ابن سعد وہاں پہنچ گئے تو
اختر واحدۃ امّا ان تدعونی	حضرت حسین نے ان سے کہا کہ تین باتوں
فانصرف من حیث جئت	میں سے ایک قبول کر لو یا تو میں جہاں
وامّا ان تدعونی فاذھب	سے آیا ہوں وہاں واپس ہو جانے دو
الی یزید وامّا ان تدعونی	یا یزید کے پاس چلا جانے دو اور یا

---

[1] فارس کا ایک اہم شہر جو اب تہران سے تین میل کے فاصلے پر ایک معمولی بستی ہے۔

فالحق بالثغور[1]	کہو تو سرحدوں کی طرف (جہاں میدان جہاد گرم ہے) نکل جاؤں۔

عمرو نے آپ کی اس پیش کش کو قبول کر کے ابن زیاد کو اطلاع بھیجی۔ مگر وہاں سے جواب آیا کہ یوں نہیں، بلکہ انہیں پہلے "میرے ہاتھ میں ہاتھ رکھنا ہوگا" "لا ولا کرامۃ حتی یضع یدہ فی یدی"۔

فقال لہ الحسین لا واللّٰہ	اس پر حسین نے کہا کہ نہیں یہ تو بخدا
لا یکون ھذا ابداً[2]	کبھی نہیں ہوگا۔

ایک دوسری روایت سے تائید

حضرت محمد الباقر کی روایت کے بعد طبری نے انہی کی روایت کی طرح کی ایک جامع روایت (جس میں اول سے آخر تک کا قصہ اختصار سے بیان کیا گیا ہے) اور درج کی ہے اس کے راوی حصین بن عبد الرحمٰن ہیں[3] اس سے بھی واقعہ کی صورت تقریباً یہی معلوم ہوتی ہے جو مندرجہ بالا روایت سے سامنے آئی۔ اس میں ہے کہ "حضرت حسینؓ اپنی منزل کی طرف وہاں کے حالات سے بالکل بے خبر گامزن تھے۔

حتی لقی الاعراب فسألھم	یہاں تک کہ کچھ اعرابی ملے اور آپ نے
فقالوا واللّٰہ ما ندری غیر انا	ان سے حالات کی بابت سوال کیا
لا نستطیع ان نلج ولا نخرج	تو انہوں نے جواب دیا کہ حضور ہمیں

---

[1] طبری ج ۲ ص ۲۲۰ [2] ایضاً۔ [3] حضرت مولانا عبدالشکور فاروقی صاحب لکھنوی رح م ۱۳۸۱ھ جو شیعی موضوع پر اتھارٹی کی حیثیت رکھتے ہیں اُن کی تحقیق کے مطابق واقعہ کربلا کی تمام روایتوں میں حضرت محمد الباقر کی اور حصین بن عبد الرحمٰن ہی کی یہ دو روایتیں سند کے اعتبار سے صحیح اور بے عیب ہیں۔

فانطلق یسیر نحو طریق الشام
نحو یزید فلقیته الخیول بکربلاء
فنزل یناشدھم اللہ
والاسلام قال وکان بعث
الیه عمر بن سعد وشمر بن
ذی الجوشن وحصین بن
نمیر فناشدھم الحسین
اللہ والاسلام ان یسیّروہ
الی امیر المؤمنین فیضع
یدہ فی یدہ فقالوا لا الا
علی حکم ابن زیاد۔[2]

اندر کی تو خبر نہیں البتہ اتنا جانتے ہیں کہ نہ ہم اِدھر سے اُدھر جا سکتے ہیں اور نہ اُدھر سے اِدھر آسکتے ہیں۔[1] اس پر آپ نے شام کے راستے کی طرف یعنی یزید کی طرف کو چلنا شروع کیا اور اسی اثنا میں مقام کربلا میں آپ کو گھڑسوار دستوں کا سامنا ہوا پس آپ اترے اور انھیں اللہ اور اسلام کا واسطہ دیکر سمجھانے لگے۔ راوی کا مزید بیان ہے ابن زیاد نے عمر بن سعد، شمر بن ذی الجوشن اور حصین بن نمیر کو کربلا بھیجا تھا۔ سو آپ نے انکو اللہ اور اسلام کا واسطہ دیکر کہا کہ مجھے امیر المؤمنین (یزید) کے پاس جانے دیں وہاں آپ اپنا ہاتھ انکے ہاتھ میں دیدیں گے۔ مگر ان لوگوں نے کہا کہ نہیں پہلے آپ کو ابن زیاد کا حکم ماننا ہوگا (یعنی ان کے پاس چلنا ہوگا)

---

[1] یہ الفاظ بتاتے ہیں کہ یہ بات چیت قادسیہ کے قریب ہی کہیں ہو رہی ہے جو کوفہ کا ناکہ تھا اور جہاں روک تھام کے انتظامات تھے۔

[2] طبری ج ۶ ص ۲۲۲ اس روایت میں تین صورتوں کے بجائے صرف یزید کے پاس جانے والی صورت کا ذکر ہونے کی وجہ شاید یہ ہو کہ یہ تینوں صورتوں میں سب سے زیادہ اہم اور قابل ذکر چیز تھی۔ واللہ اعلم۔

اس روایت میں اس بات کا ذکر نہیں ہے جو اوپر والی روایت میں تھا کہ عمر بن سعد نے تو حضرت حسین کی پیش کش (یا مصالحتی فارمولا) قبول کر لیا تھا مگر ابن زیاد نے اُسے رد کر کے واحد صورت یہ تجویز کی کہ وہ کوفے آ کر پہلے اُس کے ہاتھ میں ہاتھ دیں۔ بعد میں ان کے مستقبل کا فیصلہ ہوگا۔ مگر یہاں اس بات کا ذکر نہ ہونا کہ عمر بن سعد نے تو قبول کیا تھا مگر ابن زیاد نے رد کر دیا، صرف بربنائے اختصار ہی سمجھا جانا چاہیے، ورنہ ایسی کوئی ایک روایت بھی نہیں ہے جس کی بنا پر یہ خیال کرنے کی گنجائش ہو کہ عمر بن سعد کو لڑائی ٹالنے سے نہیں بلکہ برپا کرنے سے دلچسپی تھی۔ ابن سعد سے متعلق تمام روایتیں اس کی شہادت دیتی ہیں کہ وہ ہر ممکن طریقے پر خواہش مند تھا کہ اس کے نامۂ اعمال میں قتل حسینؓ نہ لکھا جائے۔ اگرچہ اس معاملے میں حکومت کو ناراض کرنے کی حد تک جانے کو تیار نہ تھا۔

جنگ اور شہادت

حضرت محمد الباقر کی روایت میں اوپر گزر چکا ہے کہ ابن زیاد کی طرف سے یہ شرط کہ پہلے حسین اُس کے قیدی بن کر کوفے آئیں بعد میں ان کی سہ رُخی پیش کش پر غور کیا جائے گا" حضرت حسین کو منظور نہیں ہوئی اور فرمایا لا واللہ لا یکون ھذا ابداً" اس کے بعد بیان ہوا ہے

فقاتلہ فقتل اصحاب الحسین	جس پر عمر نے آپ سے جنگ کی اور آپ
کلہم وفیہم بضعۃ عشر شاباً	نے جگر سے جنگ کی اور اس میں تمام
من اھل بیتہ وجاء سہمٌ	رفقائے حسین شہید ہوئے اور ان میں
فاصاب ابناً لہ معہ فی حجرہ	۱۵-۲۰ کے درمیان جوان آپ کے
فجعل یمسح الدم عنہ	اہلبیت میں سے تھے۔ اور ایک تیر آکے

ويقول اللهم احكم بيننا وبين	آپ کے ان صاحبزادے کو لگا جو آپ کی گود
قوم دعونا لينصرونا فقتلونا	میں تھے آپ صاحبزادے کا خون پونچھتے
ثم امر بحبرة فشقها	جاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے کہ اے
ثم لبسها وخرج بسيفه	اللہ تو ہی انصاف کیجئے ہمارے اور ان
فقاتل حتى قتل. صلوات	لوگوں کے درمیان جنھوں نے ہماری
الله عليه [1]	مدد کے وعدے پر ہمیں بلایا اور پھر
	قتل کیا۔ پھر آپ نے ایک چادر طلب کر کے
	اسے پھاڑا اور اپنے اوپر لپیٹا پھر تلوار
	لیکر نکلے اور قتال کیا حتی کہ شہید ہوئے
	صلوات اللہ علیہ۔

حصین بن عبدالرحمٰن کی روایت میں اس موقع پر ذرا سی اور تفصیل ہے، اس میں کہا گیا ہے کہ ابن زیاد نے جو لشکر حسینؓ قافلہ کی گرفتاری کے لیے بھیجا تھا اس میں ایک صاحب حُر بن یزید حنظلی بھی تھے جو ایک سوار دستے کے سالار تھے۔ انھوں نے جب یہ صورت حال دیکھی کہ حضرت حسینؓ کی بات رد کی جا رہی ہے تو معاملہ میں مداخلت کرتے ہوئے کہا کہ یہ کیا غضب ہے!

والله لو سألكم هذا الترك	یہ بات تو اگر تم سے ترک اور دیلم کے
والديلم ما حلّ لكم ان	کافر بھی مانگتے تو ان کا سوال بھی رد
تردّوه [2]	کرنا تمہیں روا نہ تھا۔

مگر اہلِ کمان کے ان تینوں افراد (عمر، شمر، حصین) نے اپنی بات پر اصرار جاری رکھا[3] جس پر

---

[1] طبری ج ٦ ص ٢٢٠ [2] ایضاً ص ٢٢٣ ۔

[3] بعض دوسری روایات میں یہ بات اس طرح بیان ہوئی ہے کہ حُرؓ نے یومِ عاشورہ کی صف آرائی کے وقت ابن سعد (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

حُرؔ نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور حضرت حسین کی صفوں میں پہنچ گیا اور وہاں سے پلٹ کر ابن زیاد کے لشکر پر حملہ آور ہوا۔

فصوّب الحرّ وجه فرسه	اس پر حُرؔ نے اپنے گھوڑے کا رخ پھیرا
وانطلق الى الحسين واصحابه	اور حسین اور ان کے ساتھیوں کی طرف چلا
فظنوا انه انما جاء ليقاتلهم	اُن لوگوں نے گمان کیا کہ یہ شخص اُن سے
فلما دنا منهم قلب ترسه	لڑنے آرہا ہے مگر قریب پہنچ کر حُرؔ
وسلّم عليهم ثم كرّ على اصحا	نے اپنی ڈھال کو اُلٹ دیا (جو دوست
ابن زياد فقاتلهم فقتل منهم	نہ کہ دشمن ہونے کی علامت تھی) اور
رجلين ثم قتل رحمة الله	سلام کیا اس کے بعد وہ اصحاب ابن
عليه[1]	زیاد پر پلٹا اور حملہ کرکے دو آدمی مارے
	اور پھر خود بھی جان دیدی ۔

حُصین بن عبدالرحمٰن کی روایت کے اس زائد حصے سے یہ سمجھنا ممکن ہوتا ہے کہ کربلا کی جنگ کا آغاز شاید حُرؔ بن یزید کی تلوار سے ہوا مگر کسی دوسری روایت سے اس کی تائید نہیں ہوتی بلکہ اس سے مختلف شکل سامنے آتی ہے جبکہ اس روایت کا بیان اتنا تشنہ ہے کہ محض اس کی بنیاد پر اس میں درج واقعہ کو جنگ کا آغاز قرار دینا مشکل ہے ۔

حُرؔ بن یزید دوسری روایات میں

حُرؔ بن یزید کا تذکرہ واقعہ کربلا کی دوسری روایات میں بہت زیادہ تفصیل کے ساتھ پایا جاتا ہے اور ماتم حسین کی مجلسوں میں انصار حسینؑ کے جب نام آتے ہیں تو وہاں یہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) امیر لشکر کو مخاطب کر کے یہ بات کہی تھی" اور ابن سعد ہی نے صرف جواب دیا تھا جو یہ تھا کہ میں تو خود یہی چاہتا تھا مگر میرا اختیار نہیں ہے ۔

[1] طبری ج ۶ صـ ۲۲۲ ۔

ایک بہت نمایاں نام ہوتا ہے۔ اس کے بارے میں پہلی تفصیلی روایت یہ ہے کہ عمر بن سعد کے فوجی دستوں سے پہلے ایک گھڑ سوار دستے نے آکر حضرت حسینؓ کا راستہ روکا تھا۔ یہ دستہ حُر بن یزید ہی کی قیادت میں تھا۔ اس روایت کے مطابق اس دستے کا اور قافلۂ حسینی کا سامنا کربلا سے کچھ دور پہلے ذو حُسُم پہاڑ کے دامن میں ہوا۔ یہ دستہ اس اطلاع پر کہ حضرت حسینؓ نے اپنا رُخ کوفے سے موڑ کر اس راہ پر کر دیا ہے جو شام اور دمشق کو جاتی ہے اس مقصد سے قادسیہ سے دوڑایا گیا تھا کہ ان لوگوں کو حراست میں کر لائے۔ حضرت حسینؓ نے اس بات سے انکار کر کے مکہ کو واپسی کا ارادہ کیا تو حُر اس میں حائل ہوا لیکن دل میں نرمی تھی کہ کسی بڑی سختی پر آمادہ نہ ہو پایا اور بیچ کی راہ یہ نکالی کہ نہ آپ کوفے جائیں نہ ہی مکے کو بلکہ ایک بین بین راستے پر ہم دونوں ملکے چلتے ہیں حتیٰ کہ میں ابن زیاد کو خط بھیج کر موجودہ صورت حال میں اس کا نیا حکم حاصل کروں۔ روایت کہتی ہے کہ یہ حکم آیا کہ جہاں ہو وہیں قافلے کو روک لو اور انتظار کرو۔ چنانچہ حُرؓ نے جو ابن زیاد کا حکم آپ کو پہنچایا اور مزید کسی رعایت سے معذوری ظاہر کی تو اگرچہ آپ کے کچھ ساتھیوں کی رائے نہ تھی کہ اس حکم کے مطابق اسی جگہ پر رک جانا قبول کیا جائے۔ بلکہ وہ چاہتے تھے کہ کسی مناسب اور اپنی پسند کی جگہ تک پہنچنے کی کوشش کی جائے اگرچہ اس میں حُر کے دستے سے جنگ ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔ مگر حضرت حسینؓ نے کسی طرح کی جنگ آزمائی کو مناسب نہ جانا اور حُر نے جہاں کہا وہاں آپ ٹھہر گئے ـــ اور یہ کربلا کا میدان تھا۔[1]

---

[1] طبری ج ۶ صفحہ ۲۳۳۔ کربلا کے متعلق روایتوں میں یہ بھی ہے اور اسکی بڑی شہرت ہے کہ یہ بے آب گیاہ ریتیلا میدان تھا۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ بے اصل ہے۔ خود حضرت محمد الباقر کی روایت کے الفاظ کہ وہاں بالکل نرکل اور قصب کا جنگل تھا اسکی تردید کرتے ہیں۔ بعض روایتوں میں آپ کے مقام نزول کو نینوی بھی بتایا گیا ہے۔ معجم البلدان کے مطابق یہ نینوی ایک وسیع علاقہ ہے جس میں کربلا کا قریہ واقع تھا۔ یہ وہ نینوی نہیں ہے جو شہر موصل کے پاس مشہور شہر اور ایک پرانی تہذیب کا مرکز ہے ـــ ج ۲ صفحہ ۲۱۵

آپ کے اس نزول — نزول کربلا — کی تاریخ ۲ محرم یوم پنجشنبہ سنہ ۶۱ھ درج ہوئی ہے۔ اور طبری نے چونکہ حر سے متعلق یہ روایت "سنہ ۶۱ھ کے واقعات" کا عنوان قائم کر کے دی ہے۔ اس لیے سمجھنا چاہیے کہ حر کے دستے سے آپ کے قافلے کا سامنا یکم محرم سنہ ۶۱ھ کو ہوا یعنی اس سے پہلے نہیں۔ اس کے بعد روایت کا سلسلۂ بیان کہتا ہے کہ اگلے دن یعنی ۳ محرم یوم جمعہ کو — عمر بن سعد کی سرکردگی میں چار ہزار نفوس پر مشتمل مزید فوجی دستے پہنچ گئے۔

دونوں روایتوں میں تطبیق

حصین بن عبدالرحمٰن کی روایت اور دوسری روایتوں میں جو فرق پایا جاتا ہے اُسے ہم اجمال اور تفصیل کا فرق کہہ سکتے ہیں۔ بایں معنی کہ حر بن یزید کا پورا واقعہ اسی تفصیل کے مطابق ہو جو ابھی اوپر بیان ہوئی لیکن حصین بن عبدالرحمٰن کی روایت میں اس کا اختصار کر کے بس حر کی موجودگی میدان کربلا میں دکھائی گئی ہے۔

حُر کے کردار کی کچھ اور تفصیلات

لیکن اس موجودگی کے بعد حُر کے جس خاص کردار کا بیان حصین کی روایت میں ہوا ہے کہ وہ اپنے دستے کی قیادت چھوڑ کر حضرت حسینؓ کی صفوں میں جا ملے اور پھر اُدھر سے پلٹ کے عمر بن سعد کے لشکر پر حملہ آور ہوئے، اس کردار کی جو تفصیلی شکل طبری کی دوسری روایتوں میں بیان ہوئی ہے وہ ایسی نہیں ہے کہ جسے تفصیل اور اجمال کا فرق کہہ کر قبول کر لیا جائے بلکہ یہ دراصل میدان کربلا کے واقعات کی اُس "تفصیل" کا حصہ ہے جس کا وجود بظاہر عالم واقعہ میں نہیں ہوا بلکہ وہ مصنفین مقاتل یا ان کے "راویوں" کی قوت تخیل کا کرشمہ ہیں۔

اس نوعیت کی تفصیلی "روایتوں" کے مطابق جن کا سلسلہ طبری میں صفحہ ۲۲۴ سے

تقریباً ۲۴۸ تک یعنی تیس پینتیس صفحات میں پھیلا ہوا ہے۔ حرؓ نے یوم عاشورہ میں عین اس وقت جبکہ دونوں طرف صف بندی ہو چکی تھی اپنے سرداران لشکر کی آنکھوں کے سامنے بڑی باریک حکمت عملی سے کام لیکر اپنی صف کو پار کیا اور صف حسینی میں جا پہنچے۔[1] اور معافی تلافی کی کہ یہ میرا ہی قصور ہے جو آپ کو یہ صورت حال درپیش ہے۔ ورنہ میں اگر آپ کا راستہ نہ روکتا تو آپ سلامتی کے ساتھ واپس ہو چکے ہوتے۔ اس کے بعد اپنی معافی اور توبہ کی قبولیت کا اطمینان حضرت حسینؓ کی زبان سے حاصل کیا۔ پھر پلٹ کر لشکر ابن زیاد کی طرف گئے اور ایک تقریر ان کو مخاطب کرکے کی۔

> "اے لوگو، تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ حسین کی پیش کردہ باتوں میں سے کوئی ایک بات بھی تم قبول نہیں کرتے۔" لوگوں نے کہا کہ "ہمارے امیر عمر بن سعد سے بات کرو۔" پس انھوں نے عمر کو مخاطب بنا کر یہی بات کہی۔ عمر نے جواب دیا کہ "مجھے تو خود بیحد خواہش تھی اگر میرے بس میں بات ہوتی" اس پر حرؓ پھر عام لوگوں سے مخاطب ہو گئے کہ "اے کوفیو خدا تمھیں غارت کرے۔ تم نے ان کو بلایا اور بلا کر دشمن کے حوالے کر دیا۔ تم نے دعویٰ کیا تھا کہ تم اپنی جانیں ان پر قربان کر دو گے۔ اور اب تم الٹا ان کو قتل کرنے کے درپے ہو۔ تم نے انھیں گھیر لیا ہے اور گھونٹ کے مارنا چاہتے ہو۔ اللہ کی لمبی چوڑی زمین میں سے کسی طرف کو چلے جانے کا اذن نہیں دے رہے کہ وہ اور ان کے اہلبیت امن پائیں۔ تم نے ان کو ایسا بے بس قیدی بنا لیا ہے کہ اپنے نفع نقصان کا کچھ بھی اختیار ان کو نہیں رہ گیا۔ تم نے اُن کو اُن کی عورتوں اور ساتھیوں کو فرات کے اس بہتے پانی سے محروم کر رکھا ہے جسے یہودی مجوسی اور نصرانی بھی پیتے ہیں اور علاقے کے خنزیر اور کتے اس میں لوٹتے ہیں ادھر یہ ہیں کہ پیاس سے مرے جاتے ہیں۔ کیا ہی بُرا سلوک ہے جو تم نے ذریت

---

[1] اس حکمت عملی کی تفصیل خاصی طویل ہے۔ طبری ج ۶ ص ۲۴۳۔

محمدؐ کے لیے روا رکھا ہے، خدا تمھیں بھی قیامت کی پیاس کے دن پانی کے قطروں کو ترسائے۔ اگر تم اس وقت کا رویہ چھوڑ کر اس سے توبہ نہیں کرتے ہو[1]۔

اور سب باتیں چھوڑ دیجیے اس بات کا یقین تو دور کنار کیا امکان بھی مانا جا سکتا ہے کہ لشکر کا ایک افسر عین میدان جنگ میں کھلی غداری کر کے "دشمن[2]" کی صفوں کا حصہ بن جائے اور لشکر کا افسر بالا نہ صرف یہ کہ دشمن کی صفوں سے اس کی تقریر سننے اور اپنے فوجیوں کو سننے دینے کے لیے تیار ہو جائے، بلکہ اس کے جواب میں ایسے الفاظ بھی کہے کہ:۔

"تم جانتے ہو کہ میرے بس میں کچھ نہیں۔ ورنہ میں تو شروع ہی سے اس بات کا حامی اور حریص ہوں کہ حسینؑ کی تین باتوں میں سے کوئی ایک بات مان لی جائے؟[1]"

ظاہر ہے کہ یہ تو عام حالات میں بھی ایک ناقابل تصور بات ہے۔ مگر یہاں تو حالات بھی عام قسم کے نہ تھے۔ اسی تاریخ طبری کی روایات کے مطابق صورت حال تھی کہ عمر بن سعد کو ہر ممکن کوشش کے باوجود کہ اسے اس مہم پر نہ بھیجا جائے ابن زیاد نے مجبور کر کے بھیجا تھا۔ پھر جب انھیں روایتوں کے مطابق[3] اس نے حضرت حسینؓ کی طرف سے مصالحت کی پیشکش اور اس کا فائدہ مولانا اپنی سفارش کے ساتھ ابن زیاد کو بھیجا تو وہاں سے جواب آیا تھا کہ:۔

"میں نے تم کو اس لیے نہیں بھیجا تھا کہ تم وہاں جا کر اپنی بحث کی راہیں نکالو حسین کو ڈھیل دو اور بقا و سلامتی کے خواب دکھاؤ۔ اس لیے کہ وہاں جا کر ان کے سفارشی بن بیٹھو۔ دیکھو اگر حسین اور ان کے ساتھی میرا حکم مانتے اور اپنے آپکو سپرد کر دیتے ہیں تو انھیں یہاں بھیج دو۔ ورنہ ان پر یلغار کر دو اور بے تحفظ قتل کر دو بلکہ ان کا مثلہ کر دو ناک کان کاٹ دو اس لیے کہ یہ اسی کے قابل ہیں اور خاص کر

---

[1] طبری ج ۲ ص ۲۱۳ [2] غلط فہمی نہ ہو یہاں "دشمن" کا لفظ ابن زیاد کی فوج کے نقطۂ نظر سے اور اس کے احساس کی ترجمانی کے طور پر لکھا گیا ہے۔ [3] جی ہاں! انہی روایتوں کے مطابق "قصہ" آگے جو بات نقل کی جا رہی ہے اس مصنف کے نزدیک اس کا بیشتر حصہ تو بالکل من گھڑت ہے اور ہو سکتا ہے کہ کل ایسا ہی ہو۔

حسین قتل ہوں تو ان کا سینہ اور پشت گھوڑوں سے روند ڈالیے کہ وہ حکومت کے نافرمان، باغی، مریب اور نہایت خطا کار ہیں[1]۔"

نیز یہ بھی اس سلسلے کی روایات میں موجود ہے کہ ابن زیاد نے یہ جوابی خط شمر ذی الجوشن کو اس ہدایت کے ساتھ دے کر کربلا روانہ کیا تھا کہ اگر عمر بن سعد پھر بھی لیت و **لعل کرے تو لشکر کی کمان تم ہاتھ میں لو اور عمر کا سر کاٹ کر ہمارے پاس بھیج دو**[2]۔

چنانچہ جیسا کہ حصین بن عبدالرحمٰن کی روایت میں اوپر گزرا اور اس کے سوا بھی طبری کی متعدد روایتیں یہی بات بتاتی ہیں کہ عمر بن سعد حضرت حسین کی پیش کش قبول کرنے سے عذر کر کے ان کے سامنے بس یہی ایک فیصلہ کن بات رکھنے پر مجبور ہوئے کہ آپ اپنے آپ کو ابن زیاد کے حکم کے مطابق (جو سرکار یزید کی طرف سے حضرت حسین کے معاملے میں کلی (FULL) مختار بنا دیے گئے ہیں) ہمارے حوالے کر دیں۔

کیا کوئی امکان ان حالات میں اس بات کے سوچے جانے کا ہے کہ اسی عمر بن سعد نے اپنے لشکر کے ایک باغی کی صریح تقریر خود سنی اور اپنے لشکر کو پورے سکون و اطمینان سے سننے دی بلکہ نہایت ندامت کے ساتھ علی الاعلان یہ جواب بھی دیا کہ "میں کیا کروں مجبور ہوں؟" ہاں یہ بات ہو سکتی تھی جبکہ مان لیا جائے کہ عمر بن سعد کو گرفتاری یا جنگ کیلئے نہیں بلکہ صلح کی گفت و شنید کے لیے بھیجا گیا تھا مگر ایسی صورت میں ۴۔۵ ہزار فوج کی کوئی تُک نہ بیٹھے گی۔

ایک اور روایت اس قصے کو اور بھی زیادہ ناقابلِ تصور بنانے والی سن لیجئے۔ "طبری کی اسی جلد صفحہ ۲۲۲ پر ہے کہ عمر بن سعد اپنے ساتھیوں کے ساتھ گرمی دور کرنے کے لیے نہر میں گھسے ہوئے تھے کہ ایک شخص نے آ کر کان میں کہا: امیر ابن زیاد نے جویریہ بن بدر

---

[1] طبری ج ۶ صفحہ ۲۳۶ [2] ایضاً۔

تمیمی کو اس ہدایت کے ساتھ آپ کے پاس بھیجا ہے کہ آپ (عمر) اگر حسین اور اُن کے ساتھیوں سے جنگ نہیں کرتے ہیں تو وہ آپ کی گردن مار دے۔ عمر نے یہ سنا تو کود کر اپنے گھوڑے کی طرف آئے، سوار ہوئے اور گھوڑے ہی پر بیٹھے بیٹھے ہتھیار منگا کر سجائے اور لشکر لے کر حسینی قافلے پر پہنچے اور جنگ کی"۔ ذرا غور کیجیے کہ ایک طرف یہ روایتیں اور ایک طرف وہ روایتیں! کیا کوئی بھی صورت دونوں کے بیک وقت درست ہونے کی ہے؟[1]

اور یوم عاشورہ کی باقی کہانی

حیرت مصنفین مقتل حسینؓ یا ان کے راویوں پر نہیں، جنھوں نے واقعۂ کربلا کو ایک بھرپور رزمیہ داستان کا روپ دینے کے جوش میں اس کے مبینہ واقعات کے سلسلے میں امکان اور عدم امکان سے بحث نہیں رکھی۔ حیرت اپنے مؤرخین پر ہے کہ یہ باہم متضاد اور ناممکن الوقوع قسم کی حکایتیں قطار در قطار انھوں نے اپنی کتابوں میں جمع کر لی ہیں۔ جیسے حُر کی تقریر کی یہ روایت ہے ایسے ہی انھیں حالات میں جن کی طرف اوپر دو تین اشارے کیے گئے، کتنی ہی روایتیں اور حکایتیں ہیں جن میں حضرت حسین اور ان کے ساتھیوں کی کتنی ہی چھوٹی بڑی تقریریں سناتی ہیں۔ دو دو آدمی عمر بن سعد کی گردن مارنے کا حکم لیے ہوئے موجود ہیں۔ اور ایک تو ان میں شمر جیسا بدنام بھی ہے۔ مگر ابن سعد ہیں کہ نہ صرف حسینؓ کے خلاف تلوار آزمائی میں بدستور دیر لگا رہے ہیں بلکہ اس طرح دیر لگا رہے ہیں کہ اپنے فوجیوں کو وہ تقریریں سنواتے ہیں جو انھیں بغاوت پر آمادہ

---

[1] اور یہ تمام گفتگو حُر کے بارے میں اس خیال پر ہو رہی ہے کہ وہ ابن زیاد کا ایک فوجی افسر تھا جیسا کہ مشہور روایات میں ہے۔ مگر یاد کیجیے حضرت محمد الباقر والی روایات۔ اس کی رو سے یہ شخص مخالف فریق سے کوئی تعلق ہی نہ رکھتا تھا، ایک عام آدمی تھا جو کوفے کی طرف سے آتا ہوا حضرت حسینؓ کو ملا تھا۔

کرنے کے لیے "دشمنوں" کی صفوں سے کی جا رہی ہیں۔ اہل تشیع اپنے ائمہ کے لیے معجزات کا ویسے ہی عقیدہ رکھتے ہیں جیسے ہم انبیاء علیہم السلام کے لیے۔[1] وہ اگر ان ناممکنات کے قائل ہیں اور ایک ہی وقت میں متضاد باتوں کے وقوع کا بیان بخبر کرتے ہیں تو ٹھیک ہیں وہ بطور معجزۂ امام ان باتوں کا قائل اپنے آپ کو کر سکتے ہوں گے مگر ہم لوگ جو ان ائمہ کے لیے تمام تر احترام کے باوجود کوئی معجزہ نہیں مانتے وہ کیسے انتہائی درجہ کی ان متضاد روایتوں کو اپنے دل و دماغ یا اپنی کتابوں میں جگہ دیتے ہیں؟ ان متضاد اور اعجوبہ روایتوں کے جنگل میں تقریباً دس ماہ پہلے داخل ہو کر یہ راقم الحروف جس حیرت میں مبتلا ہوا تھا آج تک اس حیرت کا وہی عالم بلکہ اس سے بھی کچھ سوا ہے۔ اب تک یہ معمہ حل نہیں ہو پایا کہ ہمارے مؤرخین نے کیسے اس جنگل کو اپنی کتابوں میں بسایا ہے؟

حضرت حسینؓ اور رفقاء کی تقریریں

طبری نے روایت بیان کی ہے کہ شمر بن ذی الجوشن، عبیداللہ بن زیاد کا وہ حکمنامہ عمر بن سعد کے پاس لے کر آیا (جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے) جس میں کہا گیا تھا کہ حسینؓ سے نپٹنے کے معاملے میں فضول وقت مت گنواؤ تمھیں اس لیے بھیجا گیا ہے کہ انھیں حراست میں لے کر یہاں آؤ۔ حراست قبول نہیں کرتے تو قتال کر کے قصہ ختم کر دو۔ ورنہ ہم نے شمر کو ہدایت کی ہے کہ وہ لشکر کا چارج تم سے لے لے۔ ابن سعد نے خط دیکھ کر کہا کہ مجھے لگتا ہے کہ معاملہ تم ہی نے خراب کیا ہے۔ ورنہ ابن زیاد حسین کی پیش کردہ تین صورتوں میں سے کسی ایک کو مان ہی لیتا اور پھر یہ کہہ کر کہ نہیں! میں ہی مفوضہ مہم کو انجام دوں گا۔

---

[1] کتاب کے پہلے ایڈیشن کے تبصرے پر ایک مضمون نگار نے اس جملے پر اعتراض کیا تھا کہ اس میں دونوں عقیدوں کو یکساں بتایا گیا ہے جو کہ غلط ہے۔ مگر اس میں یہ غلطی دراصل مضمون نگار سے ہوئی تھی کہ اس نے "ویسے ہی عقیدہ رکھتے ہیں" کو "ویسا ہی عقیدہ رکھتے ہیں" کے معنی میں لے لیا۔

اُس نے اُسی وقت فوج کو حملے کے لیے کوچ کا حکم دیدیا۔ یہ محرم سنہ ۶۱ھ کی ۹ تاریخ پنجشنبہ کا دن اور عصر کا وقت تھا۔[1] اس کے بعد بیان ہوا ہے کہ ان لوگوں سے یہ کہہ کر مہلت (حضرت حسین کی طرف سے) مانگی گئی کہ بھئی یہ تم ایکدم سے چڑھ آئے، ہمیں بتایا تو ہوتا۔ کہ کیسے ہماری پیش کش نامنظور ہو گئی ہے۔ بات معقول تھی۔ شمر کو بھی اتفاق کرنا پڑا اور اس قرار داد پر فوج واپس ہو گئی کہ صبح تک آپ لوگ فیصلہ کرلیں، صبح کو یا تو سپردگی ہو جائے ورنہ ہم طاقت استعمال کریں گے[2]

حالات کی جو صورت اوپر بیان کی گئی تھی اس میں ۹ر محرم کی شام کو داخل ہونے والے اس نئے عنصر کا بھی اضافہ کرلیجئے، جس کا ابھی ذکر ہوا کہ دشمن ۹ر کی شام ہی کو حملہ آور ہونے کے لیے آیا اور بمشکل صبح تک کا وقت دیکر واپس گیا کہ رات میں فیصلہ کرلیں کہ پُرامن سپردگی منظور ہے یا مزاحمت۔ اور پھر اس پس منظر میں ذرا غور کیجئے کہ کیا یہ بات قابل یقین نظر آتی ہے کہ ۱۰ر تاریخ کی صبح عمر بن سعد، شمر بن ذی الجوشن کے ساتھ (اور اُس عمرو بن الحجاج کے ساتھ جسے ہم روایتوں کے مطابق کچھ ہی دیر بعد رفقائے حسین پر نہر فرات کا راستہ روکتے ہوئے پاتے ہیں) اپنی فوج لیے ہوئے آتا ہے تو نہ یہ پوچھتا ہے کہ آپ نے کیا فیصلہ کیا؟ اور نہ ہی کسی علامت سے یہ نتیجہ اخذ کرکے کہ مزاحمت کا فیصلہ ہے[3] حملہ آور ہوتا ہے، بلکہ اپنی چار پانچ ہزار فوج ـــ اور شیعہ مصنفین کے مطابق کم از کم بیس تیس ہزار فوج[4] کے ساتھ آکر بہتر پیادوں اور بتیس سواروں کے سامنے اس طرح کھڑا ہو جاتا ہے جیسے برابر سرابر کی بات ہو اور باقاعدہ جنگ ہونی ہو۔[5] اور پھر اس صورت حال میں حضرت حسینؓ انہیں

---

[1] طبری ج۶ ص۲۳۷ [2] ایضاً ص۲۳۸ [3] روایت میں ہے کہ ۱۰ کو جب لشکر حسینی خیموں پر پہنچا تو دیکھا کہ خیموں کے ارد گرد آگ روشن ہے جس سے سمجھا جاسکتا تھا کہ مزاحمت کا فیصلہ ہے اور یہ حفاظتی انتظام ہے۔

[4] شہید انسانیت، از مولانا علی نقی صاحب لکھنوی۔ ص۲۷۰ [5] کوئی بھی حکومت اپنے باغیوں کے ساتھ حتی الامکان برابر کے حریفوں والا معاملہ نہیں کرتی چہ جائیکہ اتنا کمزور حریف۔

مخاطب کر کے کچھ فرمانے کے لیے اونٹنی پر سوار ہو کر تشریف لاتے ہیں[1]۔ اور آپ کو پورا موقع دیا جاتا ہے کہ جو کچھ فرمانا ہو فرمائیں۔ چنانچہ حسب روایت وہ فرماتے ہیں:۔

"اے لوگو! میری بات سنو، جلدی سے کام نہ لو یہاں تک کہ مجھ پر جو تمہارا حق ہے اس کے ماتحت تم کو نصیحت و ہدایت کا فرض ادا کر دوں اور تمہارے سامنے یہ حقیقت حال بیان کر دوں کہ میں تمہاری جانب کیوں آیا۔ اگر تم نے میرے بیان کو صحیح سمجھتے ہوئے تسلیم کر لیا اور میرے ساتھ انصاف سے کام لیا تو یہ تمہاری خوش قسمتی ہو گی۔ اور تمہیں معلوم ہو گا کہ تمہارے لیے میری مخالفت کی کوئی وجہ ہو ہی نہیں سکتی اور اگر تم نے میرے بیان کو قبول نہ کیا اور انصاف سے کام نہ لیا تو تم سب مجتمع کر لو اپنی طاقتوں کو اور اکٹھا کر لو جس جس کو چاہو اپنے ہم خیالوں میں سے اور کوئی کوشش اٹھا نہ رکھو۔ پھر پوری طاقت سے بغیر ایک دم کی بھی مہلت دیئے ہوئے میرا خاتمہ کر دو۔ میرے لیے وہ پروردگار کافی ہے جس نے قرآن کو نازل کیا اور وہی اپنے نیک عمل بندوں کا مددگار ہے۔"

راوی کہتا ہے کہ حضرت حسین کے یہ ارشادات جب (خیموں میں) ان کی بہنوں اور بیٹیوں نے سنے تو وہ چیخیں چلائیں اور روئیں اور ان کی آواز بلند ہو کر باہر پہنچی تو آپ نے اپنے بھائی عباس اور اپنے بیٹے علی کو بھیجا کہ جاؤ انہیں چپ کراؤ، کس قدر یہ لوگ رو رہی ہیں۔ پھر جب وہ چپ ہو گئیں تب آپ نے از سر نو حمد و ثنا سے تقریر شروع کی اور فرمایا:۔

"ذرا تم میرے نام و نسب پر غور کرو اور دیکھو تو میں کون ہوں۔ پھر اپنے گریبانوں میں منہ ڈالو اور غور کرو کہ کیا تمہارے لیے میرے خون کا بہانا اور میری ہتک حرمت کرنا جائز ہے؟ کیا میں تمہارے نبی کا نواسہ نہیں ہوں" اور اسکے

---

[1] طبری ج ٦ ص ٢٣٢

وصی اور اور ان کے چچا زاد بھائی اور ان پر سب سے پہلے ایمان لانے والے اور ان کی تصدیق کرنے والے کا فرزند نہیں ہوں؟ کیا حمزہ سید الشہداءؓ میرے باپ کے چچا اور جعفر طیار خود میرے چچا نہیں تھے؟ کیا حدیث جو زبان زد خلائق ہے تمہارے کانوں تک نہیں پہنچی کہ حضرت رسولِ خدا نے میرے اور میرے بھائی کے بارے میں فرمایا تھا کہ "یہ دونوں جوانانِ اہلِ جنت کے سردار ہیں؟" اگر تم میری بات کو سچ سمجھتے ہو اور حقیقۃً وہ سچ ہی ہے (اس لیے کہ میں نے جب سے یہ جانا کہ اللہ جھوٹ بولنے والے سے ناراض ہوتا ہے اور خود اس کا جھوٹ بھی اسے نقصان دیتا ہے تب سے میں نے کبھی جھوٹ کا ارادہ نہیں کیا) پھر تو کوئی بات نہیں اور اگر تم میری بات کو غلط سمجھو تو اسلامی دنیا میں ابھی ایسے اشخاص ہیں جن سے اگر تم پوچھو تو بتلا دیں گے۔ پوچھو جابر بن عبداللہ سے، ابوسعید خدری سے، سہل بن سعد ساعدی سے، زید بن ارقم سے، انس بن مالک سے وہ تمہیں بتلائیں گے کہ انھوں نے رسالت مآب سے اپنے کانوں سے اس حدیث کو سنا ہے، پھر کیا یہ تمہیں میری خونریزی سے روکنے کیلئے کافی نہیں ہے[1]؟"

راوی کہتا ہے کہ "اس موقع پر شمر آپ کا قطع کلام کرتے ہوئے بولا کہ "میں خدا کی عبادت کنارے پر کھڑے ہو کر کرنے والوں میں سے (یعنی منافقوں میں سے) ہوں اگر ذرا بھی سمجھا ہوں کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔" حبیب بن مظاہر یکے از رفقاء حسینؑ نے جواب میں کہا کہ واللہ میں تو سمجھتا ہوں کہ تو اللہ کی عبادت ایک کنارے پر نہیں ستر کناروں پر کھڑے ہو کر کرتا ہے (یعنی پرلے درجے کا منافق ہے) اور میں گواہی دیتا ہوں کہ تو سچ کہہ رہا ہے کہ تیری سمجھ میں حضرت کی بات ذرا بھی نہیں آ رہی کیونکہ اللہ نے تیرے دل پر مہر لگا دی ہے۔"

اس کے بعد حضرت حسینؑ نے سلسلۂ تقریر دوبارہ جاری کرتے ہوئے فرمایا۔

"اگر تمہیں اس حدیث کی صحت میں پھر بھی شک ہے تو کیا اس میں بھی شک ہے

---

[1] مطلب یہ ہے کہ جو لوگ [illegible] روایت گھڑ کر بیان کرنے کے عادی ہیں انھیں شاید یہی ماننے سے اختلاف ہو کہ یہ سب گھڑی ہوئی روایت ہے۔

کہ میں تمھارے رسول کا نواسہ ہوں، اور خدا کی قسم مشرق سے مغرب تک کوئی بھی رسولِ خدا کا نواسہ میرے سوا موجود نہیں ہے، نہ تم میں اور نہ تمھارے سوا کسی دوسری قوم میں۔ بس میں ہی ایک تمھارے نبی کا نواسہ ہوں۔ ذرا بتاؤ تو سہی کہ تم کیوں میرے درپے ہو؟ کیا کسی مقتول کا بدلہ لینے کو جس کو میں نے قتل کیا ہے؟ یا کسی مال کے سلسلے میں جس کو میں نے تلف کر دیا ہے! یا کسی کو زخم لگایا ہے جس کا قصاص مطلوب ہے؟

راوی کہتا ہے کہ "کوئی جواب کسی طرف سے نہیں ملا" تو آپ نے نام لے لے کر ان میں سے بعض کو مخاطب کیا۔

"اے شبث بن ربعی، اے حجار بن ابجر، اے قیس بن اشعث، اے یزید بن حارث کیا تم نے مجھے نہیں لکھا تھا کہ "باغات میں بہار ہے، کھیتیاں سرسبز ہیں، چشمے ابل رہے ہیں، اور مسلح لشکر آپ کی پذیرائی کو چشم براہ ہیں۔ پس قدم رنجہ فرمائیے؟ ان لوگوں نے جواب دیا کہ نہیں، ہم نے تمھیں کوئی خط نہیں لکھا یہ سن کر ارشاد ہوا۔ اللہ اکبر! اتنا بڑا جھوٹ! قسم ہے خدا کی تم نے لکھا تھا۔"

اس کے بعد آپ نے فرمایا:۔

"اے لوگو! اگر تمھیں میرا آنا ناپسند ہے تو مجھے چھوڑ دو کہ روئے زمین پر چلا کہیں اپنے لیے امن و امان کی جا سمجھوں چلا جاؤں۔ اس پر قیس بن اشعث نے کہا کہ آپ اپنے ابنِ عم کا حکم کیوں نہیں مان لیتے؟ آپ کو کوئی پریشانی لاحق نہیں ہوگی۔ جو آپ چاہیں گے وہی آپ کے ساتھ ہوگا۔ حضرت نے فرمایا: تم اپنے بھائی — محمد بن اشعث — کے بھائی ہی تو ہو۔ کیا تمھاری خواہش ہے کہ بنو ہاشم تم پر مسلم بن عقیل کے علاوہ کسی دوسرے خون کا بھی دعویٰ[1]

---

[1] مسلم بن عقیل کے واقعہ میں گزر چکا ہے کہ ان کی گرفتاری محمد بن اشعث کے ذریعہ ہوئی تھی۔

کریں۔ نہیں خدا کی قسم میں ذلت کے ساتھ اپنا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں نہیں دوں گا۔ اور نہ غلاموں جیسے اقرار تمہارے آگے کروں گا۔ اے لوگو، میں تمہارے رب کی اور اپنے رب کی پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ تم مجھ کو سنگسار کرو، اور میں پناہ مانگتا ہوں ہر متکبر سے جسے یوم حساب پر ایمان نہیں۔"

راوی کہتا ہے کہ "اس کے بعد آپ نے اونٹنی کو بٹھایا، اتر پڑے اور عقبہ بن سمعان (خادم) کو حکم دیا کہ اسے باندھ آئے اور اب دشمن آپ کی طرف بڑھنے لگا۔"[1]

حضرت حسینؑ کی یہ مبینہ تقریر اس سوال پر غور کرنے کے لیے من و عن نقل کی گئی ہے کہ جب امیر لشکر عمر بن سعد کو اتنے سخت احکام بھیجے گئے جیسے کہ اوپر طبری کی روایتوں سے نقل کیے گئے۔ وہ دو آدمی انہی روایتوں کے مطابق، ان تاکیدی احکامات کے ساتھ بھیجے گئے ہوں کہ اگر عمر بن سعد حسین کو ڈھیل دینے اور معاملے کو طول دینے کی روش سے باز نہ آئے تو اس کی گردن کاٹ کر ہمارے پاس بھیج دی جائے اور معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لیا جائے، کیا اس سب کے باوجود (اور مزید اس کے باوجود کہ ایک شب کی جو آخری مہلت حضرت حسین کو ۹ کی شام کو دی گئی تھی وہ بھی ختم ہو گئی اور ان کی طرف سے سر تسلیم خم کرنے کی بات سامنے نہیں آئی) یہ سمجھ میں آنے والی بات ہے کہ ۱۰ کی صبح کو عمر بن سعد اپنا لشکر لے کر خیام حسینی پر آئے تو بجائے اس کے کہ فوراً کوفے کے احکام کی تعمیل شروع کرے، وہ حضرت حسینؑ کو موقع دیتا ہے کہ اس کے ساتھیوں میں اپنے ایک طویل خطاب کے ذریعہ کوفے اور دمشق کی حکومت کے خلاف جذبات پیدا کرنے کی بھرپور کوشش کریں؟ حقیقتاً یہ قابل تصور بات بھی نہیں ہے، چہ جائیکہ بطور واقعہ پیش آئی ہو، ہاں کوئی حضرت حسینؑ کے لیے معجزہ کی قدرت کا قائل ہو تو اس کے لیے شاید یہ بات قابل تصور ہو سکتی ہو۔

---

[1] طبری ج ۲ ص ۲۴۲-۲۴۳ حضرت کی تقریر کے آغاز سے یہاں تک اقتباسات کے ترجمے میں اپنی سہولت کی خاطر ہم نے قبلہ علی نقی صاحب کے ترجمے سے فائدہ اٹھایا ہے لیکن کلیتہً انحصار نہیں کیا گیا۔

معاملہ کا ایک اور پہلو

اس سوال سے قطع نظر جس کی بنیاد تقریر کے ماحول اور موقع پر رکھی گئی ہے اور اسی موقع و محل کے پیشِ نظر ہم مجبور ہوئے ہیں کہ اس تقریر کی واقعیت میں کلام کریں، (اس سے قطع نظر) تقریر میں داخلی شہادتیں بھی اس بات کی صاف نظر آ رہی ہیں کہ یہ واقعہ نہیں کچھ لوگوں کی تخیلی قوت کا کرشمہ ہے۔ عہد نامۂ جدید کی انجیل مرقس جو حضرت عیسےٰ علیہ السلام کو تختۂ دار پر چڑھا ہوا دکھاتی ہے وہ آپ کی زبانِ مبارک سے یہ کلمۂ شکایت و جزع و فزع کہلواتی ہے کہ:-

اِلوھی اِلوھی لما سبقتنی[لہ] اے میرے اللہ! اے میرے اللہ تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا ہے؟

اسلامی ذہن کی رو سے یہ کیسا بڑا داغ ہے جو اللہ کے ایک جلیل القدر پیغمبر کے دامنِ صبر و رضا پر لگایا گیا ہے۔ مگر حضرت حسین کی طرف مذکورہ بالا تقریر منسوب کرنے والوں نے اس سے کہیں زیادہ بڑا داغ نواسۂ رسولؐ کے دامانِ عز و شرف کو لگایا ہے۔ اہلِ انجیل نے پیغمبر کو بہرحال صرف خدا ہی کے سامنے رُلایا اور اس سے شکوہ کرایا ہے۔ مگر ان لوگوں نے — پتہ نہیں یہ کس سطح کے لوگ تھے! — حضرت حسین کو ان غدار کوفیوں اور ابن زیاد کے کاسہ لیسوں کے سامنے ہر ہر رُخ سے اور ہر ہر رنگ میں جان کی امان مانگتے دکھایا ہے جن کی طرف رخ کرنے کی اجازت بھی غیرت کے قانون میں نظر نہیں آتی۔ اور یہ تو عام قانونِ غیرت کی بات ہے یہاں تو معاملہ نجلِ رسولؐ کی غیرت کا اور ہاشمی خون کی غیرت کا ہے۔

وہ مرتبہ ناشناس اور زمانہ ساز جنھوں نے کل آپ کے بڑے بھائی حضرت حسن مجتبیٰ کو زک دینے اور رسوا کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور جو آج چند ٹکوں یا چھوٹے بڑے مرتبوں کی خاطر آپ کا خون بہانے کو ... لشکرِ اعداء میں شامل ہو گئے تھے جن میں شمر جیسے زباں دراز بھی تھے جس نے ابھی ابھی آپ کے خیموں کے گرد آگ کے الاؤ دیکھ کر

پکارا تھا:۔

یاحسین استعجلت النار   اے حسینؑ یہ آگ کی ایسی جلدی کر دی کہ قیامت سے
فی الدنیا قبل یوم القیامۃ۔   پہلے دنیا ہی میں اس کا بندوبست کر لیا؟

ان بے ادبوں اور مسخ فطرتوں کے سامنے آپ واسطے دینے اٹھے اپنی نسبی عظمتوں کا! نواسۂ رسولؐ ہونے کا! ابن فاطمہ بنت الرسولؐ ہونے کا! ابن علی مرتضیٰؓ وصیٔ رسولؐ ہونے کا! حضرت حمزہ سید الشہداءؓ سے اپنی قرابت کا اور جعفر طیارؓ سے رشتے کا! کیا واقعی یہ باتیں کسی ایسے آدمی کے لیے قابل تصور ہیں جو سچ مچ حضرت حسینؓ کا کچھ مرتبہ سمجھنے کے قابل ہو؟ اور یوں بھی یہ واسطے دینا تو کسی بھی حالت میں حضرت حسینؓ جیسے مرتبہ کے انسان کے لیے موزوں بات نہیں ہو سکتی۔ بہت کم شعور اور کم سطح کے لوگ ایسے واسطوں کا استعمال کرتے ہیں۔

آگے آئیے۔ تقریر کے اس حصے پر وہی شمر ایک بار پھر زبان درازی کا مظاہرہ کرتا ہے جو اوپر گذر چکا اور خالص لوہی لہجے میں کہتا ہے ع۔

سمجھ میں کچھ نہیں آیا یہ تم نے کیا سنایا تھا

مگر افسوس کہ یہ خطاب حسینی کے مصنف اس کے بعد حضرت والا کی زبان سے کہلواتے ہیں کہ چلو تمہیں میرے اور میرے بھائی کے بارے میں جوانان جنت کی سرداری والی حدیث کی صحت کا یقین نہیں تو کیا یہ بھی تمہارے لیے ممکن ہے کہ میرے نواسۂ رسولؐ ہونے میں شک ظاہر کرو؟ کیا مشرق و مغرب میں ایک میرے سوا کوئی اور ہے جسے نواسۂ رسولؐ ہونے کا دعویٰ ہو؟ کل روئے زمین پر میں تنہا ہوں جو اس شرف کے ساتھ مشرف ہو۔ بتاؤ اس کے باوجود تم کیسے میرے خون کے پیاسے ہو؟

اور ابھی بس کہاں؟ وہ شبث بن ربعی، وہ حجار بن ابجر، وہ قیس بن اشعث اور یزید بن حارث جن کے دستخطی خط حضرت والا کی تحویل میں موجود تھے جن میں بڑے اشتیاق سے کوفے میں قدم رنجہ فرمانے کی دعوت دی گئی تھی۔ —— یہ

جا ملے[1] اپنی بے غیرتوں کے ساتھ صفِ اعداء میں اپنے اپنے قبیلوں کی کمانیں سنبھالے کھڑے تھے۔ حضرت حسین کو ان بے غیرتوں سے بھی تو نام بنام مخاطب ہو کر ان کے خطوط یاد دلاتے دکھایا گیا ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ — پتہ نہیں یہ کون لوگ تھے جنھوں نے اس طرح دانستہ یا نادانستہ سبطِ رسولؐ کی رسوائی کا سامان کیا ہے؟

اور ہاں دخترانِ خانوادۂ نبوت جن کے ذکر کے ساتھ ساتھ صبر و ضبط اور عزیمت و خودداری کی صفات تصور میں آتی ہیں۔ وہ نقشِ فاطمی ذہن میں اُبھرتا ہے جو میدانِ اُحد میں قائم ہوا تھا کہ سیدۂ فاطمہ کسی آہ و بکا کے بجائے اپنے والد ماجد اور ہمارے آقائے نامدار) کی مرہم پٹی کا حوصلہ دکھا رہی ہیں اور دوسروں کا حوصلہ بڑھا رہی ہیں۔ اور پھر عائشۂ صدیقہؓ کا وہ نقش کہ زخموں کو دھونے اور زخمیوں کو پانی پلانے کے لیے مشک اٹھائے دوڑ رہی ہیں۔ ان صفات کی جگہ پر ہمیں یہ کربلا میں "خطابِ حسینی" کا قصہ سنانے والے سناتے ہیں کہ ابھی تلوار چلی نہیں، کوئی معرکہ ہوا نہیں، کوئی خون نہیں، کوئی زخم نہیں، فقط ایک جملہ حضرت حسین کی زبان سے ابتدائے تقریر میں نکلا کہ "اگر تم نہیں مانتے تو پھر ایک دم کی بھی مہلت دیئے بغیر پوری طاقت سے اٹھو اور میرا خاتمہ کر دو" بس اتنا سننا تھا کہ خانوادۂ نبوت کے خیمے ماتم کدے بن گئے اور آہ و بکا کا وہ شور برپا ہوا کہ حضرت کو تقریر روک دینا پڑی۔

حقیقت کم از کم راقم کے نزدیک) یہ ہے کہ پوری تقریر اور اس کے درمیانی فقرے گویا لکھے ہی اسی نقطۂ نظر سے گئے ہیں کہ واقعۂ کربلا کے نام پر ایک ماتمی فضا پیدا کرنے میں مدد مل سکے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ واقعیت سے ان کا دور دور بھی کوئی تعلق ہی نہیں، نہ ہو سکتا ہے۔ واقعیت اگر ہے تو اُس دعا میں ضرور نظر آتی ہے جو تقریر والی روایت سے متصلاً پہلے کی روایت میں طبری[2] نے دی ہے۔ روایت یہ ہے کہ جب (۱۰ کی) صبح کو دشمن کا لشکر آ پہنچا تو

---

[1] طبری ج ۶ صفحہ ۱۹۷ پر ان لوگوں کے خط اور ناموں کا ذکر ہے۔ وہ نام چار سے زیادہ ہیں۔ البتہ قیس بن اشعث کا نام ان میں نہیں ہے۔ [2] طبری ج ۶ ص ۲۲۰-۲۲۱

حسینؓ نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور (یوں بارگاہِ احدی میں) عرض کناں ہوئے:۔

> ’’خداوندا تو ہی میرا سہارا ہے ہر تکلیف میں، میرا آسرا امید ہے ہر کلفت میں، اور تجھ ہی پر ہر مہم میں جو مجھے درپیش ہو، میرا بھروسہ ہے۔ کتنے ہی حالات ایسے ہیں جن کے مقابلے میں دل کمزور پڑ جاتا ہے اور تدبیر کی راہیں بند نظر آتی ہیں، دوست ان میں ساتھ چھوڑ دیتے ہیں اور دشمن طعنہ زنی کرنے لگتے ہیں، میں ان حالات کو تیرے حضور پیش کرتا اور تیری بارگاہ میں فریاد کیا کرتا ہوں، اس لیے کہ تجھے چھوڑ کر کسی اور سے لو لگانا میں جانتا نہیں۔ پس تو حالات کی تکلیف اور ان کی ناسازگاری کو دور کرتا اور راہ نکالتا ہے۔ یقیناً تو ہی ہر نعمت کا مالک، ہر بھلائی کا سرچشمہ اور ہر امید کا مرکز ہے۔‘‘

یہ دعا اگر معیارِ روایت کے اعتبار سے کوئی کمزوری نہیں رکھتی تو اس کی واقعیت تسلیم کرنے میں ذرا بھی اشکال نہیں کیونکہ یہ پہلی تقریر کے برعکس موقع و محل کا عین تقاضہ ہے اور حضرت حسینؓ سے پورے طور پر متوقع اور ان کے شایانِ شان ہے۔

زہیر بن قین کی تقریر

دو تقریریں جو اوپر درج ہو گئیں، ایک حُر بن یزید کی اور ایک خود حضرت حسینؓ کی، ان میں سے کسی ایک کے لیے بھی اس ماحول اور صورتِ حال میں جو کربلا کے سلسلے کی روایتیں بتاتی آ رہی تھیں، کوئی گنجائش نظر نہیں آتی۔ مگر جیسا کہ عرض کیا گیا یہاں تو ایسی تقریروں کا ایک لمبا سلسلہ ہے۔ لگتا ہے کہ معرکۂ کارزار نہیں، میلہ ٹھٹھا تھا۔ طوالت ہوئی جاتی ہے مگر ایک تقریر اور سن لیجیے۔ یہ زہیر بن قین نام کے ایک ساتھی ہیں۔ اور ان کی بھی کچھ ایسی ہی اہمیت ہے جیسی حُر بن یزید کی۔ ایک ایسا شخص اس تقریر کا راوی بتایا گیا ہے جو ابن زیاد کی فوج میں شامل تھا نہ کہ حضرت حسینؓ کے ساتھیوں میں۔ یہ کہتا ہے کہ

(حضرت حسینؓ تقریر کے بعد پیچھے ہٹے اور) ہم آگے بڑھے تو زہیر بن قین نکل کر آئے ۔ گھوڑے پر سوار اور اسلحہ سے لیس تھے، انھوں نے ہمیں مخاطب کر کے کہا:۔

"کوفے والو! خبردار، خدا کے عذاب سے خبردار، ایک مسلمان پر دوسرے مسلمان بھائی کا حق ہے کہ اس کی خیر خواہی کرے۔ ہم لوگ اس وقت بھائی بھائی ہیں، ایک دین اور ایک ملّت پر ہیں، جب تک ہمارے درمیان تلوار نہیں چلنے لگتی، ہاں اگر تلوار چل گئی تو پھر یہ رشتہ خود بخود کٹ جائے گا اور تم الگ اور ہم الگ ملت ہو جائیں گے۔ دیکھو ہمیں تمھیں اللہ نے ذرّیت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ آزمایا ہے تاکہ دیکھے کہ ہم تم کیا کرتے ہیں۔ سو ہم تمھیں دعوت دیتے ہیں کہ ان کی مدد کرو اور سرکش عبید اللہ بن زیاد کا ساتھ چھوڑ دو۔ اس لیے کہ تمھیں ان کی حکومت سے سوائے دکھ اور رنج کے اور کچھ نہ ملے گا جو تمھاری آنکھوں میں سلائیاں پھرواتے تمھارے ہاتھ پاؤں قطع کراتے تم کو سولیاں دلواتے اور تمھارے نیک اعمال قرّاء اور عابد مثلاً حجر بن عدی اور ان کے اصحاب اور ہانی بن عروہ وغیرہ کو قتل کراتے رہے۔"

راوی کہتا ہے کہ اس پر ہماری طرف والوں نے زہیر کو برا بھلا کہا اور عبید اللہ بن زیاد کی تعریفیں کیں اور کہا کہ ہم تمھیں اور تمھارے صاحب (حضرت حسینؓ) اور ان کے سب ساتھ والوں کو اس کے بغیر نہیں چھوڑیں گے کہ یا قتل کریں اور یا گرفتار کر کے عبید اللہ بن زیاد کے پاس روانہ کریں۔ اس پر زہیر بن قین پھر عرض پرداز ہوئے کہ:۔

"اے اللہ کے بندو! فاطمہ رضوان اللہ علیہا کی اولاد سمیہ کی اولاد کے مقابلے میں تمھاری محبت اور مدد کی زیادہ مستحق ہے۔ اور اگر تم مدد نہیں کر سکتے تو میں تمھارے لیے اس بات سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ تم ان کو قتل کرو، تم اس شخص (حسینؓ) کے اور اس کے چچا زاد یزید بن معاویہ کے درمیان سے

ہٹ جاؤ۔ قسم میری جان کی۔ یزید کے لیے تمہاری اطاعت کو قتل حسین کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اس کے بغیر بھی تمہاری اطاعت پر راضی رہے گا۔[1]

ایک خاص نکتہ

بہ محل صورت حال اور موقع و محل کے اس نکتے کے علاوہ جس کی بنا پر ہمارے لیے یہ ماننا مشکل ہو رہا ہے کہ فی الواقع یہ تقریریں میدان کربلا میں ہوئی تھیں، زہیر بن قین کی تقریر کے بارے میں خاص طور سے یہ نکتہ بھی توجہ طلب ہے کہ اس میں جو کچھ لعنت ملامت کو دخل ہے اور جو کچھ اپیل اور فہمائش کے جملے ہیں، اُن سب کی بنیاد بس یہ ہے کہ حضرت حسین اور ان کے اہل خانہ اولاد فاطمہ رضی اللہ عنہا اور ذریت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، حالانکہ ان صاحب کے تعارف میں کہا گیا ہے کہ یہ اصل میں عثمانی گروہ کے تھے، اور اسی لیے اتفاق سے جو حج سے واپسی میں حضرت حسین کے قافلے کا ساتھ ہو گیا تو منازل پر فاصلے سے اپنا خیمہ لگاتے اور حضرت حسین کے سائے سے بھی بچنا چاہتے تھے[2]۔ مگر حضرت حسین کے اس سفر کے حالات میں آتا ہے کہ وہ راستے کے تقریباً ہر اہم آدمی کو بالخصوص جس کا کوفے سے تعلق تھا، اپنے ساتھ ملانا چاہتے تھے چنانچہ آپ نے ایک دفعہ ان کو بلا بھیجا تو ان کی بیوی نے شرم دلا کر کہ "بہر حال ابن بنت رسول اللہ ہیں، آپ کو ان کی دعوت پر جانا چاہیے" ان کو خیمہ حسینی میں جانے پر مجبور ہی کر دیا اور پھر وہ آپ کی طرف سے آپ کی مہم میں رفاقت کی دعوت بھی رد نہ کر سکے اور جان و دل سے ساتھ ہو گئے۔ بہر حال ایک عثمانی الاصل آدمی بھی صرف اسی "ذریت محمد" اور "ابن بنت رسول اللہ" کے حوالے

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۴۳ ۔ [2] یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کو منزل بہ منزل ساتھ چلنے کی ضرورت کیا تھی جو یہ ساتھ ہو کر بھی دور رہنے کا اہتمام کرنا پڑتا تھا۔ یہ اس فاصلے کو کم از کم ایک دو منزل کا فاصلہ بھی تو بنا سکتے تھے!

سے یزیدی کوفیوں کو لعنت وملامت یا ان سے اپیل کرے یہ کچھ سمجھ میں آنے والی بات تھی بے شک یہ بھی ایک نہایت مناسب عنوان اور حوالہ تھا۔ مگر اسی پر انحصار اور صرف اسی حوالے سے حضرت حسین اور ان کے اہل خانہ کی عظمت اور ان کا حق پہچاننا ابن زیاد کے مقابلے میں ان کے لیے صرف اسی حوالہ کو وجہ ترجیح بنانا یہ تو شیعیت کا مزاج ہے اور اس لیے جس طرح حضرت حسین کی تقریر میں علاوہ حالات اور ماحول وغیرہ کے بعض اور پہلو بھی اس تقریر کو غیر واقعی اور جعلی قرار دینے والے اور اسی کے ساتھ اس جعلسازی کی بنا بھی سامنے لانے والے ہیں۔ اسی طرح زہیر بن قین کی تقریر کا یہ پہلو بھی اس کی غیر واقعیت کو ظاہر کرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس جعلی کارروائی کے پیچھے کام کرنے والے اس نقطۂ نظر کو بھی صاف سامنے لے آتا ہے کہ اس طرح کی تقریریں اگر حضرت حسین کی موجودگی میں عثمانی الاصل لوگوں کی زبان سے ادا کرادی جائیں تو شیعی تصورات اور طرزِ فکر کو ایک اچھی اساس اور بنیاد ملتی ہے[1]۔

سبھی کچھ تصنیف

جس طرح یہ تقریریں بول رہی ہیں کہ میدانِ کربلا میں ہوئی نہیں بلکہ بعد میں تصنیف کی گئی ہیں اسی طرح ——— جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا تھا ——— یوم عاشور کی تقریباً پوری کہانی کا یہی حال نظر آتا ہے۔ مثلاً:-

(۱) مبارزانہ جنگ[2] کے قصے

تقریروں کا سلسلہ ختم ہوتا ہے تو مبارز طلبی[3] شروع ہوجاتی ہے، اور عمر بن سعد جو

---

[1] مجھے اس امکان سے انکار نہیں ہے کہ محرک نقطۂ نظر اس کے علاوہ کچھ اور بھی ہو سکتا ہے۔ [2] ایک صف سے ایک سوار نکل کر پکارتا ہے کہ کوئی اس کے مقابلے کو آئے۔ اس طرح دونوں صفوں سے ایک ایک آدمی نکل کر لڑتا ہے۔ [3] مقابل کو پکارنا۔

ابن زیاد کی ساری تنبیہات کے خلاف ان حضرات کو تقریریں کر کے اس کے اپنے کیمپ میں بغاوت کی آگ بھڑکانے اور بے یقینی اور بے دلی پھیلانے کا پہلے ہی کافی موقع دے چکا تھا۔ تقریروں کے بعد حُر بن یزید کے حملہ آور ہونے اور دو آدمی بھی اپنی صف کے اس کے ہاتھوں مارے جانے کے باوجود ابن زیاد کے انتہائی سخت احکام کی تعمیل میں بھرپور یلغار کر کے قصہ ختم کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ بلکہ صف حسینی سے جو مبارزانہ جنگ کا سلسلہ اب شروع ہوتا ہے، جو غیر معمولی قلت تعداد کی بنا پر اس صف کے لیے مناسب ترین اور پسندیدہ ترین صورت جنگ ہو سکتی تھی، تو وہ اس میں بھی ان کی معاونت شروع کر دیتا ہے۔ اور شمر جو اپنی آمد کے بعد سے برابر اپنی موجودگی کا اظہار طرح طرح سے کر رہا ہے۔ ابن سعد کی اس بے عملی کے معاملے میں وہ ذرا بھی بالکل نظر نہیں آتا، حالانکہ وہ بھیجا صرف اسی لیے گیا ہے کہ ابن سعد کی سست روی اور بے عملی کا سلسلہ روک دے بس ہے یہ سمجھ میں آنے والی کوئی بات کہ وہاں جنگ مبارزانہ ہوئی ہوگی؟

(ب) صبح سے سہ پہر تک کے معرکے

ابن زیاد کے سخت احکام کی اور شمر جیسے حسین دشمن[1] کو تعمیل احکام کے لیے مسلط کیے جانے کی روایتیں جس طرح اس بات کو باور کرنے کی اجازت نہیں دیتیں کہ کربلا میں مبارزانہ جنگ کا سلسلہ چلا ہوگا۔ یہی روایتیں اور لشکر ابن سعد کی تعداد والی روایتیں (کم سے کم ۴۔۵ ہزار ورنہ شیعہ ماخذ کے مطابق کم سے کم تیس چالیس ہزار) اس بات کا تصور مشکل بنا دیتی ہیں کہ اس لشکر نے قافلۂ حسینی کو کوئی باقاعدہ جنگ کرنے کا موقع دیا ہوگا۔ یہ کیس اور معاملہ کسی جنگ کا تھا ہی نہیں، یہ منتظم مزاحمت کا اور مزاحمت کو توڑنے کا کیس تھا۔ ابن سعد کی اس

---

[1] شمر کا نام صفین کی معرکہ آرائی میں بھی ملتا ہے اور بہت واضح طور پر تو نہیں لیکن بظاہر وہ حضرت علیؓ کی صف کا آدمی نظر آتا ہے۔ اگر فی الواقع ایسا ہی ہے تو اس کی یہ دشمنی بھی عجیب ہے۔

نفسیاتی کیفیت کو دیکھتے ہوئے جس کی گواہی قصے کی تمام روایتیں دے رہی ہیں کہ ایک طرف ابن زیاد کی فرمانبرداری بھی منظور تھی دوسری طرف حضرت حسینؓ کی سلامتی بھی عزیز (اس کیفیت میں اور کم از کم بیس پچیس گنا زیادہ نفری کے ساتھ) واقعہ کربلا کی اس کے سوا کوئی اور صورت از روئے عقل و عادت نہیں ہونی چاہیے تھی کہ ابن سعد کی طرف سے ان لوگوں کو گھیر کر اور بے قابو کر کے زیادہ سے زیادہ تعداد میں سلامتی کے ساتھ گرفتار کر لینے کی کوشش ہوتی اور ادھر سے مزاحمت۔ یہ مزاحمت طاقتور ہوتی، اور بظاہر طاقتور ہونی ہی چاہیے تھی، تو ابن سعد کی کوشش ناکام ہوتی، اور زیادہ سے زیادہ تعداد اپنی مزاحمت پر قربان ہو جاتی۔ لیکن اس میں صبح سے سہ پہر تک کا وقت لگ جاتا اور باقاعدہ "دو لشکروں" کے درمیان جنگ کی صورت بنتی، جیسا کہ روایتیں کہتی ہیں اور مجالس عزا میں دہرایا جاتا ہے، یہ کوئی سمجھ میں آنے والی بات ہرگز نہیں۔ بظاہر یہ بیان واقعہ کے بجائے واقعہ کی اسی طرح کی ایک مبالغہ آمیز اور انتہا پسندانہ تعبیر ہے جس طرح کی دوسری انتہا پسندانہ تعبیر اس کے مقابل ایک روایت میں یوں پائی جاتی ہے کہ ابن زیاد نے جس شخص زحر بن قیس کو حضرت حسینؓ کا سر لے کر یزید کے پاس بھیجا۔ اس نے یزید کے پاس پہنچ کر کہا کہ:۔

"ابشر یا امیر المومنین بفتح	امیر المومنین مژدہ ہو، اللہ کی طرف سے
اللہ ونصرہ ورد علینا الحسین	فتح و نصرت کا۔ حسین بن علی اپنے
بن علی فی ثمانیۃ عشر من	اٹھارہ گھر والوں اور ساٹھ شیعوں
اھل بیتہ وستین من	کے ساتھ آ پہنچے تھے۔ (اس خبر پر)
شیعتہ فسرنا الیھم فسألناھم	ہم لوگ ان کی طرف چلے اور ہم نے
ان یستسلموا وینزلوا علی حکم	مطالبہ کیا کہ اپنے آپ کو ہمارے سپرد
الامیر عبید اللہ بن زیاد	کر کے امیر عبید اللہ بن زیاد کے فیصلے
او القتال، فاختاروا القتال	پر چھوڑ دیں ورنہ قتال کے لیے تیار

على الاستسلام فعدونا عليهم
مع شروق الشمس فاحطنا بهم
من كل ناحية حتى اذا اخذت
السيوف مأخذها من هام
القوم يهربون الى غير وزر و
يلوذون منا بالآكام والحفر
لواذا كما لاذ الحمائم من
صقر فوالله يا امير المؤمنين
ما كان الا جزر جزور او
نومة قائل حتى اتينا
على آخرهم ..... [1]

ہوں۔ ان لوگوں نے قتال پسند کیا۔
نتیجہ یہ کہ ہم لوگوں نے سورج نکلتے ہی
ان پر چڑھائی کی اور ہر طرف سے گھیر لیا
حتیٰ کہ جب تلواروں نے ان کی کھوپڑیوں
پر کام شروع کیا تو جدھر منہ اٹھا بھاگ
نکلے کہیں ٹیلوں کی کہیں گڑھوں کی
پناہ ڈھونڈنے لگے جیسے کہ کبوتر شکرے
کے سایہ سے بچا کرتے ہیں۔ پس اے
امیر المومنین قسم ہے خدا کی ہمیں ان کا
خاتمہ کرنے میں اس سے زیادہ وقت
نہیں لگا جتنا ایک قصاب کو ایک
اونٹ ذبح کرنے میں یا دوپہر کو کسی
شخص کے قیلولہ کرنے میں لگتا ہے۔

ظاہر ہے کہ جس طرح یہ روایت بیجا مبالغے پر مبنی ہے یہی حال صبح سے سہ پہر تک کی روایتوں کا بھی سمجھنا صحیح ہے۔

لمبے وقت کے دامن میں لپٹے قصے

لمبا وقت لگنے کی روایتیں جب ناقابلِ اعتبار اور ناقابلِ قبول ٹھہر جاتی ہیں تو پھر اس لمبے وقت کے دامن پر جو اور بہت سی کہانیاں ٹانک دی گئی تھیں وہ بھی کسی اعتبار کے لائق کہاں رہ جاتی ہیں؟ انھیں کہانیوں میں فرزندانِ اہلبیت کی لاشوں کا ایک کے بعد

---

[1] طبری ج ۲ صفحہ ۲۹۵

ایک کر کے تڑپنا، حضرت حسین کا ان کے پاس دوڑ دوڑ کے جانا، رنج و الم کے کلمات سے انھیں آخرت کے لیے رخصت کرنا، یا ایک طرف کو لا کے لٹانا۔ حضرت زینب کبریٰ کا روتے تڑپتے بار بار میدان جنگ میں نکل آنا۔ وغیرہ وغیرہ

یہ ساری کہانیاں، جن میں سے کتنی ہی ایسی ہیں جو در اصل حضرت حسین کی شان کو، جیسا کہ ہم آگے بیان کریں گے، داغ لگاتی ہیں، صاف معلوم ہوتا ہے کہ اُس سبائی[1] ذہن کے ماتحت گڑھی گئی ہیں جو برابر فرزندانِ اسلام کی "متاعِ دین و دانش" لوٹ لینے کی جدوجہد میں لگا ہوا تھا اور اسے نواسۂ رسولؐ کی مظلومیت کے نام پر ایک ہوش رُبا قسم کی جذباتی فضا پیدا کر دینے میں اپنے اس منصوبے کی تکمیل کا بہترین سامان نظر آیا؛ اور اور اپنے اس حربے اور مقصد میں وہ خوب خوب کامیاب رہا۔ اسلام کے ناواقف اور ضعیف العقیدہ فرزندوں کی ایک بڑی تعداد اس حربے کا شکار ہو کر اسلام کی شاہراہ (MAIN STREAM) سے ہٹ گئی اور بالکل ایک اجنبی راہ پر "اسلام" ہی کے بلکہ "اصل اسلام" کے نام سے لگ گئی۔ آج جو لوگ اس مذہبِ ماتمِ حسین کے پیرو ہیں، یقین ہے کہ وہ اپنے دلوں سے اسلام دوست ہیں۔ اس مذہب کے اصل بانیوں کی طرح چھپے دشمن نہیں مگر "صیاد"[2] کے اقبال"[4] کا بھی کیا "سحر" ہے کہ اُن کے "صید"[3] کی یہ موجودہ نسل بھی، جو ہماری ہم عصر ہے، اپنی "قید" کی جان و دل سے حفاظت کرنا چاہتی ہے۔ اور اسی مذہب والوں کا کیا، ہر شخص جس مذہب کے ماحول میں پیدا ہو گیا ہے، بے سوچے سمجھے بلکہ سوچ سمجھ کی دعوت سے الا ماشاء اللہ دشمنی کرتے ہوئے اسی مذہب پر جینا اور مرنا چاہتا ہے۔

---

[1] عبد اللہ بن سبا وغیرہ۔ [2] شکاری [3] شکار۔

[4] طائروں پر سحر ہے صیاد کے اقبال کا اپنی منقاروں سے حلقہ کس رہے ہیں جال کا

دامانِ اہلبیت کے لیے ننگ

بہرحال آئیے یومِ عاشورہ کی وہ کہانیاں دیکھیں جن سے دراصل حضرت حسین کی شان اور عظمت کو دھبہ لگتا ہے۔ دھبہ لگانے کو تو وہ "قبل از جنگ" کی تقریر ہی بہت کافی ہے جو اوپر نقل ہو چکی۔ علی مرتضیٰ شیرِ خدا کا بیٹا اور ان بے حیا غدار اور پست کردار لوگوں سے جن کا از خود کیا ہوا احسان بھی اہلِ شرف و عزت کے یہاں قابلِ قبول نہیں ہو سکتا، اپنے والد ماجد کے نام پر، اپنی والدہ خاتونِ جنت کے نام پر، اپنے نانا سید الانبیاءؐ کے نام پر، اپنے چچا جعفر طیار کے نام پر اور اپنے نانا کے چچا سید الشہداء حضرت حمزہؓ کے نام پر اپنی جان کی امان مانگے؟ (جیسا کہ وہ تقریر دکھاتی ہے) اور ایک بار نہیں، عنوان بدل بدل کر بار بار مانگے؟ العیاذ باللہ!

اس تقریر میں ننگ و عار کا یہ پہلو ہرگز کوئی ایسا نکتہ نہیں ہے کہ کوئی آ کے اسے کھولے تو لوگوں پر کھلے۔ بالکل کھلی ہوئی اور عام آدمی کو محسوس ہونے والی بات ہے مگر اس حد تک عام آدمی کہاں جا سکتا ہے کہ روایت میں کلام کرے۔ اس پہلو کا معاملہ تو وہ حضرت حسینؓ پر چھوڑ دے گا کہ ہوگی کوئی مصلحت؛ البتہ یہ بات اس کے دل میں نقش ہو جائے گی کہ حضرت حسینؓ اپنی اصل عظمت یہ سمجھتے تھے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے، فاطمہ بنت رسول اللہ اور علیؓ "وصی رسول اللہ" کے بیٹے ہیں اور آپ دوسرے مسلمانوں سے چاہتے تھے کہ انہیں اس نسبی عظمت سے دیکھا جائے اور اسی کے مطابق ان کے ساتھ معاملہ کیا جائے۔ اصل اہمیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کے نسبی رشتے کی ہو، دینی رشتے پر نظر ہو یا نہ ہو، حالانکہ اسلام میں اصل اہمیت تقویٰ اور تدین کی ہے نہ کہ نسل و نسب کی۔ یہ بات اگر مسلمانوں کے ذہن نشین ہو گئی اور عزت و احترام کے ساتھ قبول کر لی گئی تو سبائی منصوبے کی کامیابی کیلئے پوری بنیاد فراہم ہو گئی[1] رسول اللہ

---

[1] شیعیت کے سلسلے میں عبداللہ بن سبا کا بنیادی کردار ایک مانا ہوا کردار تھا لیکن (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

صلے اللہ علیہ وسلم کی خلافت اور وراثت کو ایک نسبی سلسلہ بنا دیتے اور نسب ہی میں ساری عظمتیں جمع کر دینے کا کام اس کے بعد کچھ مشکل نہیں رہ گیا۔ بس یہ فلسفہ ہے جو اس سراپا ننگ و عار تقریر کے پیچھے کام کرتا نظر آ رہا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

یہی بیماری جو اس تقریر کے ذریعے مسلمانوں کے ذہن میں پیوست کرنے کی کوشش کی گئی تھی اسی کو آگے کی ان کہانیوں سے خوب خوب گہرائی میں اتارنے کی سعی کی گئی ہے کہ آپ اپنے فرزندوں، بھتیجوں، بھانجوں اور بھائیوں کی لاشوں کی طرف دوڑتے ہوئے جاتے اور اس طرح کے کلمات سے اپنے رنج والم اور بے بسی کا اظہار کرتے۔

بُعْدًا لقوم قتلوك ومن خصمهم يوم القيامة فيك جدك[1]	ہلاک ہوں وہ لوگ جنھوں نے تجھے قتل کیا اور جن کے مقابلے میں قیامت کے دن تیرے نانا فریق ہوں۔

اسی طرح کسی رفیقِ کربلا کی جانبازی اور مردانہ کارکردگی پر اُسے شاباش دیتے ہیں تو ان روایتوں کے مطابق بایں الفاظ دیتے ہیں:۔

جزاك الله خيرا عن اهل بيت نبيك[2]	اللہ تمہیں اپنے نبی کے اہل بیت کی طرف سے بہترین بدلہ دے۔

بہرحال یہ تو ایک ضمنی بات کی مثالیں آگئیں۔ اصل منشا یہاں حضرت حسینؓ کی تقریر کے علاوہ اُن مزید کہانیوں کی کچھ نشاندہی ہے جن سے واقعہ میں حضرت موصوف کی شان پر یا آپ کے دیگر اہل بیت کی شان پر دھبہ آتا ہے، مگر دھوم سے مشہور کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) ڈاکٹر طٰہٰ حسین مصری نے جب سے یہ تحقیق پیش کی ہے کہ یہ کوئی حقیقی شخص نہیں بلکہ راویوں کی بنائی ہوئی شخصیت ہے تب سے شیعہ اہل قلم ابن سبا کی شخصیت کا انکار کرنے لگے ہیں لیکن طٰہٰ حسین کی تحقیقات کا حال تو یہ ہے کہ انہوں نے حضرت ابراہیم و حضرت اسماعیل علیہما السلام کے وجود کا بھی انکار کر دیا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے ایک دوسرے مصری محقق ابوالحجری کا مجموعہ مضامین "قصصنا باسماعیل" اس سے طٰہٰ حسین کے یہودی ہم رابطوں کا بھی پتہ چلتا ہے۔

[1] طبری ج ۶ صفحہ ۲۵۶ یہ کلمات جس موقعے سے نقل کیے جاتے ہیں وہ آپ کے بھتیجے قاسم بن حسنؓ کی شہادت کا موقع ہے۔

[2] ایضاً صفحہ ۲۵۵

گئی ہیں اور ہر سال تازہ کی جاتی ہیں۔

سب سے بڑی مثال

اس کی سب سے بڑی مثال وہ روایتیں ہیں جو دکھاتی ہیں کہ حضرت حسینؓ دوسرے رفقاء و انصار ہی کو نہیں اپنے خاندان کے ایک ایک فرد کو بھی، حتیٰ کہ نابالغ بچوں کو بھی[1] اپنے اوپر قربان ہونے کی اجازت دیتے رہے اور جب سوائے ایک بیمار صاحب فراش صاحبزادے علی بن الحسینؓ (زین العابدین) کے اور کوئی نہ بچا تب آپ نے تلوار اٹھائی۔ اول تو اپنے بچوں ہی کو آدمی، اگر مجبور و معذور نہیں ہے تو ہلاکت کے لیے آگے نہیں بڑھاتا یا کم از کم اکیلا نہیں چھوڑتا۔ اور یہاں روایتیں ہمیں باور کرا رہی ہیں کہ نہ صرف صاحبزادے علی اکبر (بعمر ۱۹۔۲۰ سال) کو اکیلا آگے بڑھنے دیا اور پھر دیکھتی آنکھوں اکیلا ہی آخر دم تک لڑنے بھی دیا، بلکہ بھتیجوں اور بھانجوں اور بھائیوں کے ساتھ بھی اُن کی کم عمری کے باوجود یہی معاملہ رکھا! کوئی بتائے کہ کیسے یقین کیا جائے؟ اور یقین کیا جائے تو پھر کیسے حضرت والا کے لیے عقیدت کو ایک شدید احساس کی چبھن سے بچایا جائے؟

ایک تاویل لاطائل

بات خدا لگتی ہے، چنانچہ جو لوگ ان روایتوں کے قائل ہیں وہ بھی اس سوال سے آنکھیں نہ چُرا سکے۔ مگر تاویل کی راہ کہیں بھی بند نہیں ہوتی۔ چنانچہ جناب علی نقی صاحب کی کتاب "شہید انسانیت" جس کا ہم پہلے تذکرہ کر چکے ہیں۔ اس میں بھی یہ سوال

---

[1] یا کمسن قاسم بن حسنؓ کا جو حکم گزرا ہے۔ ان کے بارے میں "شہید انسانیت" میں صراحت ہے کہ بالغ نہیں ہوئے تھے (صفحہ [illegible]) اور شہادت کا جو واقعہ طبری میں ہے اس میں بھی کم عمری کی علامتیں پائی جاتی ہیں، مثلاً زخم کھا کر ہائے چچا پکارنا وغیرہ۔

سامنے لایا گیا ہے اور خطابت و ذہانت کی پوری صلاحیتیں صرف کر کے اس کا حل یوں پیش کیا گیا ہے کہ:۔

> "حسین کے لیے نسبتاً یہ بہت آسان ہوتا کہ سب سے پہلے آپ اپنی جان کا عطیہ راہِ حق میں پیش کر دیتے۔ اس صورت میں آپ کی قربانی اپنی جان کی قربانی ہوتی اور اس کو کسی ایسے شہید کی قربانی سے برابر درجہ دیا جا سکتا جس نے کبھی بھی حمایتِ حق میں اپنی قربانی پیش کی ہو۔
>
> اس صورت میں آپ کی قربانی اس سے زیادہ وسیع نہیں سمجھی جا سکتی تھی جتنی کہ بقول نصاریٰ حضرت عیسیٰ کی قربانی کہ آپ دینِ حق کی تبلیغ کی وجہ سے سولی پر چڑھا دیئے گئے۔ یا سقراط کی قربانی کہ ان کو اصول کی حمایت میں زہر کا جام پینا پڑا۔ اور حسین کے لیے اس منزل سے گزر جانا مشکل ہی کیا ہوتا جب کہ آپ اسی باپ کے بیٹے تھے جن کا قول یہ تھا کہ مجھے اس کی پرواہ نہیں کہ موت مجھ پر آ پڑتی ہے یا موت پر میں جا پڑتا ہوں اور نیز یہ کہ موت سے اس سے زیادہ مانوس ہوں جتنا کہ بچہ پستانِ مادر سے مانوس ہوتا ہے...... مگر حسین کی شہادت کو جو خاص امتیاز حاصل ہے وہ اسی لیے کہ آپ نے ایسے ہر ہر فرد کو جو آپ کی ذات سے دور یا قریب کا تعلق رکھتے تھے اپنی موجودگی میں راہِ حق میں نثار کر دیا...... حسین کا کمالِ عمل محض یہی نہیں تھا کہ وقت اور موقع آنے پر آپ نے اپنی جان راہِ خدا میں پیش کر دی بلکہ آپ کے نفس کا کمال یہ تھا کہ آپ نے جان سے عزیز ہستیاں رضائے حق کے راستے میں یکے بعد دیگرے قربان کر دیں[1] اور جب تک صبر و تحمل کے ساتھ ان تمام

---

[1] اگرچہ ان میں ایسے کم عمر بھی تھے جیسے کم عمروں کو حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے جہاد میں شریک ہو کر راہِ خدا میں بھی اپنی جان قربان کرنے کی اجازت نہیں دی ؟

دشوار گزار مراحل کو طے نہ کر لیا اس وقت تک خود اپنی جان کا ہدیہ پیش نہیں کیا۔[1]

ایک بے معنی اور ناقابلِ فہم بات کو "خطیبانہ فلسفہ" بنانے کی یہ کوشش ایک بڑے فاضل اور نامی گرامی شیعہ عالم کی ذہانت و ریاست کا ثبوت ہے جس میں کسی سنجیدہ سوال کا جواب نہیں ملتا۔ البتہ ایک سوال اور پیدا ہو جاتا ہے کہ کیا امام کی شان حضرت عیسیٰ سے بھی بالاتر تھی! بس اسی سے سمجھا جا سکتا ہے کہ معاملہ کس قدر ناقابلِ توجیہ اور ناقابلِ حل ہے۔ حل واقعہ میں صرف ایک ہی ہے کہ ان روایتوں کو جن کی سندیں کوئی وزن نہیں رکھتیں اور جن میں کئی علامتیں موضوع ہونے کی پائی جاتی ہیں انہیں موضوع قرار دے کر رد کیا جائے۔ لیکن یہ فیصلہ ظاہر ہے کہ صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھوں نے اپنا دین و ایمان مظلومیت حسینؓ کے ماتم کو نہیں قرار دے رکھا ہے ورنہ تو ان روایتوں کی حفاظت لازم ہو جاتی۔ اس لیے کہ ان کے بغیر وہ فضا ہی نہیں بن سکتی جس میں ماتم ہی اول اور ماتم ہی آخر ہو جائے۔ مثلاً حضرت محمد الباقر والی روایت لے لیجیے جس المیۂ کربلا کو بغیر نمک مرچ لگائے اور بغیر ایک رزمیہ داستان بنائے سیدھے سادے لفظوں میں یوں پیش کر دیا گیا ہے کہ:

> بس جب آپ نے ابن زیاد کے ہاتھ پر بیعت کی شرط پوری کرنے سے انکار کیا تو عمر بن سعد نے آپ سے قتال کیا۔ اس میں آپ کے تمام اصحاب شہید ہو گئے جن میں آپ کے اپنے گھر کے تقریباً ۱۵-۲۰ جوان بھی تھے۔[2] بعد ازاں آپ نے خود قتال کیا اور آپ بھی شہید ہوئے۔

اس روایت سے ظاہر ہے کہ ماتم کے کاروبار کو رونق نہیں مل سکتی۔ اس میں ایک کے بعد ایک لاشہ گرنے کا منظر نہیں آتا۔ اس لاشے پر حضرت حسینؓ کا دوڑ کے جانا اور حزن و

---

[1] "شہید انسانیت" ص۱۱۳-۱۱۵ [2] البدایہ والنہایہ میں ان حضرات کی بابت کئی اقوال نقل کیے گئے ہیں ایک قول ۱۶ کا ہے جو حسن بصریؒ کی طرف منسوب ہے۔ ایک ۱۷ کا جو محمد بن حنفیہ کی طرف منسوب ہے اور ایک ۲۳ کا قول ہے۔ (ج ۸ ص۱۸۹)

الم کے کلمات ادا فرمانا نہیں آتا۔ حضرت زینب سر کھولے سینہ پیٹتی اور پچھاڑیں کھاتی ہوئی نہیں آتیں، لاش سے لپٹ کے بین کرتی نہیں پائی جاتیں۔ حضرت حسین پیاس کی شدت سے فرات کی طرف گھوڑا دوڑاتے ہوئے اور عین اس حالت میں کہ پانی حلق سے اتارنے جارہے ہیں گلے میں دشمن کا تیر کھاتے ہوئے اور پھر ان کے لیے یوں بددعا کرتے نہیں دکھائی دیتے کہ :-

"اے اللہ ان کو گن لے اور پھر انھیں چن چن کے مار اور ایک کو بھی باقی نہ رکھ۔"[1]

اور پھر بعد میں زخموں سے چور دشمن کے نرغے میں گھرے ہوئے اُن سے یوں مخاطب ہوتے ہوئے بھی نہیں ملتے جس سے ایک عاجزی اور بیچارگی کی تصویر بنتی ہے کہ :-

"کیا تم میرے قتل پر ایک دوسرے کو اکساتے ہو؟ یاد رکھو کہ میرے بعد کوئی ایسا بندہ نہیں ہے جس کے قتل سے اللہ اتنا ناراض ہو جتنا میرے قتل سے ہوگا ...... اور اگر تم نے مجھے قتل کر ہی دیا (اور نہ مانے) تو اللہ تم پر آپس کی لڑائی اور خونریزی کا عذاب مسلط فرمائے گا اور پھر اس عذاب دنیا پر بس نہ کرتے ہوئے (آخرت کے) عذاب الیم کا اس پر اضافہ فرمائے گا۔"[2]

اور پھر حضرت زینب یہ کہتی ہوئی نہیں نکل آتیں کہ :-

یا عمر بن سعد ایقتل ابو   اے عمر بن سعد کیا ابو عبداللہ (حسینؓ)

---

[1] طبری ج ۲ ص ۲۵۸ [2] طبری ج ۲ ص ۲۶۰ اس عبارت میں علاوہ خاص بات کے کہ اور سب کو چھوڑ کر حضرت حسین اپنی جان بچانے کی کوشش کر رہے ہیں، عبارت کے زیر خط الفاظ بھی توجہ طلب ہیں۔ قرآن کے اسلام میں ایک نبی اور رسول کے علاوہ کوئی شخص مجاز نہیں کہ ایسا کلام اپنے بارے میں کہے۔ فَلَا تُزَكُّوْا اَنْفُسَكُمْ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰی، اپنی پاکیزگی (و بزرگی) کے دعوے نہ کرو اللہ بہتر جانتا ہے کون متقی ہے (النجم آیت ۳۲) کیسے مانا جا سکتا ہے کہ حضرت حسین قرآن پاک کی اس تعلیم سے نا آشنا تھے اور معاذ اللہ وہ ایسی زبان پر لا رہے تھے جو اہل تقویٰ کی شان نہیں۔

عبد اللہ وانت تنظر الیہ[1]   قتل ہوں گے اور تم دیکھتے رہو گے؟

چنانچہ اس سادہ روایت کا ذکر، باوجود حضرت محمد الباقر کی روایت ہونے کے مشکل ہی سے کہیں ملیگا۔

قصہ مختصر

اختصار کی کوشش کے باوجود قصہ طویل ہو گیا۔ مختصر یہ ہے کہ معرکۂ کربلا کی لمبی چوڑی کہانیاں، علاوہ اس کے کہ موقع و محل کے حالات ان کے وقوع کے لیے گنجائش نہیں دکھاتے اور علاوہ اس کے کہ ان قصوں کی سندیں نہایت بے وقعت ہیں، یہ قصے متعدد پہلوؤں سے خانوادۂ نبوت پر داغ بنتے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی مثال کے ذکر سے ہم نے اوپر بات شروع کی تھی، اور اس کے ضمن میں باقی وہ تمام باتیں بھی آگئی تھیں جن کو الگ الگ ذکر کرنے کا ارادہ تھا۔ یعنی حضرت حسین کا اپنے آپ کو اپنی زبان سے مقدس اور مقبول بارگاہِ حق بتانا۔ جس کی کوئی گنجائش رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں نہیں ہے۔ اپنے دشمنوں کو بددعائیں دینا، جو اُن کے نانا کی سنت نہیں اور مردوں کا میدانِ جنگ میں شیوہ نہیں۔ سیدہ زینبؓ بنت خاتونِ جنت کا بین و بکا کرتے ہوئے بار بار میدانِ جنگ میں آنا اور لاشوں سے لپٹ کے رونا چلانا۔ پھر حسینؓ کے لیے عمر بن سعد سے رحم کی اپیل کرنا۔ بھلا یہ باتیں کہیں خانوادۂ نبوت کی خواتین کو زیب دیتی ہیں اور خاتون بھی علی مرتضیٰ جیسے شیر مرد کی بیٹی۔ یہ روایتیں اگر قابلِ اعتبار ہو سکتی ہیں تو صرف ان لوگوں کے لیے جنھیں خانوادۂ نبوت کی محبت کے نام پر ان کی مظلومیت کے ماتم کی دوکان کھولنی ہے خواہ مظلومیت کی اس داستان کو رنگین کرنے کے لیے ان تمام عزیزوں کا اپنے ہی ہاتھوں سے خون کرنا پڑے جو اس خانوادے کا اور کسی بھی خانوادے کا شرف اور اس کی عزت ہوں۔

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۶۰

۴۔ بندشِ آب

داستانِ کربلا کا ایک اور اہم جزو ابنِ زیاد کی طرف سے قافلۂ حسینی پر پانی کی بندش ہے۔ دوسرے اجزا پر گفتگو نے اتنا وقت لے لیا کہ اب جی چاہتا ہے یہ گفتگو ختم ہو مگر اس بندشِ آب والے جزو کی اہمیت اجازت نہیں دیتی کہ اس سے اغماض کر لیا جائے۔ یہ بندش ۷ محرم سے بتائی گئی ہے اور اہلِ قافلہ کا پیاس سے خاص کر خود حضرت حسینؑ کا وہ برا حال سنایا جاتا ہے کہ سخت حالتِ جنگ میں بھی دشمن کو نقصان پہنچانے یا اس سے اپنا دفاع کرنے سے بھی بڑھ کر پانی کا حصول ایک مسئلہ بن گیا تھا۔ حالانکہ اسی یومِ عاشورہ کی روایتوں میں ایک روایت یہ بھی موجود ہے کہ جنگ شروع ہونے سے پہلے حضرت حسینؑ اور اُن کے ساتھیوں نے یکے بعد دیگرے غسل کیا اور ایک بڑے برتن میں مشک گھول کر تیار کیا گیا تھا جو ان حضرات نے جسم پر لگایا۔ اس کے علاوہ کربلا کا میدان جس کے بارے میں روایتوں نے یہ تاثر دیا ہے کہ وہ ایک بے آب و گیاہ ریگستان تھا اس کی تردید کے لیے حضرت محمد الباقرؒ والی وہ روایت کافی ہے جس کا کچھ حصہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ جس کے مطابق کربلا ایک ایسی زمین تھی جس میں نرکل اور بانس کا جنگل یا جھاڑیاں موجود تھیں اور خشک ریگستان میں نہیں ہوا کرتیں۔ یہ مسلّم ہے کہ یہ دریائے فرات یا اس سے نکلنے والی کسی نہر کا کنارہ تھا۔ یہاں پانی زمین کی سطح سے اتنا قریب تھا کہ تھوڑی سی زمین کھودو اور پانی لے لو۔ معجم البلدان میں کربلا کے ذیل میں صراحت ہے کہ یہاں کی زمین میں نرمی (رَخاوَة) ہے۔ اور یاد آتا ہے کہ طبری ہی میں یہ روایت موجود ہے کہ اصحابِ حسینؑ کو بھی زیرِ زمین کا یہ تجربہ ہوا تھا کہ ذرا سا کھودنے پر پانی نکل آیا۔[1] بہرحال تاریخی حقیقت" کے نام پر خاص ایک پروپیگنڈہ ہے کہ کربلا میں پانی نایاب یا کمیاب تھا اور اس سے ۷ محرم سے بندشِ آب

---

[1] دمِ تحریر صفحہ کا حوالہ مجھے دستیاب نہیں ہے لیکن میرا خیال ہے کہ میری یادداشت صحیح ہے تلاش سے طبری میں (یا ابنِ اثیر میں) وہ موقع نکل آئے گا۔

والے افسانے کی حقیقت بھی ظاہر ہو جاتی ہے۔

معاملے کے کچھ اور پہلو!

کربلا جیسی لبِ دریا سرزمین پر اس بات کو ممکن سمجھ لینا کہ وہاں ڈیڑھ دو سو ایسے مسلح انسانوں پر جن میں بتیس چھتیس سوار بھی تھے، مسلسل تین دن تک پانی کی مکمل بندش کی جا سکتی تھی، یہ بات عقل و خرد سے مکمل رخصت لیے بغیر ممکن نہیں۔ ہاں اگر یہ بات کہی جائے کہ پانی کا گھاٹ ـــ یعنی اس جگہ کا جو قریبی گھاٹ تھا وہ ـــ روکا گیا تھا۔ تاکہ حسینی قافلہ بسہولت پانی نہ لے سکے تو یہ سمجھ میں آنے والی بات ہے۔ پانی کے گھاٹ سے ہٹ کر پورے دریا پر ناکہ بندی ممکن نہیں ہو سکتی اور واقعہ یہ ہے کہ روایت میں گھاٹ روکنے ہی کا ذکر ہے جس کے الفاظ آگے آ رہے ہیں۔

لیکن اس میں بھی ۷ر تاریخ سے شروعات کی جو بات کہی جاتی ہے اور وہ بندشِ آب والی روایت میں آئی ہے، وہ بھی ایسی ہی ناقابلِ فہم ہے جیسی مکمل بندش والی بات۔ اسکے برخلاف جو بات واقعاتی لحاظ سے قابلِ فہم ہے وہ یہ ہے کہ ۱۰ر تاریخ کو جب دشمن نے منظم اقدام کا فیصلہ کر لیا تو اپنی جلد از جلد کامیابی کے لیے جہاں دوسرے ذرائع اور ہتھیار استعمال کیے وہاں ایک تدبیر یہ بھی اختیار کی جو جنگ میں عام طور پر کی جاتی ہے کہ فریقِ مخالف کے لیے پانی کا حصول مشکل بنا دیا جائے۔ اس سے قدرتی طور پر مخالف فریق کی قوتِ مدافعت گھٹتی ہے۔ پس اگر یہ دعویٰ کیا جائے یا یوں کہیے کہ روایت میں اس طرح کی بات کہی گئی ہو تو یہ ایک قابلِ فہم بات ہے اور اس پر کسی کو کلام کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوگی۔ نیز واقعے کے تمام پہلوؤں کی روایات کے جوڑ کھانے میں اس کا فٹ ہونا بھی دقت طلب نہ ہوگا جبکہ اس کے برعکس ۷ر تاریخ والی روایت بعض دوسری روایتوں کے ساتھ جوڑ نہیں کھا سکتی بلکہ ایک تضاد کا درجہ لیے ہوئے نظر آئیگی۔ آئیے اس پہلو سے روایت کا جائزہ لیجیے۔

ہم نے اگرچہ تفصیل اور ترتیب کے ساتھ وہ روایات اس کتاب میں جمع نہیں کی ہیں جن میں ابن سعد اور حضرت حسین کے درمیان نامہ و پیام اور ملاقاتوں کا بیان ہے۔ اور پھر اس کے نتیجے میں ابن سعد اور ابن زیاد کے درمیان ہونے والی خط و کتابت کا بیان آتا ہے تاہم کچھ نہ کچھ ذکر ان سب چیزوں کا اسی باب کے اوپر کے صفحات میں آچکا ہے؛ اور یوں بھی یہ باتیں واقعہ کربلا کے سلسلے میں بہت مشہور و معروف ہیں۔ اس لیے قارئین اس بات سے بے خبر نہیں ہو سکتے کہ جس وقت سے ابن سعد نے کربلا میں قدم رکھا اسی وقت سے اُس کے اور حضرت حسین کے درمیان نامہ و پیام اور پھر ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور پھر اس کا نتیجہ ابن سعد اور ابن زیاد کے درمیان خط و کتابت کی شکل میں ظاہر ہوا۔ جس کا حاصل یہ تھا کہ ابن سعد حضرت حسین کے ساتھ کیا رویہ اختیار کرے؟ اس سلسلہ میں کئی ایک روایات ہیں جن کا مجموعی تاثر یہ بنتا ہے کہ فریقین کی یہ سلسلہ جنبانی بالکل آخر وقت تک قائم رہی۔ اور دو روایتیں تو صراحت کے ساتھ بتاتی ہیں کہ ۹ر تاریخ کی شام کو یہ سلسلہ بند ہوا۔ ان دونوں روایتوں کا ذکر اوپر اسی باب میں آچکا ہے۔ طبری جزو ۶ میں ان میں سے ایک روایت ص۲۳۵ پر سعد بن عُبیدہ کے حوالے سے ہے۔ دوسری ص۲۳۵-۲۳۶ پر عبداللہ بن شریک عامری کے حوالے سے۔

معاملات کے اس پس منظر میں ذرا غور کر کے دیکھنا چاہیے کہ ۷ر تاریخ سے بندش آب کا نہ صرف حکم بلکہ اس کا نفاذ بھی بتانے والی روایت کو ماننے کی گنجائش کہاں سے نکل سکتی ہے؟ اور وہ بات الگ رہی جو اس گفتگو کے شروع میں عرض کی گئی ہے کہ قتل و قتال کی حالت میں تو جو ۷ر تاریخ کو ہوا، بندش آب کی کارروائی کچھ با مقصد اور با معنی ہو سکتی تھی۔ بغیر قتل و قتال کی حالت کے یہ ایک فضول سی محض بدنامی مول لینے والی بات تھی۔ مزید برآں کیا یہ ممکن ہے کہ ۷ر تاریخ سے ایسا ہوا ہو اور ۷ر تاریخ سے پہلے کہیں کسی طرح بھی اس کی شکایت کی کوئی روایت نہ پائی جائے؟ تمام شکایتی بیانات ۷ر تاریخ ہی کے ذیل میں

آتے ہیں۔ اس سے پہلے کا کوئی بیان نہیں ملتا حالانکہ دونوں فریقوں میں برابر رابطہ چل رہا تھا!

روایت کی اندرونی شہادت

روایت میں اس بات کی صراحت تو ہے ہی جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا، کہ بندش آب کی صورت صرف یہ تھی کہ گھاٹ روکا گیا تھا۔

> "....پس عمر بن سعد نے عمرو بن الحجاج کو پانچسو سواروں کا دستہ دے کر بھیجا اور وہ گھاٹ پر جا اترے[1] اور حسین اور ان کے ساتھیوں اور پانی کے بیچ میں حائل ہو گئے......"

اس کے علاوہ اس بات کی بھی علامت روایت کے اندر پائی جاتی ہے کہ یہ کاروائی ۱۰ تاریخ ہی کو عمل میں آئی جو جنگ کا دن تھا، کیونکہ روایت میں اگرچہ مذکورہ بالا الفاظ کے بعد "وذالک قبل قتل الحسین بثلاث" (اور یہ شہادت حسین سے تین دن پہلے کی بات ہے) کے الفاظ آتے ہیں مگر پھر فوراً ۱۰ تاریخ ہی کا قصہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس سے پہلے کی کوئی بات نہیں۔

قال و نازلہ عبد اللہ بن	حمید کہتا ہے کہ عبداللہ بن ابی الحصین
ابی الحصین الازدی و عدادہ	ازدی جس کا شمار بجیلہ میں ہوتا تھا[2]
فی بجیلة فقال یا حسین الا	حضرت حسین کے مقابلہ پر آیا اور کہا کہ
تنظر الی الماء کانہ کبد السماء	حسین تم پانی کو دیکھ رہے ہو کیسا آسمان
واللہ لا تذوق منہ قطرة	کی طرح شفاف ہے تم خدا کی قسم اس
حتی تموت عطشا۔[3]	سے ایک قطرہ بھی نہ چکھ سکو گے حتی کہ

---

[1] روایت کے اصل الفاظ ہیں "فنزلوا علی الشریعة" (طبری ج ۶ صفحہ ۲۳۴) "شریعة" کے معنی گھاٹ یا گھاٹ کا راستہ

[2] یعنی سرکاری رجسٹر میں اس کا نام قبیلہ بجیلہ کے تحت درج تھا۔ [3] حوالہ سابق۔

پیاس سے (معاذ اللہ) دم نکل جائے۔

سچ بات یہ ہے کہ بالکل سمجھ میں نہیں آتا کہ کیوں یہ بے تکے طور پر "شہادت سے تین دن پہلے" کے الفاظ روایت میں درج کیے گئے ہیں۔ حضرت حسینؓ سے کسی کا مقابلہ ۱۰ر تاریخ سے پہلے کہیں مروی نہیں اور پانی کی کوئی شکایت بھی ۱۰ر تاریخ سے پہلے کہیں بیان نہیں کی گئی۔

اور خود راوی کے اوصاف !

اس روایت پر غور و فکر کے سلسلے میں اس کے راوی حُمید بن مسلم کے کردار پر بھی نظر ضروری ہے۔ واقعۂ کربلا کے سلسلہ میں اس کی روایات بے شمار ہیں جن میں اس بات کے نہایت واضح قرائن ہیں کہ اس کی روایتیں ہی جعلی اور افسانہ ساز نہیں بلکہ یہ خود بھی شاید ایک جعلی شخصیت ہے۔ ورنہ ایک نہایت موقع پرست اور کوفیوں کے امتیازی (TYPICAL) اوصاف کا مجسمہ ہے۔ ویسے تو یہ اپنے آپ کو ابن سعد کی فوج میں شامل بتاتا ہے۔ اور جب تک واقعۂ شہادت ہو نہیں جاتا یہ اپنا کوئی ذرا سا بھی ہمدردانہ کردار اہل بیت کے ساتھ نہیں دکھاتا مگر جیسے ہی یہ واقعہ ہو لیتا ہے نہ صرف اس سے بڑھ کر اہل بیت کا کوئی ہمدرد کربلا کے میدان میں نظر نہیں آتا بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ صفِ اعداء کا نہیں صفِ حسینی کا آدمی تھا۔ جنگ کے وقت میں حضرت حسین نے دشمنوں کی جارحیت اور سفاکی پر جو ردِ عمل اللہ سے دعا یا بددعا کی صورت میں یا اظہار رنج و الم کی صورت میں ظاہر فرمایا اس کا ایک ایک لفظ آپ اس شخص کی زبان سے سن لیجئے جیسے کوئی ہمزاد ہو۔

ایسا لگتا ہے کہ واقعۂ کربلا کے تین چار سال بعد یزید کی موت کے ساتھ ہی جب وقت بدلا اور ایک طرف حضرت عبداللہ بن زبیر اور دوسری طرف مختار ثقفی نے ہمدردانِ بنی اُمیّہ اور قاتلانِ حسین کے لیے زمین تنگ کر دی تو بہت سے لوگوں نے عافیت طلبی کے لیے

چولا بدلا، حمید بن مسلم واقعی اگر اُس زمانے کا کوئی شخص تھا تو یقیناً ایسی چولا بدلنے والوں میں سے ایک تھا۔ اہلِ بیت کی ہمدردی میں طرح طرح کے غم انگیز افسانے تراشتا ہے۔ یہاں تک کہ اس معاملہ میں اپنے آپ کو شمر جیسے سخت آدمی سے بھی لڑتا جھگڑتا اور اُسے مغلوب کر لیتا ہوا دکھاتا ہے۔ جو کہ روایات کی روشنی میں حادثۂ کربلا کا سب سے بڑا ذمہ دار ہے۔ اور جس کی آمد کے بعد ابن سعد کو بھی اس قتل و قتال پر مجبور ہونا پڑا تھا جس کو وہ برابر ٹالنے کی کوشش میں لگا تھا۔[1] ان افسانوں سے جن میں سے ایک یہ بندشِ آب والا افسانہ بھی ہے، وہ ایک طرف اپنے آپ کو محبانِ اہلِ بیت میں شمار کرا رہا تھا، دوسری طرف نظر آتا ہے کہ وہ اس موقع سے ذاتی اور خاندانی رنجشیں یا رقابتیں بھی چکا رہا تھا۔ ورنہ جب یہ خود یزیدی لشکر میں تھا تو اس کے لیے کوئی جواز نہ تھا کہ مظالم کی روایتوں میں افراد کو بھی نامزد کرتا جیسا کہ اوپر کے اقتباس میں عبداللہ بن ابی الحصین کا نام اس نے دیا ہے۔ اس کی روایتوں میں یہی تنہا ایک نامزد رپورٹ نہیں ہے۔ بار بار وہ یہی کام کرتا نظر آتا ہے۔ حضرت حسینؓ کے جسدِ مبارک کو گھوڑوں کی سُم سے روندے جانے والی روایت میں جس پر آگے کلام آئے گا، یہ دس آدمی اس ناپاک کام میں شریک بتاتا ہے مگر صرف دو کا ذکر نام کے ساتھ کرتا ہے۔ اس طرح کا معاملہ اس کی اور روایتوں میں بھی ہے۔ بلکہ اس شخص کے اسی کردار کی بنا پر یہ بھی خیال ہونے لگتا ہے کہ کہیں شمر کی بدنامی میں بھی اُس کی اپنی واقعی بداعمالیوں کے ساتھ حمید بن مسلم کی "مہربانیوں" کا بھی تو کافی دخل نہیں ہے؟ اس لیے کہ اس کی روایتوں میں شمر کا ذکر بار بار آجاتا ہے اور اس ذکر میں اس کی بُرائیاں الم نشرح کرنے سے حمید کی بہت ہی خصوصی دلچسپی کا اظہار ہوتا ہے۔ اگلے باب میں حمید پر اس کی کچھ اور روایتوں کے ماتحت بھی گفتگو آئے گی۔

---

[1] طبری ج ۶ صفحہ [illegible] پر اس کی روایت میں دکھایا گیا ہے کہ حضرت علی زین العابدینؒ جو قتل و قتال کی زد سے بچ رہے تھے انھیں بعد میں شمر کی زد سے بچانے کا کارنامہ اسی حمید ہی کا ہے۔

خلاصۂ کلام

یوم عاشورہ کے واقعات کی روایتوں کے سلسلے میں جن مختلف پہلوؤں کو اوپر کے صفحات میں اُجاگر کیا گیا اُن کے پیشِ نظر اس بات میں کسی شبہ کی گنجائش نظر نہیں آتی کہ یہ روایتیں بالعموم ناقابلِ اعتبار بلکہ بیشتر بالبداہت (EVIDENTLY) قابلِ رد ہیں اس لیے عقل اور نقل، قانونِ شریعت اور تقاضائے دیانت ہر ایک کے ماتحت ان روایتوں کی فراہم کی ہوئی تفصیلات کو کم از کم ناقابلِ اعتبار ضرور قرار دیا جانا چاہیے اور اس سے زیادہ کچھ کہنے کی گنجائش نہیں سمجھی جانی چاہیے جو صحیح روایتوں میں آتا ہے جیسی روایت حضرت محمد الباقر کے حوالے سے اوپر نقل کی گئی ہے[1]۔

> "جب حضرت کربلا میں ٹھہرنے پر مجبور ہو گئے (اور کوفیوں کی غداری لشکرِ عمر بن سعد کی شکل میں عملاً سامنے آ گئی) تو آپ نے (اس نئی صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے کے لیے) تین شکلیں ابن سعد کے سامنے رکھیں۔ میں حجاز واپس چلا جاؤں۔ یزید کے پاس چلا جاؤں۔ یا کسی سرحد پر نکل جاؤں (یعنی ملک چھوڑ دوں) ابن سعد نے تجویز پسند کی اور ابن زیاد کے پاس بھیج دی۔ وہاں سے نامنظور ہوئی اور اس کی جگہ یہ حکم آیا کہ وہ (کسی اور بات سے پہلے) ابن زیاد کے ہاتھ پر بیعت کریں۔ (پھر ان کی کسی بات پر غور کیا جائے گا) اس شرط کو حضرت حسینؓ نے قطعی طور سے رد کر دیا۔ نتیجہ میں ابن سعد نے (جیسا کہ اس کو حکم تھا) طاقت استعمال کی اور اس میں حضرت حسینؓ کے تمام ساتھی شہید ہوئے۔ ان میں آپکے گھرانے کے بھی تقریباً ۱۵۔ ۲۰ جوان تھے۔ آپ کا ایک چھوٹا بچہ بھی ایک

---

[1] یہ احتیاط علمی ذمہ داری ہی کی بنا پر لازم نہیں ہے بلکہ شرعی اور اخلاقی ذمہ داری بھی یہی چاہتی ہے اس لیے کہ یہ ایک ایسا معاملہ ہے جس کا تعلق دو فریقوں سے ہے اور شرعاً و اخلاقاً کسی فریق کی حمایت یا مخالفت میں کوئی بات مضبوط شہادت کے بغیر جائز نہیں۔

تیر کے لگنے سے شہید ہوا۔ اس کے بعد آپ نے بھی تلوار اٹھائی اور قتال کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔[1]

روایتِ حضرت باقر کی خطا؟

واقعۂ کربلا کے بیان میں شیعہ نقطۂ نظر کو براہ راست جاننے کی غرض سے جو چند کتابیں مجھے دیکھنے کا موقع ملا اس سے ظاہر ہوا کہ حضرت محمد الباقر کی یہ روایت ان حضرات کے یہاں ذکر میں نہیں لائی جاتی۔ حالانکہ سند کے اعتبار سے ان حضرات کے یہاں اُس کی بے حد وقعت ہونی چاہیے تھی۔[2] ہاں اس کا آخری حصہ جو دربار یزید میں حضرت حسینؓ کا سر لیجائے جانے سے متعلق ہے جس کا ذکر ہم آگے کریں گے اس کا تذکرہ یہ حضرات کر دیتے ہیں۔ وجہ صرف یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس روایت میں یزید کے پاس جانے کی پیش کش بھی پائی جاتی ہے۔ اور یہ پیش کش باوجود "حسین کی پیش کش" ہونے کے ایسی ناخوشگوار تسلیم کر دی گئی ہے کہ یوم عاشورہ کی جن روایتوں کا بڑے ذوق و شوق سے بیان کیا جاتا ہے ان میں بھی جہاں کہیں اس پیش کش کی بات صراحتہً یا اشارۃً آ گئی ہے وہاں یا تو روایت کا بیان اسی جگہ ختم کر دیا گیا ہے، یا یہ جزو حذف ہے۔ کئی ایک مثالوں میں سے بس ایک مثال حضرت حسین کے رفیق زُہیر بن قَین کی اُس تقریر کی لے لیجئے جو اسی باب میں اوپر گزر چکی ہے۔ اس میں یہ الفاظ بھی آتے ہیں کہ:۔

> "اے اللہ کے بندو! فاطمہ رضوان اللہ علیہا کی اولاد بہ نسبت ابن سمیہ (ابن زیاد) کے تمہاری محبت اور نصرت کی زیادہ مستحق ہے۔ لیکن اگر تم ان کی مدد نہیں بھی کرتے تو ان کے قتل کے درپے ہونے سے تو باز آؤ اور اس آدمی

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۶۰ [2] اور جیسا کہ باب ۲ میں گذر چکا ہے محققین اہل سنت کے یہاں تو قصے کی تمام روایتوں میں دو ہی روایتیں سند کے اعتبار سے قوی ہیں اور ان میں سے ایک یہی حضرت محمد الباقر کی روایت ہے۔

(حضرت حسینؓ) کے اور اس کے چچا زاد یزید بن معاویہ کے درمیان سے ہٹ
جاؤ۔ میری جان کی قسم یزید کو تم سے راضی کرنے کیلئے اس بات کی ضرورت
نہیں ہے کہ تم حسینؓ کو قتل کر دو[1]"

لیکن "شہید انسانیت" کے مصنف اس تقریر کو اس پیشکش سے پہلے والے جملے پر ہی ختم کر گئے ہیں[2]۔ یہ بعد کے جملے بھی اُن کے قارئین تک پہنچ جاتے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت حسینؓ یزید کے پاس جانا چاہتے تھے[3] اس کو انھوں نے پسند نہیں فرمایا۔

اور شیعہ حضرات کو کیا کہیں، خود اہل سنت حضرت حسینؓ سے متعلق شیعی تصورات سے اس درجہ متاثر ہوئے ہیں کہ ان کے یہاں بھی واقعے کے اس جزو کو جو قطعی طور پر ثابت ہے، "تاریکی ہی میں رکھنا عام طور پر پسند کیا گیا۔ سنہ ۲۳ء م سنہ ۵۲ کا "واقعہ کربلا" نامی راقم کا مضمون جس پر "نظر ثانی" اس کتاب کی شکل اختیار کر گئی جو آپ پڑھ رہے ہیں، اس مضمون میں راقم نے اس حقیقت سے بے خبری کے عالم میں کہ حضرت حسینؓ نے جو رہی پیش کش کربلا میں کی تھی جس کا ایک جزو یزید کے پاس جانا اور اکثر روایتوں کے مطابق بیعت کے لیے جانا تھا[4]، اس کا یہ جزو مکمل تاریکی میں ہے، اس جزو کو بھی روشنی دکھانے

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۲۴ [2] ملاحظہ ہو صفحات ۲۸۰ [3] حُر بن یزید تمیمی کی تقریر اور اس سے متعلق قصے میں بھی بار بار حضرت حسینؓ کے پیش کردہ شرائط کے الفاظ بار بار ہیں۔ وہ روایت جس میں شمر ابن زیاد کو یہ شرائط قبول کرنے سے روکتا ہے اس کا تقریباً ہر مصنف کے یہاں تذکرہ ہوتا ہے اسی روایت میں دیگر شرائط پوری تفصیل سے موجود ہیں مگر ان کی طرف سے تجاہل برتا جاتا ہے۔ آخری بات یہ ہے کہ اس مسئلہ پر اختلافی بیانات اور راویوں کی روایتیں طبری نے صفحہ ۲۲۹ پر درج کر دی ہیں ان کا یکجائی مطالعہ بھی صاف طور سے اسی نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ بیان شرائط والی روایتیں ہی مضبوط ہیں اور خود طبری نے گویا یہی تاثر دیا ہے۔

[4] ان روایتوں کے الفاظ ہیں حتیٰ اضع یدی فی یدہٖ جس کا لفظی ترجمہ ہے "تاکہ میں اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیدوں" کوئی اس عبارت کا ترجمہ "بیعت" سے نہ بھی کرنا چاہے تو "سپردگی" سے تو بہر حال کرنا ہی ہوگا اور پھر فرق کیا رہا؟ "دیتے سر داد و نہ داد دست در دست یزید" والے مشہور مصرعے کے مطابق تو ان الفاظ کا مطلب بیعت ہی ہوگا۔

کی غلطی کر دی اور بس یہ "غلطی" قیامت خیز ہو گئی۔ بہت بہت پڑھے لکھے سنی حضرات جن میں میرے بعض بڑے محترم اور مشفق بھی شامل تھے، ان کے لیے حضرت حسینؓ کی طرف اس بات کی نسبت ناقابلِ برداشت ہوئی اور معاملہ اس وقت ٹھنڈا ہوا جب الفرقان کی اگلی اشاعت میں تاریخ طبری اور ابن کثیر وغیرہ کے پانچ چھ حوالوں سے اصل عربی عبارتوں میں یہ پیش کش نقل کر دی گئی اور لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ اس پیش کش کی بات کوئی افتراء اور بہتان یا کسی کمزور ذریعے (SOURCE) کی بات نہیں تھی۔

ناقابلِ انکار حقیقت

بہر حال یہ بات پوری صراحت اور وضاحت کے ساتھ سامنے آ جانی چاہیے کہ حضرت حسینؓ نے کربلا میں یہ دیکھ کر کہ حالات کا رخ اس خیال اور گمان کے بالکل برعکس ہے جس گمان اور اطمینان کے ساتھ کوفے کی طرف سفر شروع کیا گیا تھا، ابن زیاد کے نائب عمر بن سعد کو وہ پیش کش کی جو حضرت محمد الباقر کی روایت میں بیان ہوئی ہے۔ اور جس کی تائید واقعۂ کربلا سے متعلق چند در چند روایات میں صراحۃً یا اشارۃً پائی جاتی ہے۔ یہ حضرت حسینؓ کے ورودِ کربلا کے ساتھ جڑی ہوئی ایسی حقیقت ہے کہ جب تک آپ کے ورودِ کربلا اور عمر بن سعد کے وہاں آنے سے انکار نہ کر دیا جائے اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا ہے۔ جسٹس امیر علی جیسے شیعہ مصنفین جن کے یہاں شیعیت تو قدرتی طور سے پائی جاتی ہے۔ مگر علمی خیانت کے بظاہر قائل نہیں ہیں، انھوں نے بھی واقعۂ کربلا کے سلسلے میں نہ صرف اس سہ گانہ پیش کش کی بات پوری صراحت سے درج کی ہے بلکہ ایک روایت (صرف ایک روایت) جو اس کی تردید میں پائی جاتی ہے اس کو رد بھی کر دیا ہے۔ اپنی مشہور کتاب "اسپرٹ آف اسلام" (SPIRIT OF ISLAM)

میں واقعہ کربلا کے ذکر میں حضرت حسین کی سہ گانہ پیش کش بیان کر کے موصوف نے اس پر حاشیہ دیا ہے جو کتاب کے اردو ترجمے میں بایں الفاظ درج ہوا ہے:-

> "صاحب روضۃ الصفا یہ شرائط بیان کرنے کے بعد لکھتا ہے کہ خدام حسین میں سے ایک شخص نے جو مقتل کربلا سے اتفاقاً بچ نکلا، اس دعوے کو غلط بتایا کہ امام حسین نے اموی سردار کے سامنے کسی قسم کی شرائط صلح پیش کیں، ممکن ہے[1] کہ اس خادم نے یہ انکار یہ ظاہر کرنے کی خاطر کیا ہو کہ امام حسین نے صلح کی تجویز کر کے اپنے آپ کو دشمن کے سامنے ذلیل نہیں کیا۔ لیکن میرے نزدیک صلح کی تجویز سے حضرت حسین کی سیرت عالیہ کی کسی طرح کسر شان نہیں ہوتی۔[2]"

---

[1] یہاں سے جسٹس امیر علی کا تبصرہ شروع ہوا ہے۔

[2] روح اسلام ترجمہ "اسپرٹ آف اسلام" از محمد ہادی حسین۔ اسلامک بک سینٹر دہلی ص ۲۲۵

باب یازدہم

شہادت کے بعد کی کہانی

شہادت تک کے مرحلے میں جس طرح کی بے سروپا کہانیاں اللہ ہی جانتا ہے کہ بنانے والوں نے کن کن مقاصد کے لیے بنائیں اور ہمارے اہلِ تاریخ نے شائع کیں، ان کہانیوں کا سلسلہ شہادت کے المناک منظر پیش کرنے پر ختم نہیں ہو گیا (جنھیں پیش کرنے کی ہمت ہم اپنے اندر نہیں پا سکے کیوں ایک جھوٹ سے خواہ مخواہ دل زخمی کیا جائے) بلکہ ان سے بھی بدتر قسم کے مناظر دکھانے والی کہانیاں ہم اپنی انہی تاریخی کتابوں میں مابعد شہادت کے سلسلے میں پاتے ہیں۔[1]

خواتین کی بے حرمتی

شہادت اور اس کے ذیل کے دلدوز مناظر جس روایت کے اندر آتے ہیں اس کا خاتمہ خواتینِ اہلِ بیت کی بے حرمتی پر کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ حضرت حسینؓ کا سر تن سے جدا کرنے اور آپ کے جسم کی پوشش، کپڑے، جوتے، ٹوپی کھسوٹ لینے کے بعد یہ لوگ خواتین اور خیمے کے مال و اسباب پر ٹوٹے، حتیٰ کہ سروں سے اوڑھنیاں اور چادریں تک کھینچ لی گئیں۔[2] اس کے بعد کی روایت کہتی ہے کہ اس مرحلے پر عمر بن سعد

---

[1] طبری اور ابن اثیر کا تو یہی حال ہے البتہ کہیں کہیں ابن کثیر نے تھوڑی سی احتیاط برتی ہے۔ [2] طبری ج ۶ ص ۲۶۰

بچے تھے اور اعلان کیا کہ کوئی شخص ان عورتوں کے خیمے میں نہ جائے اور ان کے سامان سے کسی نے کچھ لیا ہو تو واپس کرے، مگر کسی نے کچھ واپس نہیں کیا۔[1]

لاش کی بے حرمتی

پھر طبری کی روایت بتاتی ہے عمر بن سعد نے یہ شریفانہ حکم جاری کرنے کے بعد دوسرا اس کے مقابل میں حکم یہ جاری کیا کہ

> "ہاں کون ہے جو اپنے گھوڑے کے ذریعے حسینؓ کی لاش کو روندے؟ چنانچہ دس ہمت والے نکل کر آگے اور انھوں نے یہ "کار خیر" بھرپور طریقے سے انجام دیا۔"[2]

سر کی بے حرمتی اور باقیات قافلہ سے بدسلوکی

اسی روایت کے مطابق آپ کا سر فوراً کوفے کو روانہ کیا گیا اور دوسرے دن قافلے کی خواتین اور باقی ماندہ بچوں کو ساتھ لے کر عمر بن سعد اور اس کی فوج نے کربلا سے کوچ کیا، آگے کی ایک روایت کے مطابق (جس کا راوی حمید بن مسلم ہے) حضرت حسینؓ کا سر اور آپ کے اہل بیت جب ابن زیاد کے یہاں پہنچائے گئے تو اس نے سر کی بھی بے حرمتی اپنی چھڑی اور زبان سے کی اور اہل بیت کے زخمی دلوں پر بھی خوب خوب نمک چھڑکا۔[3] اور پھر اس کے آگے آنے والی روایت کے مطابق حضرت علی بن الحسینؓ (حضرت زین العابدین) جو کربلا میں بیمار صاحب فراش ہونے کی وجہ سے "میدان جنگ" میں نہ نکل سکے تھے (اور لہٰذا ان خود حمید بن مسلم کی "عنایت" سے بچ گئے تھے) کو باقیات قافلہ میں دیکھنا ابن زیاد کو اس قدر ناگوار ہوا کہ اس نے ان کا ستر کھلوا کر بالغ اور نابالغ ہونے کی جانچ کرائی اور نتیجے میں بالغ پا کر قتل کا حکم دیا، مگر پھر مختلف روایتوں کے مطابق مختلف وجوہ سے ان کی

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۶۰ [2] ایضاً ص ۲۶۱ [3] ایضاً ص ۲۶۲-۲۶۳

جان بخشی کر دی[1]

تنقید کی ایک نظر

پچھلے باب میں ہم نے کہا ہے کہ اس واقعہ کی روایتوں میں روایت اور درایت کے اصولوں کے اعتبار سے اس قدر ناقابل قبول اور ناقابل قیاس باتیں بھری ہوئی ہیں کہ کسی بھی روایت کو خاص کر جس سے کسی پر کوئی الزام آتا ہو قبول کرنا اور مان لینا ایک بڑا مشکل اور بھاری ذمہ داری کا کام ہے کیونکہ شبہ کا فائدہ ملزم کو دیا جانا ہر مہذب قانون کا ضابطہ ہے۔ شریعتِ اسلامی کا ضابطہ بھی یہی ہے۔ یہ سب روایتیں جن کا اختصار اوپر کے صفحات میں بیان ہوا اسی الزامی نوعیت کی ہیں۔ تاہم جہاں تک ابن زیاد کا سوال ہے اُس کے متعلق یہ ماننا از روئے قیاس کچھ بہت مشکل نظر نہیں آتا کہ حضرت حسینؓ کا سر اس کے سامنے رکھا گیا ہو تو اس نے آپ کے بارے میں کچھ کہتے ہوئے چھڑی سے آپ کے دانتوں اور سر کو ٹھوکا دیا ہو۔ لیکن آفت رسیدہ خواتین کے ساتھ جس قسم کی نمک پاشی کی باتیں اُس سے منسوب کی گئی ہیں اُن کے لیے جب تک کوئی نہایت مضبوط شہادت نہ ہو کوئی جواز یقین کر لینے کا نظر نہیں آتا۔

حضرت حسینؓ کے دانتوں کو چھڑی لگانا یوں بعید از قیاس نہیں ہے کہ ابن زیاد کو بظاہر حضرت حسینؓ کا کوئی ایسا احترام نہیں تھا جیسے احترام کے تخیل سے ہمیں یہ بات بے حد قبیح معلوم ہوتی ہے۔ اُسے اگر کوئی احترام ہوتا تو کربلا کا سانحہ ہی کیوں پیش آتا۔ لیکن خواتین کی بات بہت مختلف ہے۔ حضرت حسینؓ کے لیے بے احترامی کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ ابن زیاد جس حکومت کا عہدہ دار بلکہ حقیقی نمک خوار تھا حضرت حسینؓ اس کو چیلنج کرنے کیلئے نکلے تھے۔ خواتین بے چاری محض تابع تھیں اور انھوں نے کوئی عمل یزید کی حکومت کو

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۶۴

چیلنج کرنے کا نہیں کیا تھا۔[1] اس لیے قرین قیاس نہیں ہے کہ وہ خواتین کے ساتھ عام طور سے اُن کی غمزدگی میں، ایسے طور سے پیش آیا ہو جسے کوئی بھی ماحول پسند نہیں کر سکتا۔

ایسی خلاف قیاس بات کا الزام کسی کو دینے کے لیے بہت ٹھوس شہادت چاہیے۔ اور یہاں شہادت کس کی ہے؟ حمید بن مسلم کی۔ ایسا جھوٹا اور کپا ٹپا راوی جس کے جھوٹ اور افسانہ تراشی کی شہادت طبری کے اندر کی اس کی روایتوں میں موجود ہے۔ حتیٰ کہ انہی روایتوں میں وہ مشمول زیر بحث روایت موجود ہے[2] جو اوپر کے صفحات میں پیش کی گئیں۔ آیئے ایک نظر ڈال لیجیے۔

حمید بن مسلم کے تضادات

اس روایت کو (جو کہ زیر بحث ہے) شروع کرتے ہوئے حمید بن مسلم کہتا ہے کہ کربلا سے اُسے عمر بن سعد نے اپنے گھر روانہ کیا تاکہ اس کی خیر و عافیت کی خبر اور "فتح" کی خوشخبری پہنچائے۔ اور یہ کام کر کے وہ ابن زیاد کی طرف گیا تو وہاں دیکھا کہ سر حسینؓ رکھا ہوا ہے اور قافلہ حسینی کے باقیماندہ افراد بھی پہنچے ہوئے ہیں۔ بس اس کے آگے وہ خواتین اور اہل بیت کے زخموں پر ابن زیاد کی نمک پاشی کا نقشہ سناتا ہے۔ جبکہ یہی شخص ایک صفحہ پہلے (ص۳۶۱) کی روایت میں یہ بیان دے رہا ہے کہ عمر بن سعد نے اس کو اور فلاں دوسرے شخص کو حضرت حسین کا سر ابن زیاد کے پاس پہنچانے کے لیے بھیجا۔ یعنی اس کی ایک روایت کے مطابق سر پہنچانے والا یہ خود تھا اور دوسری روایت کے مطابق کسی دوسرے شخص نے یہ کام کیا۔

---

[1] شیعہ حضرات کی کتابوں میں ان خواتین کی طرف جو باغیانہ تقریریں کوفے میں ان کے داخلے کے موقع پر منسوب کی گئی ہیں، ذرا سے غور سے بھی آدمی اندازہ کر سکتا ہے کہ وہ سب تصنیف ہے۔ ورنہ جب وہ انہی لوگوں کے بقول قیدیوں کی طرح لے جائے جا رہی تھیں تو کون انھیں راستے میں کھڑے ہو ہو کر باغیانہ تقریریں کرنے دیتا۔

[2] پچھلے باب میں اس کے کردار پر کافی روشنی پڑ چکی ہے۔

بہرحال یہ شخص ایک "حاضر و ناظر" قسم کا راوی ہے، ہر جگہ موجود ملتا ہے۔ اور متضاد قسم کی باتوں پر یقین کی دعوت دیتا ہے۔ اس کی شہادت پر کیسے کسی کو ملزم ٹھیرایا جا سکتا ہے؟ افسوس ہوتا ہے کہ آخر طبری نے اس کے ایسے بیانات کیونکر بلا کسی تنقید اور تبصرے کے جمع کر دیئے ہیں جو خواہ مخواہ تشویش ذہن اور ضیاع وقت کا باعث ہوں!

یہی وہ روایت کہ حضرت زین العابدین کا ستر کھول کر ان کے بلوغ اور عدم بلوغ کا امتحان کیا گیا۔ تو اس مذاق کے لیے کیا کہا جائے! اس راوی کو اتنا بھی پتہ نہ تھا کہ حضرت زین العابدین ۲۳ سال کی عمر کے شادی شدہ اور ایک بیٹے حضرت محمد الباقر کے باپ تھے۔ اور بچہ بھی قافلے میں موجود تھا۔[1]

---

[1] شیعہ مآخذ میں تو ابن زیاد کے بارے میں اس کی تعریف کی وہ وہ آتیں ہیں کہ اللہ کی پناہ اور وہ کسی حد تک سنیوں میں بھی پھیلی ہوئی ہیں۔ اس کی بابت تفصیل میں جانا ہمیں نہیں ہے۔ البتہ ایک روایت کا ذکر یہاں کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے تاکہ ابن زیاد کے ساتھ بھی ہم کوئی بے انصافی کا معاملہ نہ کریں بلکہ حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کریں۔ یہ روایت طبری ہی میں ہے اور بتاتی ہے کہ:

فجئی برأس الحسین الی ابن	پس حسینؓ کا سر ابن زیاد کے پاس لایا گیا اور
زیاد فوضع بین یدیہ تجعل	سامنے رکھ دیا گیا۔ وہ اپنی چھڑی سے اشارہ
یقول بقضیبہ ویقول ان	کرتا اور کہنے لگا کہ ہائے ابو عبد اللہ کے
ابا عبد اللہ قد کان شمط قال	بال تو کھچڑی ہو گئے تھے اور ان کی بیویاں
وجیئ بنسائہ وبناتہ واھلہ	بیٹیاں اور دیگر اہل خانہ بھی لائے گئے
وکان احسن شئ صنعہ ان	ان کے معاملے میں جو برتاؤ سب سے اچھی
امر لھم بمنزل فی مکان معتزل	بات یہ کی تھی کہ ان کے قیام کے لیے ایک
واجری علیھم رزقا وامر لھم	ذرا الگ تھلگ جگہ پر انتظام کیا تھا اور
بنفقۃ وکسوۃ قال فانطلق	ان کا کھانا پینا تھا اور (بقیہ حاشیہ آئندہ صفحہ پر)

اس کے بعد پیچھے کی طرف چلیے۔ حضرت حسینؓ کے جسد خاکی کو گھوڑوں سے روندوانے کی روایت اُن روایتوں میں سرِفہرست رکھے جانے کی مستحق ہے جن کی وجہ سے روایتوں کا یہ سارا کارخانہ جعل و فریب پر مبنی نظر آتا ہے۔ اس کا راوی بھی وہی مُسلم بن حمید ہے۔ اسی روایت میں حمید کا وہ بیان بھی آتا ہے جس میں اس نے بتایا ہے کہ مجھے عمر بن سعد نے حضرت حسینؓ کا سر لے کر ابن زیاد کے پاس روانہ کیا تھا، اور آپ ابھی معلوم کر چکے ہیں کہ اسی شخص کی دوسری روایت اس بیان کی تردید کرتی ہے۔ علاوہ ازیں اس روایت میں جھوٹ کی یہ منہ بولتی علامت بھی موجود ہے کہ حضرت حسینؓ کے ساتھیوں میں سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

غلامان منهم لعبد اللہ بن
جعفر ابن جعفر اتیا رجلاً
من طیّ فلجآ الیه فضرب
اعناقهما وجاء برؤسهما
حتی وضعهما بین یدی
ابن زیاد، قال فهمّ بضرب
عنقه وامر بداره فهدمت۔

دوسری عورت یا اور اخبار فراہم کئے بھی
احکام دیئے تھے' آگے روایت میں ایک واقعہ پیش
آیا کہ ان میں سے عبداللہ بن جعفر کے دو بیٹے
نے نکل کر بنو طے کے ایک آدمی کے یہاں
پہنچ گئے اور اس سے پناہ چاہی تو اس ظالم
نے ان کی گردنیں ماردیں اور سر لے کر ابن
زیاد کے پاس آیا۔ راوی کہتا ہے کہ ابن
زیاد نے غصے میں اس کے قتل کا ارادہ
کیا اور پھر فیصلہ بدل کر اس کا گھر ڈھا دینے
کا حکم دیا اور وہ ڈھا دیا گیا۔

اس روایت میں اور سب باتیں خود سمجھ لینے کی ہیں مگر ایک نکتہ عام قارئین کے اعتبار سے وضاحت طلب ہے کہ اہل عرب کے یہاں کنیت سے کسی کا ذکر یا اس کو خطاب ازراہ تعظیم ہوتا ہے اس روایت کے مطابق ابن زیاد نے حضرت حسین کا ذکر آپ کی کنیت ابوعبداللہ سے کیا ہے اور چھڑی سے کہیں ٹھوکا نہیں دیا ہے، بلکہ اشارہ کیا ہے جو ابن زیاد کے رویے کو قابل حفاظت شکل دینے والی بات ہے اور کم سے کم خواتین کے ساتھ سلوک کے سلسلہ میں تو ہم اس روایت کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔

شہداء کی تعداد بہتر بتاتا ہے جو محض ایک شہرت ہے واقعہ نہیں۔ جناب علی نقی صاحب لکھنوی بھی لکھتے ہیں کہ:۔

> "ایک تاریخی صراحت کے مطابق یہ تینتیس سوار اور چالیس پیادوں سے زیادہ نہیں تھے اور اسی لیے شہدائے کربلا کے لیے بہتر کا لفظ زبان زد خلائق ہے مگر کربلا کے حالات جنگ اور مجاہدین کے ناموں کی تفصیل اور دوسرے متعلقہ واقعات سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ یہ تعداد سو سے زیادہ اور دو سو سے کم تھی۔"[1]

اگر یہ شخص (حمید بن مسلم) واقعی کربلا میں موجود ہوتا یا جو روایتیں اس کے نام سے آتی ہیں وہ واقعی کسی بھی ایسے شخص کی ہوتیں جو کربلا میں موجود تھا تو بہتر کی خلاف واقعہ تعداد اس نے نہ بتائی ہوتی۔ اور یہی وہ روایت ہے جو خواتین کے سروں سے چادریں تک کھینچ لینے کا قصہ سناتی ہیں، پس خود ہی سمجھ لینا چاہیے کہ کس قسم کی روایت ہے اور اس میں جو باتیں بیان کی گئی ہیں اُن کی کیا حیثیت ہے؟

قصر یزید میں

بیان میں کہا گیا ہے کہ کوفے سے حضرت حسینؓ کا سر امیر یزید کے پاس دمشق بھیجا گیا۔ علی ہذا قافلۂ حسینی کے باقیماندہ افراد خواتین اور بچے بھی وہیں پہنچائے گئے۔ اس بارے میں جو روایتیں مشہور ہیں وہ تو یہ ہیں کہ یزید نے بھی سر کے ساتھ ٹھوکا دینے کی گستاخی کی اور بقیۃ السیف اہل خانہ کے ساتھ بھی رنج پہنچانے والی باتیں کیں۔ بلکہ شیعہ روایات کے مطابق تو اہل خانہ کا قافلہ کوفے سے دمشق تک لایا ہی گیا غیر مسلم قیدیوں کی طرح نہایت ذلت اور تشہیر کے ساتھ تھا۔ اور پھر گھنٹوں محل کے دروازے پر کھڑا رکھا گیا وغیرہ وغیرہ خرافات۔ جن میں اموںوں کے ہاتھوں خاندان نبوت کی وہ تذلیل دکھا کر جو مسلمانوں نے کبھی غیر مسلموں کے ساتھ بھی روا نہیں رکھی

---

[1] شہید انسانیت صـــ ۳۰۰

بلکہ ان اہلبیت کی خود اپنے ہاتھوں بھی اپنی تذلیل اور تشہیر (انکی تقریروں وغیرہ کی شکل میں) دکھا کر دراصل شیعہ مذہب کے تمام عقائد اور اعمال و رسوم کی سند اور اصل اہلبیت ہی سے فراہم کرنے کا وہ فنکارانہ انتظام کیا گیا ہے کہ ایک فن کے اعتبار سے بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ لیکن جسکو اصلیت اور واقعیت سے دلچسپی ہو اُسکے لیے اسی طبری میں جس میں خود کافی لغویات موجود ہیں، ان تمام جعلساز لغویات کی تردید کا سامان بھی موجود ہے۔

وہ ایک روایت جو دوسرے باب میں گذر چکی ہے کہ ابن زیاد نے جو آدمی حضرت حسینؓ کا سر لیکر دمشق بھیجا تھا اور اُس نے کربلا کی یہ کہانی سنائی تھی کہ حسینؓ اور اُنکے ساتھی ہمارے سامنے ایسے بھاگے جیسے شکاری کے سامنے کبوتر حتیٰ کہ ذرا سی دیر میں اُنکا کام کر دیا گیا۔ اس میں آگے مزید یہ الفاظ بھی تھے بس اب وہاں اُن کے جسم ہیں بے لباس کپڑے ہیں خون آلود چہرے خاک آلود ...الخ

وہی روایت اس کے بعد بتاتی ہے:

فدمعت عین یزید وقال قد کنت	یہ سنکر یزید کی آنکھیں بھر آئیں اور کہا کہ میں
ارضی بطاعتکم بدون قتل	(کہا کیا) میں تو قتل حسینؓ کے بغیر بھی تم سے راضی
الحسین لعن اللہ ابن سمیہ[1] اما	رہتا اللہ ابن سمیہ کو غارت کرے۔ بخدا اگر
واللہ لو انی صاحبه فعفوت عنه	میں اگر اُسکی جگہ ہوتا تو حسینؓ سے درگزر ہی
فرحم اللہ الحسین ولم یصله	کرتا۔ اللہ حسینؓ پر رحمت کرے اور پھر
بشیء۔	اُس آدمی کو کوئی انعام و صلہ نہ دیا جسکا وہ متوقع تھا)

اس کے بعد راوی مزید بیان اس بارے میں دیتا ہے کہ ابن زیاد نے حضرت حسینؓ کے اہل خانہ کو بھی دو آدمیوں کی تحویل میں امیر یزید کے پاس ارسال کیا تھا ان دو میں سے ایک کا نام مُحفّز بن ثعلبہ تھا۔ اس محفّز نے محل کے دروازے پر آکر آواز لگائی:

ھذا محفّز بن ثعلبة اتی	یہ محفّز بن ثعلبہ ہے جو ایسوں

---

[1] ابن سمیہ تو ابن زیاد کے باپ زیاد کو کہا جاتا ہے واللہ اعلم یہاں ابن زیاد کے لیے کیونکر استعمال ہوا۔

یا اللئام الفجرۃ ۔ ایسوں "کو (معاذ اللہ) لے کر آیا ہے ۔

یزید نے اس کے جواب میں کہا کہ[1] ۔

ما ولدت أم مُحفّز شرًّا وألأم — مُحفّز کی ماں نے اس سے زیادہ بُرا اور

(منه[2]) — اس سے زیادہ لئیم نہیں جنا ۔

ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ روایت ضرور صحیح ہے لیکن یہ ضرور کہا جائے گا کہ اس روایت کی موجودگی اُن روایتوں کو مشکوک ضرور بنا دیتی ہے جن میں یزید کے اس رویّے کے برعکس رویّہ دکھایا گیا ہے۔ اور یہ بھی کہا جائیگا کہ جو مزاج جو طبیعت اور جو خاندانی ماحول یزید کیلئے فی الوقت ثابت ہے (نہ کہ خانہ ساز قیاسی) اور حضرت حسین کے لیے اسکے جن رویّے اور جن احساسات کی مضبوط شہادت کربلا کے واقعۂ شہادت سے کچھ پہلے تک کیلئے پائی جاتی ہے جن کا کچھ بیان اس کتاب کے بعض گزشتہ ابواب میں بھی ہوا ہے، یہ ثبوت اور یہ شہادتیں بہرحال اپنا وزن اس روایت کے اور اس جیسی روایتوں کے پلڑے میں ڈالتی ہیں ۔

حضرت محمد الباقر کی روایت اور یہ قصّے ؟

ہم نے حضرت محمد الباقر کی روایت کا بار بار حوالہ گزشتہ صفحات میں دیا ہے اور قریب حضرت شہادت تک کا حصہ نقل بھی کیا ہے۔ اس حصے کے بعد اس روایت میں بھی بعد شہادت والا قصہ ابن زیاد اور یزید سے متعلق آتا ہے ضروری ہے کہ اس گفتگو میں اسکو بھی سامنے لایا جائے۔

اس روایت کو ہم نے شہادت حضرت حسینؓ تک نقل کیا تھا اس کے آگے اس روایت میں ہے کہ آپکو قبیلۂ مذحج کے ایک آدمی نے قتل کیا تھا پھر اس نے سر کو تن سے جدا کیا اور

---

[1] بہت بُھدے الفاظ تھے اس لیے ترجمہ نہیں کیا گیا ہے۔ عربی الفاظ میں لئام لئیم کی جمع ہے اور فجرہ فاجر کی ۔

[2] طبری ج ۶ ص ۲۶۷ " طبری میں شرًّا والأم ہے جو بظاہر غلط ہے "شرًّا وألأم منه" ہونا چاہیے ابن اثیر میں یوں آیا ہے " ألأم وأحمق منه " ج ۳ ص ۲۹۵ ۔

لے کر عبید اللہ بن زیاد کے پاس آیا اور انعام کا طالب ہوا۔ ابن زیاد نے یزید کے پاس روانہ کر دیا۔ یزید کے سامنے لا کر رکھا گیا تو وہ آپکے مُنہ پر چھڑی سے ٹھوکے دیتے ہوئے ایک شعر پڑھنے لگا (جس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ حسین نے از راہِ حق ناشناسی و حق تلفی ہمارے خلاف صف آرائی کی) حضرت ابو برزہ اسلمیؓ صحابی موجود تھے انہوں نے ٹوکا کہ چھڑی ہٹالو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بار بار دیکھا ہے کہ انکے مُنہ پر مُنہ رکھے ہوئے چوم رہے ہیں۔ بعد میں حضرت حسینؓ کے اہلِ خانہ بھی کوفے سے دمشق ہی پہنچا دیئے گئے۔ اس موقع پر یزید نے اپنے خواص اہلِ شام کو جمع کیا جن میں سے ایک نے خانوادہ حسینی کی ایک صاحبزادی پر نظر ڈال کر یزید سے کہا کہ امیر المومنین یہ لڑکی مجھے بخش دیجئے۔ حضرت زینبؓ نے آگے آ کر کہا کہ ایسی بات کوئی شخص دینِ حق سے باہر ہو کر ہی کہہ سکتا ہے۔ اس نے اپنی بات پھر دہرائی تو یزید نے کہا کہ باز آجاؤ (کُفَّ عن ھٰذا) اور پھر ان لوگوں کو اپنے گھر میں بھیج دیا۔ بعد ازاں انکے لیے سامانِ رخصت مہیا کر کے انکو مدینے روانہ کیا۔[1]

گویا اس روایت کا بیان بھی اِک سلسلے میں انہی روایتوں کی طرح ہے جن کے مقابلے میں ہم نے ابھی اس سے اوپر کی ذکر کردہ روایت (بحوالہ الطبری صفحہ ۲۶۴) کو قابلِ ترجیح قرار دیا۔ یعنی اسمیں بھی منہ پر چھڑی لگانے والی بات آئی ہے۔ سو اس سلسلے میں پہلی بات تو ہمارے نزدیک قابلِ توجہ یہ ہے کہ یزید سے ہم حضرت حسینؓ کیلئے اُس احترام کی توقع نہیں کر سکتے جو ہمارے نزدیک ضروری ہے اسلیے بالکل ممکن ہے کہ چھڑی سے اشارہ کرتے ہوئے کچھ شکایت کا واقعہ پیش آیا ہو۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ روایت کے اس حصے میں کھُلے طور پر الحاق کی نشانیاں موجود ہیں۔ اور وہ یہ ہیں:۔

۱۔ یہ روایت کہتی ہے کہ قاتل نے سر کو تن سے جدا کیا اور سیدھا لیکر ابن زیاد کے پاس پہنچ گیا۔ حالانکہ اس کا تصور نہیں کیا جا سکتا کہ بغیر سالارِ لشکر ابن سعد کے بھیجے ہوئے کوئی شخص یہ کام بالا ہی بالا خود کر ڈالتا۔

۲۔ یہ دو شعر بھی روایت میں اسی شخص کی زبان سے ابن زیاد کے سامنے کہلوائے گئے ہیں

---

[1] طبری ج ۲ ص ۲۲۰-۲۱

جن کا ترجمہ ہے

"حضور والا میری سواری کو سونے اور چاندی سے لاد دیجئے۔ اس لیے کہ میں نے
ایک شاہ ذی شان کو قتل کیا ہے۔
میں نے اس کو قتل کیا ہے جو اپنے نسب اور ماں باپ کے اعتبار سے سب سے اچھا ہے"

لیکن یہی وہ شعر پڑھتا ہوا قاتل ہمیں ایک دوسری روایت میں کربلا کے میدان میں عمر بن سعد کے خیمے پر بھی دکھایا گیا ہے۔ اور پھر اس میں یہ بھی ہے کہ عمر بن سعد نے سنا تو کہا کہ:

"واللہ تو ازلی مجنون ہے۔ لاؤ اس کو اندر لاؤ۔ چنانچہ اندر لیا گیا تو چھڑی سے اس کی پٹائی کی۔ اور کہا ارے او پاگل تو ایسی باتیں منہ سے نکال رہا ہے؟ ابن زیاد نے اگر سن لیا تو تیری گردن مار دے گا۔"[1]

عمر بن سعد کے خیمے پر بھی فی الواقع یہ شعر پڑھے گئے تھے یا نہیں؟ یہ الگ بات ہے لیکن یہ نسبت اسکے کہ قاتل سر الگ کر کے بالا ہی بالا ابن زیاد کے پاس لے گیا ہو اور وہاں ان اشعار کی صدا لگائی ہو، یہ بات زیادہ سمجھ میں آنیوالی ہے کہ وہ یہ کارنامہ کر کے عمر بن سعد سالار لشکر کے خیمے پر آیا ہو اور داد و انعام کا طالب ہوا ہو۔

بہرحال کچھ بھی ہو۔ ایک روایت کے مطابق یہ شعر قاتل نے میدان کربلا میں ابن سعد کے خیمے پر پڑھے تھے۔ اب اگر بعد میں یہی قصہ کوئی ابن زیاد سے متعلق کر کے سناتا ہے تو صاف طور سے یہ کسی گڑبڑ کا شاخسانہ ہے اور وہ بھی بہت اوٹ پٹانگ قسم کی گڑبڑ۔ اور پھر اس کھلی گڑبڑ کے نتیجے میں بالکل قرین قیاس نظر آتا ہے کہ یزید کی طرف چھڑی سے ٹھوکا دینے" کی نسبت بھی اسی نوعیت کی چیز ہو یعنی یہ کہ واقعہ تو ابن زیاد کا تھا۔ جیسا کہ اور روایتوں میں آ چکا ہے۔ مگر حافظہ کی گڑبڑ یا ارادے کی گڑبڑ سے کسی راوی نے یزید کے سر لگا دیا ــــ اور یاد رہے کہ ابن زیاد کے بارے میں بھی ہم اپنی رائے کا اظہار کر چکے ہیں کہ ایسے واقعہ کا

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۶۱

ہونا بعید از قیاس اگرچہ ہرگز نہیں ہے، البتہ جب ایک روایت "ٹھوکا دینے" کے بجائے اشارہ کرنے" کی موجود ہے تو کم از کم شک کا فائدہ ابن زیاد کو پہنچنے سے ہم نہیں روک سکتے۔ خواہ وہ قتل حسینؓ کی اصل ذمہ داری کے لحاظ سے ہمیں کتنا ہی مبغوض ہو۔

خواتین خانوادۂ نبوت کے ساتھ اور صاحبزادہ علی بن الحسینؓ کے ساتھ رنج رسانی اور سخت کلامی وغیرہ کی روایتیں جو طبری میں بھی آتی ہیں اور دوسری کتابوں میں بھی ہیں ان سب کے بارے میں ہم اپنے آپکو یہی کہنے کے لیے مجبور پاتے ہیں کہ جب ان روایتوں سے بالکل مختلف صورت بتلانے والی روایتیں بھی موجود ہیں جو ابھی ہمارے سامنے گذریں تو کوئی جواز نہیں کہ برائی اور بدسلوکی کا معاملہ دکھانے والی روایتیں قبول کی جائیں اور یہ تو ماننا ہی ہوتا ہے کہ یزید نے اس قافلے کو بہت دے دلا کر نہایت احترام کے ساتھ ایسے لوگوں کی معیت میں مدینے روانہ کیا تھا جن کے احترام اور حفظ مرتبت کے رویئے سے اہل قافلہ نہایت خوشنود اور شکر گزار ہوئے[۱]۔ اور پھر مدت العمر اس خاندان کے ساتھ غیر معمولی مراعات اور حسن سلوک کا رویہ رہا جس کی تفصیلات میں جانے کی شاید ضرورت نہیں، اور پھر ایسا ہی رویہ اس خانوادۂ نبوت کا بھی بنو امیہ کے ساتھ رہا۔ مگر اسکو کیا جائے کہ ان سارے حقائق کے باوجود من گھڑت روایتوں کے پروپیگنڈے سے بنائی ہوئی جذباتی فضا میں لوگ یہیں یہاں تک یقین ماننے پر لے آئے ہیں کہ کوفے سے جب شہدائے کربلا کے سر اور بقیۃ السیف افراد کا قافلہ دمشق کے حدود میں داخل ہوا اور یزید کی "منتظر نظریں" اپنے محل کی بلندی سے اس پر پڑیں تو اس نے وجد میں آکر یہ کافرانہ شعر پڑھے۔

لما بدت تلک الحمول و اشرقت   تلک الرؤس علی ربی جیرون
نعق الغراب فقلت نح او لا تنح   فلقد قضیت من النبی دیونی

ترجمہ: جب جیرون کے ٹیلوں پر کجاوے ابھرے اور وہ سر نظر آئے تو کوے نے کائیں کائیں شروع کی،

---

[۱] تاریخ طبری ج ۷ ص ۳۷۶

میں نے کہا کہ تو بول یا مت بول میں نے تو نبی سے اپنا قرض چکا لیا ہے (یعنی جنگ بدر کا قرض چکا دیا) کاش ہم سمجھ سکتے کہ یہ باتیں غم حسینؓ اور حمایت حسینؓ کے پردے میں کس کافرانہ منصوبے کی تکمیل ہیں

امام ابن تیمیہؒ کا ارشاد

اس موقع پر امام ابن تیمیہؒ کی بات قابل ذکر نظر آتی ہے۔ اپنی مشہور کتاب "منہاج السنہ" میں لکھتے ہیں جس کا ہم یہاں خلاصہ پیش کر رہے ہیں:

> "یزید کے سلسلے میں لوگوں کے تین گروہ ہیں، ایک کا اعتقاد ہے کہ یزید صحابی بلکہ خلفائے راشدین میں سے یا بلکہ انبیائے کرامؑ کے قبیل سے تھا۔ اسکے برعکس ایک دوسرا گروہ کہتا ہے کہ وہ کافر اور بد باطن منافق تھا۔ اسکے دل میں بنو ہاشم اور اہل مدینہ سے اپنے اُن کافر اعزا و اقارب کا بدلہ لینے کا جذبہ تھا جو جنگ بدر وغیرہ میں مسلمانوں کے ہاتھ سے مارے گئے تھے۔ چنانچہ یہ لوگ کچھ اشعار اس کی دلیل میں اسکی طرف منسوب کرتے ہیں[1] لیکن یہ دونوں قول ایسے غلط اور بے بنیاد ہیں کہ ہر سمجھدار اس کا بخوبی اندازہ کر سکتا ہے یزید حقیقت میں ایک مسلمان فرمانروا اور بادشاہانہ خلافت والے خلفاء میں سے ایک خلیفہ تھا۔ نہ وہ صحابی یا نبی تھا اور نہ ہی کافر و منافق۔"

حضرت حسینؓ اور یزید کے قضیے کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> "ایک مجہول السند روایت میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت حسینؓ کا سر یزید کے سامنے لاکر رکھا گیا اور اُس نے آپ کے دندان کو اپنی چھڑی سے ٹھوکا دیا۔ یہ روایت نہ صرف یہ کہ از روئے سند ثابت نہیں ہے بلکہ اس کے مضمون ہی میں اس کے جھوٹ ہونے کا ثبوت ہے، اس میں جن صحابہؓ کی موجودگی اُس وقت یزید کے پاس بتائی گئی ہے (کہ انھوں نے اس کی حرکت پر ٹوکا تھا) وہ شام میں نہیں عراق

---

[1] یہی اشعار ہیں جو ابھی ہم نے نقل کیے۔

میں پہنچتے تھے۔ اور اس روایت کے برعکس متعدد لوگوں کی روایت ہے کہ یزید نے نہ قتلِ حسینؓ کا حکم دیا نہ اس کا یہ مقصود تھا۔ بلکہ وہ تو اپنے والد حضرت معاویہؓ کی وصیت کے مطابق آپ کا اعزاز و اکرام ہی پسند کرتا تھا۔ البتہ اس کی خواہش یہ تھی کہ آپ اس کی حکومت کے خلاف اقدام کے ارادے سے باز آئیں۔ اور چونکہ آخر میں یہی ہوا کہ کوفے کے قریب پہنچ کر آپ نے اپنا ارادہ ختم کر دیا اور یزید کے پاس جانے یا کسی سرحد پر نکل جانے کی پیش کش کی۔ اس لیے جب یزید اور اس کے گھر والوں کو آپ کی شہادت کی خبر پہنچی تو ان کے لیے نہایت تکلیف دہ ہوئی۔ یزید نے اس وقت یہاں تک کہا کہ خدا کی لعنت ہو ابن مرجانہ (ابن زیاد) پر۔ اس کی اگر حضرت حسینؓ سے رشتہ داری ہوتی تو وہ کبھی ایسی حرکت نہ کرتا۔ پھر اس نے آپ کے اہلِ خاندان کیلئے نہایت اچھی واپسی کا سامان کیا اور ان کو مدینے پہنچوایا اور اس سے پہلے پیش کش بھی کی تھی کہ وہ چاہیں تو دمشق ہی میں اس کے پاس رہیں۔ ہاں یہ ٹھیک ہے کہ اس نے حسینؓ کے قاتلوں سے بدلہ نہیں لیا۔

اور یہ جو روایتیں بیان کی جاتی ہیں کہ حضرت حسینؓ کے گھرانے کی خواتین کو قیدی اور باندی بنا کر شہر شہر گھمایا تو اللہ کا شکر ہے کہ مسلمانوں نے کبھی کسی ہاشمی خاتون کو باندی نہیں بنایا۔ عام امتِ مسلمہ تو کیا خود بنی امیہ میں ہاشمی خواتین کی تعظیم کا یہ حال تھا کہ حجاج بن یوسف نے (جو قریشی نہیں ثقفی تھا) عبداللہ بن جعفر کی بیٹی سے شادی کر لی تھی تو خاندانِ بنو امیہ اس قدر برہم ہوا کہ دونوں کی علاحدگی کرائے بغیر نہ رہا۔[1] "

* * *

---

[1] انتخاب و تلخیص از منہاج السنہ ص ۳۲۱ تا ۳۲۵

باب دوازدہم

وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا

ایک نوشتۂ تقدیر تھا جو پورا ہوا

کربلا کا یہ حادثۂ فاجعہ، اسے بجز تقدیرِ الٰہی کے اور کیا کہا جائے؟ ـــــ کوئی سمجھ میں آنے والی بات ہے کہ اہلِ تعلق اور اہلِ محبت، جن میں وقت کے بزرگ ترین اکابر اہلِ علم و دین بھی ہیں، ایک زبان ہو کر سمجھائیں کہ عراق کا قصد مت کیجئے۔ یہ غداروں اور دھوکہ بازوں کی سرزمین ہے، صبح و شام بدل جانے والوں کی سرزمین ہے، اور ان آزمائے ہوئے نابکاروں کی سرزمین ہے جنہوں نے آپ کے والد ماجد کو رُلایا اور آپ کے بھائی کو کبھی نہ بھلایا جانے والا تجربہ کرایا۔ مگر یہ ساری فہمائشیں دھری رہ جائیں۔ نہ محمد بن حنفیہ جیسے جاں نثار بھائی کی مؤدبانہ اور حکیمانہ گزارش کام آئے۔ نہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی بزرگانہ اور محبانہ فہمائش۔ نہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن حارث کا ہر پہلو سے سمجھانا اور نہ حضرت عبداللہ بن مطیع کا فدویانہ واسطے دینا، نہ حضرت ابوسعید خدری، حضرت واثلہ بن واقد اللیثی، حضرت مسور بن مخرمہ اور حضرت جابر بن عبداللہ کا اپنے اپنے انداز سے فیصلہ بدلوانے کی کوشش کرنا۔ حتیٰ کہ وہ آخر میں حضرت عبداللہ بن جعفر کا بیچ میں آ کر آخری زور لگا لینا بھی اسی طرح بے کار جائے، جیسے کمان سے نکلے تیر کو واپس لانے کی کوشش بے سود ہوا کرتی ہو!

اور پھر جب وقت آتا ہے کہ آپ (حضرت حسینؓ) سفر کے آخری مرحلے میں اُس مہم سے دستکشی کا فیصلہ فرما لیتے ہیں جس مہم کے لیے سفر اختیار فرمایا گیا تھا تو قضائے الٰہی یہاں بھی آڑے آجاتی ہے اور عبیداللہ بن زیاد جس کو بظاہر بڑی خوشی کے ساتھ آپ کی تین باتوں میں سے یزید کے پاس جانے والی بات تو مان ہی لینی چاہیئے تھی کہ اچھا ہے وہ جائیں اور یزید جانیں میں آزمائش سے بچا۔ مگر بالکل خلاف قیاس و گمان ابن زیاد نے آپ کی تینوں باتوں کو یکساں طور پر رد کر دیا۔ اور پہلے کوفے آنے کی وہ شرط لگا دی کہ حادثہ اور المیہ ٹلنے کی شکل بنتے بنتے بگڑ گئی ـــــ آخر اسے تقدیر الٰہی کے سوا اور کیا کہا جائے؟

زبالہ کی منزل پر جب آپکو اپنے عمزاد اور سفیر مسلم بن عقیل کی کوفے میں گرفتاری اور انجام کی خبر ملی اور وہ ساری بساط اُلٹی ہوئی نظر آئی جس کی بنیاد پر آپ نے سفر شروع کیا تھا۔ تو وہ پہلا وقت تھا کہ آپ کو (غالباً عورتوں اور بچوں کے خیال سے) سفر ترک کر کے واپس ہو جانے کا خیال ہوا۔ اور یہ ایک مناسب وقت تھا کیونکہ کوفہ یہاں سے ابھی کچھ دور تھا۔ اور اُن مخلصین کی فہمائشوں، گزارشوں اور منتوں کے پس منظر میں جو اس سفر سے مانع ہو رہے تھے۔ اور ان تجربات کے پس منظر میں جو حضرت علیؓ اور حضرت حسنؓ کو اہل کوفہ سے پیش آئے تھے، اور سب سے بڑھ کر خود مسلم بن عقیل کے خط کے پس منظر میں جو انھوں نے اپنی گرفتاری پر اہل کوفہ کی بزدلی اور غداری کے حوالے سے حضرت حسینؓ کو اس مقصد سے لکھا تھا کہ وہ سفر ترک کر کے پیچھے کو لوٹ جائیں (ان سب باتوں کے پس منظر میں) کسی کو بھی واپسی کے خیال سے اختلاف نہ ہونا چاہیے تھا مگر جیسے کہ کوئی بات ہو کر رہتی ہو اور کوئی نہیں خود برادران مسلم بن عقیل اَڑ گئے کہ نہیں اب پیچھے نہیں لوٹا جا سکتا۔ ہم اپنے بھائی کا بدلہ لیں گے یا اپنی جان بھی دے دیں گے، ظاہر بات ہے کہ اس صورت حال میں حضرت حسینؓ کے لیے ممکن نہ تھا کہ واپسی پر اصرار فرمائیں، آپکو واپسی کا خیال ترک کر کے معاملہ اللہ پر چھوڑ دینا پڑا۔ اور گویا پھر تقدیر کا ہاتھ بیچ میں آ گیا۔

اور پھر جب قادسیہ کے قریب پہنچ کر مرحلہ وہ آگیا کہ حالات کی خبروں کی بجائے حالات آ کی

ایسی افسوسناک شکل صورت ہی سامنے آجائے اور اس مرحلے پر برادرانِ مسلم بھی غالباً اپنے جذبات کے عالم سے نکل آئے۔ تو بہ ظاہر واپسی کے خیال پر عمل کرنا تو ممکن نہیں رہا تھا مگر آپ نے ٹکرانے کی سمت سے بہرحال ہٹ جانے کے لیے ایک غیر معمولی فیصلہ فرمالیا۔ یہ فیصلہ تھا یزید کے پاس دمشق چلے جانے کا!

بلاشبہ یہ ایک غیر معمولی فیصلہ تھا۔ یہ ایک انقلاب لا سکتا تھا۔ روایات میں صراحت ہے کہ آپ نے یہ فیصلہ یزید کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دینے (وضع الید فی الید) کیلئے کیا تھا (اور صراحت نہ بھی ہو تب بھی جن حالات میں آپ یزید کے پاس جا رہے تھے، اُن حالات میں آپ کے وہاں جانے کے اور کوئی دوسرے معنی نہیں ہوتے)[1] پس ابن زیاد کو بصد مسرت یہ بات قبول کرنی تھی کہ آپ یزید کے پاس تشریف لے جائیں۔ حضرت حسینؓ اور از خود یزید کے پاس جانے کا ارادہ فرما رہے ہیں! اس سے زیادہ کسی کو کیا چاہیے؟ زیادہ سے زیادہ اس کا اطمینان کر لیا جاتا کہ آپ واقعی وہیں جائیں گے اور کہیں نہیں چلے جائیں گے۔ اس کیلئے ابن زیاد اپنا ایک دستہ ساتھ بھی کر سکتا تھا۔ بلکہ بعض روایات کے مطابق تو آپ نے عمر بن سعد سے فرمایا ہی یہ تھا کہ:

فان ابیت هذا فسیرنی الی	(اگر دوسری بات منظور نہیں ہے) تو تم مجھے
یزید[2]	یزید کے پاس بھیجدو۔ (جانے دو نہیں بلکہ بھیجدو)

یزید کے پاس آپ کا اس درجہ لچک کے ساتھ جانا کہ اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دیں اس کا نتیجہ (وقت کے تمام دستیاب قرائن و شواہد کی بنا پر) سوائے اس کے کچھ نہیں ہوتا تھا کہ یزید آپ کا اکرام کرے اور ہر ممکن طریقے سے اس بات کی کوشش کرے کہ آپ کی اس کے ساتھ کشیدگی جاتی رہے۔ وہ کیا شکل ہوتی؟ یہ ہم نہیں کہہ سکتے۔ لیکن اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ حضرت معاویہؓ کی وصیت کے مطابق انہی کے نقشِ قدم پر "صلح حسنؓ" جیسا کوئی باب یزید اور حضرت حسینؓ کے درمیان بھی ضرور رقم ہوتا۔ مگر قیاس و گمان کے تمام تقاضوں کے

---

[1] بلکہ ان خاص حالات سے قطع نظر بھی اس لیے جو لوگ اس جانے کے کوئی اور معنی کرتے ہیں انھیں بس "شاہ کا شاہ سے بھی زیادہ وفادار" ہی کہا جا سکتا ہے۔ [2] البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۷۱

برعکس ابن زیاد کو آپ کی پیش کش قبول نہ ہوئی۔ اور المیۂ کربلا جو کاتبِ تقدیر کے ہاتھ سے رقم ہو چکا تھا وہ وجود میں آ کر رہا۔

نوشتۂ تقدیر کا راز ؟

اس تقدیر کا راز اور اس کی حکمت کیا ہو سکتی ہے جو ایک الم انگیز واقعہ کے لیے راہ بناتی آ رہی تھی ؟ سوال کافی سخت ہے۔ مگر امام ابن تیمیہؒ کے یہاں اس کا ایک جواب ملتا ہے جو ہے تو قیاس و گمان ہی کی بات مگر امام موصوف نے بڑے اعتماد کے ساتھ پیش کیا ہے۔ فرماتے ہیں :-

> "حسینؓ کا قتل بلاشبہ مظلومانہ قتل ہے جو اُن کے حق میں شہادت، علوِ منزلت اور رفعِ درجت ہے اور راز اس کا یہ ہے کہ اُن کے اور اُن کے بھائی کیلئے اللہ کے یہاں سعادت اور نیک بختی کا وہ بلند مرتبہ طے ہو چکا تھا جس کیلئے کسی نہ کسی طرح کی بلا و مصیبت سے گزرنا لازم ہے۔ مگر ان دونوں کو اپنے دوسرے اہلبیت کی طرح سے اس کے مواقع اس لیے حاصل نہ ہو سکے تھے کہ ان کی زندگی اسلام اور عزت و عافیت کی گود ہی میں بسر ہوئی تھی۔ پس ایک بھائی کی وفات زہر خورانی سے ہوئی اور دوسرے کی قتل سے، تاکہ اس مصیبت کے صلے میں وہ شہداء کا عیش اور سعداء کی منزلت پا سکیں[1]۔"

گویا حضرت حسینؓ کا کچھ نہ سمجھ میں آنے والا سفر ہو یا ابن زیاد کا اس سے بھی زیادہ ناقابلِ فہم رویہ، دونوں تقدیرِ الٰہی کے ایک منصوبے کا کرشمہ تھے جو پہلے سے طے ہو چکا تھا۔

حضرت حسینؓ کا اقدام اور ابن تیمیہؒ

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ابن تیمیہؒ حضرت حسینؓ کے لیے اس علوِ منزلت کے

---

[1] منہاج السنۃ ج ۲ ص ۲۴۱

قائل ہونے کے باوجود جو اُن کے مذکورہ بالا بیان میں نظر آتی ہے آپ کے اس اقدام کی صحت کے قائل نہیں ہیں جس کے نتیجے میں شہادت کا مرتبہ آپ نے پایا۔ فرماتے ہیں کہ :-

> "یہ بات جان لینی چاہیے کہ صحابۂ کرام کا طبقہ ہو یا تابعین عظام کا یا بعد کے زمانوں کے اہلِ بیت یا غیر اہلِ بیت کا، ان میں سے بڑے بڑے اہلِ علم و دین سے بعض وقت ایسی نوعیت کا اجتہاد سرزد ہو سکتا ہے جس میں کچھ ظن و وہم اور کبھی کوئی باریک قسم کی ہوائے نفس شامل ہو جاتی ہے، ایسا اجتہاد اس شخصیت کی عظمت کے باوجود قابلِ اتباع نہیں ہوتا، لیکن جب کبھی ایسی بات پیش آ جاتی ہے تو دو قسم کے انسانوں کے لیے فتنہ بن جاتی ہے، جو لوگ اُس انسان کی عظمت کے قائل ہوتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ اس کے اس خاص فعل کو بھی صحیح اور قابلِ اتباع قرار دیا جائے — جو اُسے ناپسند کرنے والے ہوتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ ایک اجتہادی غلطی کی بدولت اُسے ولایت و تقویٰ کے مرتبے ہی سے نہیں، اہلِ جنت اور اہلِ ایمان کے زمرے سے بھی خارج کر دیں[1]۔"

کیوں اس اقدام کی صحت کے قائل نہیں ہیں؟ منہاج السنۃ کی اسی بحث میں جس بحث سے اوپر کے دو اقتباس لیے گئے ہیں، ہمیں اس سوال کا یہ جواب ملتا ہے :-

> "حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت انسانوں کی معاش و معاد (دنیوی اور اخروی زندگی) کی صلاح و فلاح کے لیے ہوئی تھی، آپ نے ہر اس بات کا حکم دیا جس میں صلاح و بھلائی ہے اور ہر اس بات سے منع فرمایا جس میں فساد (بگاڑ) اور برائی ہے پس ایسا کوئی کام اگر سامنے آتا ہے جس میں صلاح اور فساد دونوں پہلو پائے جاتے ہیں تو اہلِ سنت یہ دیکھتے ہیں کہ فساد کا پہلو غالب ہے، یا صلاح کا؟ اور پھر جو پہلو غالب نظر آتا ہے اسی کے مطابق اس کام پر حکم لگاتے ہیں، صلاح اور فلاح کا پہلو

---

[1] منہاج السنۃ ج ۲ ص ۲۱۹

غالب ہے تو اس کام کے کرنے کو ترجیح دیتے ہیں فساد اور خرابی کا پہلو غالب نظر آتا ہے تو اس کام کے ترک کو ترجیح دی جاتی ہے۔

پس اب ایک یزید یا عبدالملک اور منصور جیسا کوئی شخص خلافت کے منصب پر قابض ہو جاتا ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس سے قتال کر کے کسی بہتر شخص کو اس کی جگہ لانے کی کوشش کی جائے؟ اہل سنت اس کا جواب نفی میں دیتے ہیں؛ کیونکہ ایسے فعل سے بہ نسبت بھلائی اور مصلحت کے بگاڑ اور فساد کے زیادہ امکانات ہیں۔ پوری تاریخ ہمیں بتا رہی ہے کہ کسی صاحب سلطنت و قوت شخص کے خلاف جب بھی خروج کیا گیا بالعموم اس کا خیر بہت معمولی اور شر بہت زبردست ہوا۔ مثلاً مدینے والوں نے یزید کے خلاف جو خروج کیا یا ابن الاشعث نے عبدالملک کے خلاف عراق میں کیا یا ابن المہلب نے اپنے باپ کے خلاف بغاوت کی یا ابو مسلم نے خراسان میں اپنی نواحی کے خلاف علم بغاوت بلند کیا، یا خلیفہ منصور کے خلاف مدینے اور بصرے سے بغاوت اٹھی۔ ان میں ہر جگہ ہزیمت اور بربادی کے سوا کچھ نہ ملا۔ اور ابو مسلم خراسانی جیتا بھی تو کیا جیت اس کی ہوئی؟ منصور کے ہاتھوں وہ خود مارا گیا اور جیت میں کس قدر آدمی اس نے مروا دیئے! اللہ کی پناہ! الغرض ایسے لوگ

فلا اقاموا دینا ولا ابقوا دنیا نہ دین ہی قائم کر سکے نہ دنیا ہی بچا سکے

حالانکہ اللہ تعالیٰ کسی ایسے کام کا حکم نہیں دیتا کہ جس میں نہ دین کی فلاح ہو نہ دنیا کی صلاح اور ایسے کام اللہ کو پسند نہیں ہیں، چاہے ان کے کرنے والے کیسے ہی متقی بندے اور اصحاب جنت کیوں نہ ہوں؟ ذرا بتائیے کیا یہ لوگ جن کے نام ابھی اوپر لیے گئے، علی، طلحہ، زبیر اور عائشہؓ سے بڑھ کر ہیں جن کا تقویٰ مسلم ہونے اور جنت کی بشارت جنہیں حاصل ہونے کے باوجود ان کے قتال یعنی ان کے فعل کو قابل تعریف نہیں قرار دیا گیا؟

مسلمانوں کے اکابر اہل علم نے ہمیشہ ہی ان خروجوں کی مخالفت کی ہے، مثلاً یزید کے خلاف اہل مدینہ خروج پر آمادہ ہوئے تو عبداللہ بن عمرؓ، سعید بن مسیب اور علی بن الحسین (زین العابدین) نے انکو ایسا کرنے سے منع کیا، یا ابن الاشعث کی بغاوت کا فتنہ اٹھا تو حسن بصری مجاہد وغیرہ نے سمجھایا، لہٰذا اہل سنت کے یہاں یہ مسئلہ بالکل طے شدہ ہے کہ فتنے کے وقت میں تلوار اٹھانا مناسب نہیں۔ علمائے اہل سنت نے اس مسئلہ کی اس درجہ اہمیت سمجھی ہے کہ اسے عقائد کی فہرست میں داخل کر کے لازم کیا ہے کہ ائمہ اور خلفاء کے جور و ستم کا مقابلہ تلوار کے بجائے صبر اور برداشت سے کیا جائے۔ حالانکہ وہ یہ جانتے ہیں کہ کیسے کیسے لوگ کتنے اہل علم اور اہل دین بھی فتنوں کی لڑائیوں میں شریک ہو چکے ہیں۔ انکا یہ فیصلہ اسلیے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح حدیثوں سے اس معاملے میں یہی حکم ثابت ہوتا ہے اور جو کوئی بھی اس سلسلے کی احادیث نبویہ پر غور کرے گا وہ خود بھی اس نتیجے پر پہنچے گا کہ احادیث کا حکم بہترین حکم ہے۔

یہی وجہ تھی کہ جب حسینؓ نے عراق جانے کا ارادہ فرمایا تو اکابر اہل علم و دین مثلاً ابن عمرؓ، ابن عباسؓ، ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشام نے اس ارادے کے خلاف مشورہ دیا۔ انھیں صاف نظر آ رہا تھا کہ اس کا انجام آپ کی جان کو گزند پہنچنے کے سوا مشکل ہی سے کچھ اور ہوگا، چنانچہ جب آپ اپنا ارادہ بدلنے کو تیار نہ ہوئے تو بعض نے کہہ بھی دیا کہ "اچھا جائیے آپ کو اللہ کے سپرد کیا"[1]، اور بعض نے کہا کہ "بات بدنما ہو جائے گی ورنہ جی چاہتا تھا کہ آپ کو زبردستی سے روک لیں۔"

ان حضرات کا یہ کہنا سوائے اس کے اور کسی وجہ سے نہیں تھا کہ حسین رضی اللہ عنہ کی اپنی اور عامۃ المسلمین کی مصلحت اسی میں تھی، اور اللہ و رسول کے یہاں مصالح کی رعایت اور مفاسد سے بچنے ہی کا حکم ہے۔ چنانچہ بالکل وہی ہوا جس کا ان حضرات

---

[1] استودعک اللہ من قتیل۔

کو اندیشہ تھا کہ دین یا دنیا کی کوئی بھلائی تو اس خروج سے کسی کو حاصل نہ ہوئی۔ البتہ کوفے کے بدنہاد ظالموں کو سبطِ رسول اللہ پر قابو مل گیا اور ان کو شہید کر ڈالا۔ کاش وہ اپنے شہر ہی میں رہتے تو وہ فساد نہ لازم آتا جو ان کے خروج اور قتل سے رونما ہوا۔

فان ما قصدہ من تحصیل الخیر ودفع الشر لم یحصل منہ شئ بل زاد الشر بخروجہ وقتلہ ونقص الخیر بذلک وصار سبباً لشر عظیم وکان قتل الحسین مما اوجب الفتن کما کان قتل عثمانؓ مما اوجب الفتن۔	انھوں نے اپنے خروج سے جس تحصیل خیر اور دفع شر کا ارادہ کیا تھا تو وہ کچھ حاصل نہ ہوا۔ اس کے بجائے اس خروج اور پھر قتل سے شر بڑھا اور خیر کم ہوا۔ اور یہ قصہ ایک شرِ عظیم کا سبب گیا یعنی قتل حسینؓ اسی طرح فتنوں کا موجب بن گیا جیسے قتل عثمانؓ سے فتنے اٹھے تھے۔

"یہی وہ وجہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حسنؓ کے لیے بطور تعریف فرمایا تھا کہ "میرا یہ بیٹا سردار ہے، زمانہ آئے گا کہ اس کے ذریعہ اللہ مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں میں صلح کرائے گا" لیکن کسی کی بھی تعریف آپؐ نے اس کے لیے نہیں فرمائی کہ وہ حالت فتنہ میں تلوار اٹھائے گا۔ یا کسی امام جائر پر خروج اور اس کی سمع ہی ماننے سے انکار کر دے گا ہاں خوارج کے سلسلے میں ضرور آپؐ نے صاف ارشاد فرمایا تھا کہ ایسی جماعت مسلمانوں میں رونما ہو تو اس سے ضرور قتال کیا جائے۔ چنانچہ ان سے جب علی رضی اللہ نے قتال فرمایا تو وہی صحابہؓ جو جمل اور صفین کے قتال میں آپؓ کے ہمنوا نہیں رہے تھے اس قتال میں سب کے سب متفق ہوئے اور اسی طرح بعد کے اہلِ علم نے بھی ان دونوں قتالوں میں فرق کیا۔"[1]

---

[1] منہاج السنۃ ص ۲۱۲ تا ص ۲۱۳ ج ۲ سے تلخیص و انتخاب۔

ظلم کی ذمّہ داری کس پر؟

امام ابن تیمیہؒ کی یہ بحث کہ حضرت حسینؓ کا یہ اقدام جس کے نتیجے میں آپ کی مظلومانہ شہادت پیش آئی، شرعی نقطۂ نظر سے کیا حیثیت رکھتا تھا؟ اور کیوں رکھتا تھا؟ یہاں ایک ضمناً ذکر میں آجانے والی بحث تھی، ورنہ ہمارے موضوع کو اس شرعی بحث سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ مظلومانہ شہادت کی بات آگئی اور اُسے مان لیے جانے کے بعد جو مسئلہ طبعی طور پر ہمارے سامنے آنا چاہیے، وہ یہ ہے کہ اس ظلم کی ذمّہ داری کس پر آتی ہے؟ یزید پر یا ابن زیاد پر؟

تاریخی شہادتوں کا جو ذخیرہ ہمارے سامنے ہے وہ کسی بھی طرح اس کی اجازت نہیں دیتا کہ اس خونِ ناحق کی ذمّہ داری یزید پر ڈالی جائے۔ یزید نے بےشک ابن زیاد کے سپرد یہ بھی کیا تھا کہ وہ حضرت حسینؓ سے نپٹے اور کوفے میں ان کو آزادانہ داخل نہ ہونے دے۔ اس کے بعد اگر یہ بات پیش نہ آگئی ہوتی کہ حضرت حسینؓ نے اس مہم سے قطعی دستبرداری ظاہر کر کے جس کے لئے وہ مکے سے نکلے تھے، یزید کے پاس جانے اور اپنا فیصلہ اس کے ہاتھ میں رکھ دینے کی پیش کش کر دی، تب بےشک ابن زیاد کے حکم سے کی جانے والی جنگی کارروائی کی اصل ذمّہ داری یزید ہی پر آتی، مگر اس کامل طور پر تبدیل شدہ صورت میں ابن زیاد نے یزید سے رجوع کیے بغیر اور کارروائی کے افسرِ اعلیٰ عمر بن سعد کے مشورے کے بھی برخلاف جو قتل و قتال کی کارروائی کرائی اس کی ذمّہ داری یزید پر ڈالنا ایک زیادتی ہی کی بات ہوگی۔ ہاں اگر وہ اس کارروائی سے اپنی رضامندی اور خوشنودی کا اظہار کرتا تو پھر ضرور حق تھا کہ اسی کو اصل ذمّہ دار قرار دیا جائے، مگر اس بارے میں ہم گزشتہ باب میں مختلف روایتوں کا جائزہ لے کر دیکھ چکے ہیں کہ ذمّہ داری کے ساتھ ایسی بات یزید کی طرف منسوب کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے بلکہ متعدد قرائن و شواہد کی روشنی میں پلڑا اُن روایتوں کا بھاری نظر آتا ہے جو اس واقعہ پر یزید کی ناراضامندی اور ناخوشی ظاہر کرتی ہیں، اور اسی بنا پر اس باب (ص۱۲) کے پچھلے صفحات میں ابھی ہم لکھ کر آئے ہیں کہ:-

"یزید کے پاس آپ کا اس درجہ لچک کے ساتھ جانا کہ اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیدیں، اس کا نتیجہ وقت کے تمام دستیاب شواہد و قرائن کی روشنی میں سوائے اس کے کچھ نہیں ہونا تھا کہ یزید آپ کا اکرام کرتا........ اور حضرت معاویہؓ کی وصیت کے مطابق انہی کے نقش قدم پر صلح حسنؓ جیسا کوئی باب یزید اور حضرت حسینؓ کے درمیان بھی ضرور رقم ہوتا۔"

پس ہمارے خیال کے مطابق اس کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا تھا کہ اگر حضرت حسینؓ کی پیشکش کے بارے میں یزید سے رجوع کیا جاتا تو وہ ابن زیاد کو اس بیٹتے اور اس کاروائی کی اجازت دیتا جس کے نتیجے میں سانحۂ کربلا پیش آیا۔

ابن زیاد کو سزا کیوں نہیں دی؟

یہ سوال جب کسی عام آدمی کی طرف سے سامنے آئے تو کوئی حیرت کی بات نہیں ہوتی۔ مگر جب پڑھے لکھے لوگ بھی یہ سوال اٹھاتے ہیں تو پھر حیرت ہوئے بغیر نہیں رہتی، اس لیے کہ نارضامندی اور سزادہی کا کوئی ایسا لازمی تعلق نہیں ہے کہ ایک حاکم نے اپنے ماتحت کی کسی بات کو ناپسند کیا ہو تو وہ اُسے سزا بھی ضرور دے دے، بہت سی دفعہ ناخوشی کا اظہار بھی اُس آدمی پر کرنا مناسب نہیں سمجھا جاتا ہے۔ اور اس کی کسی قابل لحاظ مثال ہمارے سامنے موجود ہے کہ حضرت علیؓ کی فوج میں بلکہ اُن کے نہایت خاص معتمدین میں بھی وہ لوگ شامل تھے جو قاتلانِ عثمانؓ کے سرگروہ شمار کیے جاتے تھے، اور خود حضرت علیؓ کو اس الزام سے انکار نہ تھا۔ مگر اس مطالبے کے جواب میں کہ اُن کو سزا دی جائے یا ورثاء عثمانؓ کے سپرد کیا جائے حضرت علیؓ کو ہمیشہ یہی کہنا پڑا کہ حالات اجازت نہیں دیتے۔ یعنی سزا کا مطالبہ کرنے والے بھی موجود تھے، اصولاً حضرت علیؓ کو مطالبے سے اتفاق بھی تھا پھر

بھی مصالحِ وقت کا مسئلہ ایسا تھا کہ آپ اس پر عمل درآمد نہیں کر سکتے تھے۔ تو اب اگر ہم یزید کے لیے کوئی جداگانہ اصول نہیں بناتے ہیں تب آسانی سے محسوس کر سکتے ہیں کہ:-

> جس ابن زیاد نے یزید کے ہاتھ سے نکلتے ہوئے عراق کو نہ صرف روک لیا تھا بلکہ جو طوفان وہاں یزید کے خلاف تیار ہو رہا تھا، اس کا رُخ اس نے تمام تر حضرت حسینؓ کے خلاف موڑ کے دکھا دیا، یزید کیلئے کیسے ممکن تھا کہ اس کا سر قلم کرنے کی بات سوچے؟
>
> اور وہ بھی ایسی حالت میں! کہ کوئی مطالبہ کسی طرف سے ایسا نہیں ہے؟
>
> اور
>
> مزید برآں! ایسی حالت میں کہ اس کے ذہن پر اس قسم کا کوئی تقاضہ بھی ظاہر نہیں ہو سکتا تھا؟

اُسے واقعہ سے رنج ہوا ہو، افسوس ہوا ہو، ایک الگ بات ہے، لیکن یزید اور حضرت حسینؓ کے تعلقات کی جو تاریخ تھی (جو یزید کے والد کے زمانے سے چلی آ رہی تھی اور جس کو ہم پچھلے ابواب میں دیکھ آئے ہیں) اس کے ہوتے ہوئے ایک خاندانی آدمی ہونے کے ناتے یہ توقع تو یزید سے کی جا سکتی تھی اور کی جانی چاہیے تھی کہ اُسے واقعہ پر رنج و ملال ہو مگر اس سے آگے بڑھ کر یہ توقع تعلقات کے اس پس منظر میں کرنا کہ وہ ابن زیاد کی اس کاروائی کو ایک قابلِ سزا جرم سمجھے یہ تو ایک بہت ہی غیر فطری قسم کی توقع ہے۔ حضرت حسینؓ کی اُس تمام عظمت کے باوجود جس کی بنا پر ہمیں یہ خیال ہوتا ہے کہ یزید اگر کربلا کے اس واقعے سے خوش نہیں ہوا تھا تو ابن زیاد کو اس کی طرف سے کوئی سزا یا ملامت ہونی چاہیے تھی، ہم اس فطری حقیقت کو تسلیم کرنے سے انکار

نہیں کر سکتے کہ جب سیاسی کشمکش کا بیچ آجاتا ہے تو پھر فریقین کے ذہن سے ایک دوسرے کی قابلِ لحاظ عظمتوں کا نقش مٹتا چلا جاتا ہے۔

حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کی مثال ہمارے سامنے موجود ہے۔ کشمکش شروع ہوئی تو حضرت معاویہ کو پورا احساس تھا کہ اُن کی اور حضرت علیؓ کی کوئی برابری ہی نہیں ہے، حضرت علیؓ نے اپنے خطوط میں انھیں اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی تو انہوں نے بے تامل اعتراف کیا کہ آپ بجا فرماتے ہیں۔

بما شہرتک فی الاسلام و	اسلام میں آپ کی بزرگی اور جناب
قرابتك من رسول الله	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے
صلى الله عليه وسلم فلست	آپ کی قرابت کا جہاں تک تعلق ہے
[دفعه	اُس سے مجھے ذرا انکار نہیں ...

مگر جب اس کشمکش پر لمبا عرصہ گزر گیا اور تلخی بڑھتی چلی گئی تو پھر حضرت معاویہؓ کے رویے میں اس اعتراف اور احساس کی جھلک میں نظر آنی بند ہونے لگی، اور یہ بالکل فطری بات ہے جب ہم اپنی خواہش کے ماتحت کسی جگہ پر ایک اصولِ فطرت کو ماننے سے انکار کریں تو یہ ہماری مرضی ہے۔ اصول اپنی جگہ اصول رہے گا۔ بہرحال ابن زیاد کو کوئی سزا نہ دینا یا ملامت نہ کرنا، اس سے ہرگز یہ لازم نہیں آتا کہ یزید کو کوئی افسوس اور رنج بھی حضرت حسینؓ کی شہادت پر نہیں ہوا یا وہ خوش ہوا ہو اور اس کی اپنی مرضی بھی فی الواقع وہی رہی ہو جو ابن زیاد کے ہاتھوں ہو گیا۔

ابن زیاد کیوں بضد ہوا ؟

باب کے ابتدائی صفحات میں جو ہم نے لکھا کہ 'بظاہر تو ابن زیاد کو نہایت خوشی سے اس بات پر راضی ہونا چاہیے تھا کہ حضرت حسینؓ اگر یزید کے پاس جانا چاہتے ہیں تو

ضرور چلے جائیں۔ لیکن واقعہ اس کے برعکس ہوا تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے بجز تقدیرِ الٰہی کے اور کیا کہا جائے، جس میں گویا حضرت حسینؓ کا مرتبۂ شہادت پانا مقدر ہو چکا تھا۔ ہمارے اس لکھنے کا مقصد یہ نہیں تھا کہ ابن زیاد کے ذہن میں بھی اپنے اس رویّے کی کوئی وجہ نہ رہی ہو گی اور بس یونہی تقدیری جبر سے وہ یہ کام کر بیٹھا ہو گا۔ بے شک اس کے ذہن میں کوئی بات اور اپنے اس رویّے کا جواز ہونا چاہیے۔ گو ہمیں اس کی تلاش ہے۔ اس تلاش میں کامیابی کی منزل تو اب تک ہاتھ نہیں آسکی ہے۔ لیکن اس تلاش اور غور و فکر کے دوران میں بعض باتوں کی طرف نظر جاتی ہے، جن کا یقیناً بہت کچھ دخل ابن زیاد کے اس رویّے میں ہونا چاہیے۔

۱۔ اس نے اپنے باپ سے وراثت میں ایک سخت گیر منتظم (ADMINISTRATOR) کا مزاج پایا تھا۔ نظم و نسق اور امن و امان کا قیام اور اُس کا تحفظ باپ کی طرح ابن زیاد کی نظر میں بھی ایک حاکم کا سب سے بڑا فریضہ اور سب سے بڑی نیکی تھی۔ اس کے باپ زیاد کو جب حضرت معاویہؓ نے بصرے کا حاکم مقرر کیا تو بصرے کے امن و امان کا حال اُس وقت بے حد خراب تھا۔ اس نے وہاں پہنچ کر ایک زبردست تقریر میں اپنی پالیسی کا بیان کیا۔ اس بیان کے ماتحت رات کو عشاء کے بعد سے صبح فجر تک باہر نکلنا ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ اور اس کی خلاف ورزی کی سزا قتل۔ ایک اعرابی (یعنی بصرہ شہر سے باہر کا آدمی) جو اس قصے سے بے خبر تھا، کسی کام سے بصرے آیا تھا۔ رات میں چلتا پھرتا پایا گیا۔ گرفتار ہوا اور زیاد کے پاس لایا گیا، اس نے اپنی صفائی دی۔ زیاد نے کہا میں سمجھتا ہوں کہ تیرا بیان سچا ہے تو بے خبر تھا۔ مگر نظم و نسق کا تقاضہ یہ ہے کہ میں تجھے بھی نہ چھوڑوں۔ چنانچہ قتل کر دیا گیا[1]۔ اس مزاج اور طبیعت کا

---

[1] طبری ج ۲ ص ۱۲۶ اس واقعہ کو بیان کر کے طبری لکھتے ہیں۔

* زیاد پہلا حاکم تھا جس نے حکومت کی آواز کو وزن دیا۔ معاویہؓ کے (باقی اگلے صفحہ پر)

ابن زیاد وارث تھا۔

۲۔ کوفے اور بصرے کے لوگ ہمیشہ اس قدر ناہنجار رہے تھے کہ ہر حکومت اور ہر حکمران اُن سے عاجز رہا۔ استحکام اور امن وامان کو اہمیت بلکہ ہر چیز پر فوقیت دینے والا آدمی ظاہر ہے کہ ایسے ماحول میں اور بھی زیادہ سخت گیر بلکہ سخت گیری کا ایک "عادی مجرم" بن جائے گا۔ کوئی سخت گیری اس کے لیے سخت گیری نہ رہ پائے گی۔ مسلم بن عقیل اور ان کے میزبان ہانی بن عروہ کے ساتھ جو سلوک اس نے کیا وہ یقیناً اسی قبیل کی چیز تھی۔ امن وامان اور قومی یکجہتی سے بڑھ کر کوئی چیز اس کے یہاں مقدس نہیں تھی۔ اس کو خطرے میں ڈالنے والے افعال اور اشخاص سے بڑھ کر کوئی فعل اور کوئی شخص اس کی نظر میں مبغوض نہ تھا۔

۳۔ حضرت حسینؓ اور یزید کے تعلقات کی ناخوشگوار تاریخ کے باوجود یزید کی طرف سے جس پاس ولحاظ کی توقع ہم مختلف وجوہ سے کرتے آرہے ہیں۔ (مثلاً یہ کہ وہ ایک صحابی کا اور ایک بڑے خاندانی صحابی کا بیٹا تھا۔ نیز حضرت حسینؓ سے اُس کی خاندانی قرابت بھی تھی۔ اور پھر اس کے والد کی بڑی تاکیدی وصیت بھی حضرت حسینؓ کے ساتھ آخری حد تک حسنِ سلوک اور حق شناسی کی تھی۔)

(حاشیہ بقیہ صفحہ گزشتہ) ۱ اقتدار کو مضبوطی بخشی، لوگوں کو اطاعت سکھائی۔ بے دھڑک سزائیں دیں اور تلوار نیام سے باہر نکالی۔ گمان پر پکڑا اور شبہے میں سزا دی۔ چنانچہ اس کی حکومت میں لوگ اس درجہ اس سے خائف ہوئے کہ ایک دوسرے کی شرارتوں سے محفوظ ہو گئے۔ کسی کی کوئی چیز گر جاتی تو مجال نہیں تھی کہ کوئی دوسرا اس کو ہاتھ لگا لے۔ حتیٰ کہ اصل مالک آتا اور اپنی چیز اٹھا لیتا۔ عورتیں اپنے گھروں میں بے کھٹکے دروازہ کھول کر سو سکتی تھیں۔ الغرض وہ سیاست اس نے کی کہ اس کی مثال نہیں دیکھی گئی ..... ۔ یہ طبری کا تبصرہ ہے اس کو نقل کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ اس سیاست کو پسند کیا جا رہا ہے۔

ان میں سے کوئی چیز ابن زیاد کے ساتھ نہیں پائی جاتی تھی۔ وہ ایک ساقط النسب آدمی کا بیٹا تھا۔ حضرت معاویہؓ نے اس (نسبی) سلسلے میں اُس پر اور اُس کے باپ پر جو احسان کیا تھا اُس کا یہ اثر عین قرین قیاس ہے کہ آدمی کو بادشاہ سے زیادہ بادشاہ کا وفادار بنا دے۔ اور اس لیے قرین قیاس ہے کہ حضرت معاویہؓ اور یزید کے تحت ان باپ بیٹوں کی انتظامی سختی میں ان کے اپنے سخت گیر انتظامی مزاج کے علاوہ کچھ اس احسان مندی کا بھی دخل ہو، اور خاص طور سے وہ اشخاص ان کے لیے کسی بھی پاس و لحاظ کے مستحق نہ رہ جاتے ہوں جو اس خاندان کے اقتدار کو چیلنج کرتے ہوں۔

ان باتوں سے یہ عقدہ تو حل نہیں ہوتا کہ جب حضرت حسینؓ کی سہ گانہ پیش کش گویا پکار کر کہہ رہی تھی کہ اب ان سے کوئی خطرہ محسوس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تو پھر کون سی انتظامی مصلحت کا یا بادشاہ کی بادشاہ سے بھی زیادہ کون سی وفاداری کا تقاضا تھا کہ اس پیش کش کو قبول کرنے کی نرمی دکھانے کے بجائے وہی سختی دکھائی جائے جو عام عادت بن گئی تھی۔ مگر ان باتوں کی طرف توجہ سے عقدے کی سختی کچھ کم بہرحال ہو جاتی ہے۔

آہ یہ بے توفیقی!

بہرحال یہ بڑا ہی المناک حادثہ ہے کہ جب اللہ تبارک و تعالیٰ نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے لیے وہ جرأت آسان فرما دی جو بہت ہی شاذ و نادر اہلِ جرأت کو بھی نصیب ہوتی ہے، کہ حالات کو یکسر بدلا ہوا دیکھ کر اُن کی مطابقت میں وہ فیصلہ فرمائیں جس میں ملت کی صلاح و فلاح ہے نہ یہ کہ اُن بدلے ہوئے حالات میں اپنی آن کا مسئلہ مقدم رکھیں، تب ابن زیاد کو یہ توفیق نہ ہو سکی کہ وہ

ملت کی صلاح و فلاح کے لیے حضرت حسینؓ کی اس عظیم جذباتی قربانی کی قدر جان لیتا اور اپنی بے جا ضد سے اس واقعہ کا ذمہ دار نہ بنتا جس نے عالم اسلام پر ایک بار پھر خونی فتنوں ہی کے دروازے نہیں کھول دیئے بلکہ اعتقادی فتنوں کی رگوں میں بھی ایک نیا خون دوڑا دیا۔

اللّٰھم احفظنا من شرور انفسنا ومن
سیئات اعمالنا
وصلّ اللّٰھم وسلم علی عبدك ونبیك
سیدنا محمد وعلی آلہ واصحابہ
وازواجہ اجمعین

اختتامیہ

(کتاب کا خلاصہ اور کچھ توضیحات)

کتاب الحمد للہ تکمیل کو پہنچ گئی۔ اس کے اہم نکات و مباحث کو اگر ہم تھوڑے سے لفظوں میں سمیٹ کر بیان کرنا چاہیں تو یوں بیان کر سکتے ہیں کہ:

۱۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد حضرت علی مرتضیٰؓ کی خلافت کے آغاز ہی سے مسلمانوں میں خانہ جنگی کی جو المناک صورت برپا ہوئی تھی، آنحضرت ﷺ کی پیشین گوئی کے مطابق اس کا خاتمہ حضرت علیؓ کے جانشیں سیدنا حسن بن علیؓ کے ہاتھوں سے ہوا۔ اور وہ اس طرح کہ آپ نے خلافت کا اور اقتدار حضرت معاویہؓ کے لیے چھوڑ کر خود کو اس نزاع سے دستبردار کر لیا۔ یہ ۴۱ھ کی بات ہے جسے اسلامی تاریخ میں "عام الجماعۃ" (اجتماعیت واپس آنے کا سال) کہا گیا ہے۔

۲۔ حضرت حسنؓ کے چھوٹے بھائی حضرت حسینؓ اپنے بڑے بھائی کے اس فیصلہ سے متفق نہ تھے مگر جب حضرت حسنؓ کی طرف سے فیصلے پر عملدرآمد ہو گیا تب سے وہ بھی اس کے احترام کو لازم جانتے رہے اور رفتہ رفتہ حضرت معاویہؓ کے ساتھ تعلقات میں خوشگواری کی کیفیت بھی پیدا ہو گئی۔

۳۔ مصالحت اور خوشگواری کی یہ فضا چودہ سال تک چلتی رہی۔ جبکہ اس دوران میں حضرت حسنؓ نویں سال میں انتقال فرما گئے تھے۔ مگر سولہویں سال (۵۶ھ) میں حضرت امیر معاویہؓ نے جب اپنے بڑھاپے کے احساس سے اپنے بعد کے لئے کسی کو جانشین اور ولی عہد نامزد کرنے کے لئے سوچا اور پھر اپنے بیٹے یزید کو اس کے لئے موزوں قرار دیا تو نئے سرے سے ایک اختلاف کی صورت پیدا ہونا شروع ہوئی۔ اختلاف کرنے والوں میں صرف حضرت حسینؓ ہی نہیں تھے بلکہ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے بیٹے عبدالرحمٰن بن ابی بکر، حضرت عمر فاروقؓ کے بیٹے عبداللہ بن عمرؓ، حضرت زبیر بن عوام کے بیٹے عبداللہ بن زبیرؓ بھی اس میں شامل تھے۔

۴- اس اختلاف کی سب سے اہم اصولی بنیاد یہ تھی کہ باپ اپنے بعد کے لئے بیٹے کو بطور ولی عہد خلافت نامزد کرے یہ اسلامی خلافت کا نہیں قیصر و کسریٰ کی سلطنت کا دستور ہے۔ دوسری ایک بنیاد بظاہر یہ بھی تھی کہ اصحاب نبی ﷺ کی موجودگی میں انہی میں سے کوئی منصب خلافت کے لئے موزوں ہو سکتا ہے نہ کہ بعد میں پیدا ہونے والا ایک نو عمر۔ ان دو کے علاوہ ایک تیسری یہ بات جو اس سلسلے میں بہت مشہور ہے کہ اس اختلاف کی ایک اہم بنیاد یہ بھی تھی کہ یزید بڑا فاسق و فاجر ہے۔ یہ بات کہیں اس اختلاف کی روداد میں آخر آخر تک نہیں پائی جاتی۔ محض "زیب داستان" کے طور پر بڑھائی گئی بات ہے۔ حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ حضرت امیر معاویہ کا نقطۂ نظر ان حضرات کے بالمقابل بظاہر یہ تھا کہ خلافت کے سلسلے میں سب سے زیادہ قابل لحاظ چیز مضبوط انتظامی اہلیت اور گرفت ہے۔ اور اس معیار کو پیش نظر رکھتے ہوئے وہ یزید ہی کی خلافت کی شکل میں امید کرتے تھے کہ ادارۂ خلافت مضبوط رہے گا اور وہ افراتفری نہیں پھیلے گی جو حضرت عثمانؓ کے بعد پیدا ہو گئی تھی۔ مورخین نے اگرچہ یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ حضرت معاویہؓ کے اس فیصلے میں محبت پدری کا بھی دخل تھا مگر خود انہوں نے اس طرح کے کسی محرک سے اپنی برأت کا اظہار کیا ہے۔

۵- یہی اختلاف تھا جس سے واقعہ کربلا کی داغ بیل پڑی اور یہ خاص کر اہل کوفہ تھے جنہوں نے اس اختلاف کا سلسلہ کربلا کے میدان سے ملا دینے میں پورا کردار ادا کیا۔ کوفہ چونکہ حضرت علیؓ کا دار الخلافہ رہ چکا تھا اس لئے قدرتی طور پر حضرت حسینؓ سے قریبی تعلق رکھنے والے لوگ وہاں پائے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ یہاں کے لوگوں کی ایک مستقل خصوصیت شوریدہ سری اور تلون مزاجی اور حکمرانوں سے چپقلش بھی تھی۔ اس کی بنا پر ان مذکورہ بالا پندرہ سالوں میں بھی لازماً یہاں ایک بڑا حلقہ ایسے لوگوں کا ہو جانا چاہئے تھا جو حضرت امیر معاویہ کے خلاف کوئی بڑا محاذ قائم ہو جانے کا خواہشمند ہو۔ مزید برآں عبداللہ بن سبا (یہودی منافق) کی ریشہ دوانیوں نے حضرت عثمانؓ کی خلافت کے دور ہی سے وہاں ایک ایسا ٹولہ پیدا کر دیا تھا جسے مرکز خلافت سے محاذ آرائی ہی میں "اسلام کی خدمت" نظر آتی تھی۔ ان متعدد عوامل کے تحت کچھ لوگوں نے اولاً تو حضرت حسنؓ کی وفات کے فوراً بعد ہی چاہا تھا کہ حضرت حسینؓ کو از سر نو امیر معاویہ کے خلاف متحرک کر دیں جس میں وہ ناکام رہے۔ اس کے بعد ولی عہدی کے مسئلہ میں اختلاف پر ان لوگوں کی توقعات پھر زندہ ہو گئیں اور

حضرت حسینؓ سے رابطہ پیدا کر کے چاہا کہ اس مسئلہ پر آپ کو حضرت معاویہؓ کے خلاف میدان میں اتار دیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اسلامی جمعیت کی حفاظت فرمائی اور ان کا یہ حربہ بھی کارگر نہیں ہو سکا۔ البتہ اس ضمن میں یہ بات ضرور سامنے آگئی کہ اس ولی عہدی کے مسئلہ نے حضرت حسینؓ کی سوچ کو بھی بہر حال اس رخ پر لگا دیا ہے اور حضرت معاویہ کے بعد ٹکراؤ کی صورت پیش آجانے کے کافی امکانات ہیں۔

۶- ولی عہدی کے مسئلہ پر جو ایک روایت صحابیٔ رسول حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کو ملزم ٹھہراتی ہوئی ملتی ہے، کہ یزید کی ولیعہدی کی تجویز دراصل ان کے دماغ سے نکلی تھی اور صرف اپنا عہدہ (کوفہ کی گورنری) بچانے کے لئے انہوں نے، یہ جانتے بوجھتے کہ اس کا انجام اسلامی جمعیت کے لئے تباہ کن ہو سکتا ہے، یہ تجویز دی تھی۔ اس روایت کی جانچ کی جاتی ہے تو یہ ایک انتہائی مہمل افسانے سے زیادہ کچھ نہیں نکلتی۔ جبکہ حضرت مغیرہ خود قرآن پاک کی رو سے ایسے درجے کے فضائل والے صحابی ہیں کہ کوئی مضبوط روایت بھی ہو تو ان آیتوں کے مقابلے میں اس روایت کو دیوار سے مار دینے کے علاوہ کوئی چارہ نہ ہوگا۔

۷- حضرت معاویہؓ نے یزید کی ولیعہدی کے بارے میں مملکت کے ایک بڑے حصے کا رسمی Formal اعتماد حاصل کر کے اپنے فیصلے کو قطعیت کا درجہ دے دیا مگر اس اعتماد کے دائرے میں مکے اور مدینے کی کمی رہی۔ تب آپ نے وہاں کا ایک سفر کیا تاکہ اس کمی کو (خاص کر مدینہ منورہ کے اعتماد کی کمی کو) دور کیا جا سکے۔ جس کی نمائندگی عبدالرحمن بن ابی بکرؓ، عبداللہ بن عمرؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ اور حسین بن علیؓ کی طرف سے مخالفت کی شکل میں ہو رہی تھی۔

اس سفر کا اور وہاں ان چاروں حضرات سے ملاقات وغیرہ کا جو قصہ تاریخی روایتوں میں مذکور ہے، اسکا بڑا حصہ نہایت مضحکہ خیز اور چاروں بزرگوں کے نام کو قطعی بٹہ لگانے والا ہے۔ البتہ اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح ہوگا کہ ایک طرف تو یہ چاروں حضرات ـــــ بشرطیکہ حضرت عبدالرحمن بن ابی بکرؓ بھی اس وقت زندہ رہے ہوں ورنہ باقی تینوں حضرات ـــــ اپنے موقف پر قائم رہے۔ اور دوسری طرف حضرت معاویہؓ بھی اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ یہ اختلاف ختم نہیں ہو سکے گا اور یزید کو اقتدار میں آنے پر اس مخالفت کا سامنا کرنا ہی ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی موت کا وقت آنے پر ان حضرات کے سلسلے میں یزید کو مناسب وصیتیں بھی فرمائیں جن میں حضرت حسینؓ کے لئے بہ حسن طور سے

حسن معاملہ کی تاکید تھی۔

۸- ولی عہد کی نامزدگی کے چار سال بعد (۶۰ھ میں) حضرت معاویہؓ نے انتقال فرمایا اور یزید نے زمام خلافت ہاتھ میں لے کر حاکم مدینہ کو حکم بھیجا کہ عمائدین مدینہ خاص کر حضرت عبداللہ بن عمرؓ عبداللہ بن زبیرؓ اور حسین بن علیؓ جنہوں نے ولی عہد کی بیعت نہیں کی تھی، ان سے اب خلافت کی بیعت لی جائے (چوتھے حضرت عبدالرحمن بن ابی بکرؓ کا اس وقت انتقال ہو چکا تھا) حاکم مدینہ نے اہل الرائے کے مشورے سے طے کیا کہ عبداللہ بن عمرؓ کے بارے میں تو کسی جلدی کی ضرورت نہیں ہے بے ضرر ہستی ہیں۔ البتہ باقی دونوں حضرات کے بارے میں عجلت اور چوکسی کی ضرورت ہے۔ مگر یہ دونوں حضرات کچھ حاکم کی نرمی اور کچھ اپنی حکمت عملی کی وجہ سے اس بیعت سے بچنے اور مدینے سے نکل کر مکے پہنچ جانے میں کامیاب ہو گئے۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کا تو پیچھا بھی کرنے کی کوشش حکومت کی طرف سے کی گئی جو کامیاب نہ ہو سکی۔ مگر حضرت حسینؓ کے بارے میں کسی تعاقب کی روایت نہیں پائی جاتی۔

۹- شعبان ۶۰ھ کے پہلے ہفتہ میں مکہ معظمہ پہنچ جانے کے بعد ۸ ذی الحجہ تک حضرت حسینؓ کا قیام وہیں رہا اور اس درمیان میں رمضان المبارک سے اہل کوفہ کے وفود اور خطوط آپ کے پاس آنا شروع ہو گئے، جن میں کوفہ آکر ان لوگوں کی سربراہی سنبھالنے کی درخواست تھی اور یقین دلایا گیا تھا کہ سارا کوفہ آپ کے ساتھ ہے، جیسے ہی آپ آئیں گے یہاں کے یزیدی حاکم کو نکال کر باہر کر دیا جائے گا۔ آپ نے پوری طرح اطمینان حاصل کرنے کے لئے اپنے چچازاد بھائی مسلم بن عقیل کو کوفہ بھیجا اور ان کی طرف سے اطمینان کا خط آنے پر حج سے ایک دن پہلے ۸ ذی الحجہ کو آپ کوفہ کے لئے روانہ ہو گئے لیکن ٹھیک اسی ۸ ذی الحجہ کو، جبکہ حضرت حسینؓ کوفہ والوں کے اعتماد پر سفر کا قدم اٹھا رہے تھے، مسلم بن عقیل کوفہ والوں کی بے وفائی کا شکار ہو کر حاکم کوفہ عبید اللہ بن زیاد کی گرفت میں آ چکے تھے اور دوسرے ہی دن ان کی زندگی کا چراغ بھی گل کر دیا گیا تھا۔ حضرت حسینؓ کو اس کا پتہ راستے کی کافی منزلیں طے کرنے کے بعد چلا اس پر آپ نے واپسی کا ارادہ فرمایا۔ مگر برادران مسلم کے جذبات انتقام آڑے آ گئے۔ (جو یہ چاہتے تھے کہ یا بدلہ لیں گے یا مر جائیں گے۔) چنانچہ آپ سفر جاری رکھنے پر مجبور ہوئے اور پھر دوسری بار جب آپ نے یہی ارادہ کوفے سے کچھ قریب پہنچ کر اس وقت کیا جب آپ کو اس بات کی مزید شہادت ملی کہ کوفہ تو پوری طرح عبید اللہ

ابن زیاد (حاکم کوفہ) کی گرفت میں ہے اور آپ صرف گرفتار ہو کر ہی اندر جا سکتے ہیں، تب واپسی کیلئے کوئی گنجائش اور کوئی راہ باقی نہیں رہی تھی۔ آپ کی گرفتاری کے لئے فوجی دستے حرکت میں آچکے تھے، آپ نے اس وقت فوری طور پر ایک غیر معمولی فیصلہ کیا یعنی اپنا رخ یزید کے دار الخلافہ دمشق کی طرف موڑ دیا۔ مگر ان فوجی دستوں نے پیچھا کر کے آپ کو جلد ہی رک جانے پر مجبور کر دیا جو ابن زیاد کے حکم کے ماتحت چاہتے تھے کہ آپ کوفہ چلیں۔ یہی جگہ جہاں آپ کو قدم روک لینے پڑے اور جسے آپ کی شہادت گاہ بننا مقدر تھا کربلا کے نام سے جانی جاتی ہے۔

۱۰۔ فوجی دستوں کے سردار عمر بن سعدؓ بن ابی وقاص جن کے بارے میں روایتیں یہ تاثر دیتی ہیں کہ ان کے دل میں حضرت حسینؓ کے لئے نہایت نرم گوشہ تھا انہوں نے انتہا پسندانہ کوئی کارروائی کرنے کے بجائے معاملے کو پر امن طریقے سے سلجھانے کی کوشش میں حضرت حسینؓ سے رابطہ قائم کیا اور آپ کی طرف سے یہ خواہش سامنے آنے پر کہ آپ کی تین باتوں میں سے کوئی ایک قبول کر لی جائے۔ یعنی:

۱۔ واپس ہونے دیا جائے۔

۲۔ یزید کے پاس چلا جانے دیا جائے یا لے چلا جائے۔

۳۔ کسی مملکت کی سرحد پر بھیج دیا جائے جہاں آپ مقیم ہو جائیں اور جہادی مہمات میں حصہ لے کر عمر گزار دیں۔

عمر بن سعد نے ابن زیاد (حاکم کوفہ) کو اس کی اطلاع اس طور سے بھیجی کہ جیسے یہ ایک نہایت عمدہ اور قابل قبول بات ہو۔ روایتوں کے مطابق ابن زیاد کو بھی اس صورت حال سے خوشی ہوئی، مگر شمر جیسے مشیران نے اس کی رائے پلٹ دی بلکہ عمرو بن سعد سے بھی اسکو کچھ بدگمان کر دیا جس کے نتیجے میں شمر ہی کو بھیجا گیا کہ وہ عمر سے اصل حکم کی تعمیل کرائے۔ یعنی مفاہمت سے یا طاقت سے، جس طرح بھی ممکن ہو حسینؓ اور ان کے ہمراہیوں کو زندہ یا مردہ گرفتار کر کے کوفہ لایا جائے۔ اور یہ چیز اس قتل و قتال کا موجب بن گئی جس نے کربلا کا نام امر کر دیا۔

۱۱۔ کربلا کے میدان کا واقعہ بہت سادہ اور بہت مختصر ہے اور جتنے قصے کہانیاں اس سلسلے میں بیان کی جاتی ہیں جب ان کی جانچ اس وقت اور ماحول کے امکانات و مواقع، روایتوں کے تقابل، انسانی فطرت اور حضرت سیدنا حسینؓ اور ان کے اہل بیت کے دینی شعور کی روشنی میں کی جاتی ہے تو

یہ تمام کے تمام قصے ایک ایسی من گھڑت داستان بن کے رہ جاتے ہیں جسے بس ابن سبا یہودی کے شیطانی منصوبے کے مطابق ہی گھڑا جا سکتا تھا۔

۱۳- کوفے کے دروازہ بند پا کر اولاً حضرت حسینؓ کی طرف سے خود اپنی کوشش کہ یزید کے پاس دمشق چلے جائیں اور اس میں رکاوٹ پڑنے کے بعد رکاوٹ ڈالنے والی کوفی فوج کے سردار عمر بن سعدؓ کو ان تین باتوں کی پیش کش جن میں سے ایک یہ تھی کہ آپ کو یزید کے پاس بھیج دیا جائے، اس کے بعد حاکم کوفہ کے لئے کوئی جواز باقی نہیں رہتا تھا کہ ان باتوں پر غور کرنے سے پہلے اپنی اطاعت قبول کرنے کی شرط عائد کرے اور کوئی بے جواز وجہ بھی حقیقت میں ایسی نظر نہیں آتی جس سے یہ سوال حل کیا جا سکے کہ جب بات یزید کے ہاتھ میں جا رہی تھی اور ایک بھاری مسئلہ بغیر قتل و قتال کے طے ہونے کے پورے امکانات پیدا ہو گئے تھے تو ابن زیاد نے ایک قتل و قتال کی دعوت دینے والی یہ شرط کیوں عائد کر دی تھی ــــ لیکن اس کہانی میں یہی تنہا ایک مقام نہیں ہے جس کا منطقی حل کرنے سے عقل عاجز رہ جاتی ہو۔ ہم نے حضرت حسینؓ کے اعزہ و احباب اور خیر خواہ بزرگوں میں کتنوں ہی کو پایا ہے کہ وہ کوفے کی طرف آپ کے ارادۂ سفر سے حیران و پریشان ہیں اور ان کی بالکل سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ ارادہ کیسے ایک مناسب ارادہ ہو سکتا ہے؟ اور انہیں اس اظہار حیرانی پر کوئی ایسا جواب بھی نہیں ملتا کہ کچھ مطمئن ہو سکیں۔ (اور آج بھی آدمی خالی الذہن ہو کر پورے قصے کو پڑھے تو وہ حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، یہ الگ بات ہے کہ کوئی اس کے اظہار کو بے ادبی سمجھے)۔

حضرت حسینؓ اور یزید کے قصے پر غور کرنے والے اہل علم و فکر میں سے امام ابن تیمیہؒ نے بھی اس مشکل کو بڑی شدت سے محسوس کیا ہے اور پھر وہ یہ خیال پیش کر کے اسے حل کرتے ہیں کہ:

> ”حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کے لئے اللہ کے یہاں سعادت اور نیک بختی کا وہ بلند مرتبہ طے ہو چکا تھا جس کے لئے کسی نہ کسی طرح کی مصیبت سے گزرنا لازم ہے۔ مگر ان دونوں کو اپنے دیگر اہل بیت کے برخلاف اس کے مواقع حاصل نہ ہو سکے تھے ان کی زندگی اسلام کی اور عزت و عافیت کی گود میں بسر ہوئی تھی۔ بس اس لئے ہی ایسا ہوا کہ ایک بھائی کی موت زہر خورانی سے اور دوسرے کی مظلومانہ قتل سے ہوئی تا کہ اس کے صلہ میں وہ شہداء کا عیش اور اہل سعادت کی منزلت

پاسکیں۔"

یعنی اس سے سمجھ میں آنے والے پورے قصے کا راز ان کے خیال کے مطابق یہ تھا کہ حضرت حسینؓ مرتبۂ شہادت پر فائز ہوں ورنہ یہ قصہ پیدا ہونے کی کوئی بات ہی نہ تھی۔ یا تو حضرت حسینؓ اپنے ہمدردوں کی رائے کے مطابق کوفے کے سفر سے رک گئے ہوتے اور یا پھر ابن زیاد بے وجہ کی ضد پر آمادہ نہ ہوا ہوتا۔

۱۳۔اس قتل ناحق میں یزید کا کیا کردار ہے؟ — اگر بے لاگ انصاف کی نظر ڈالی جائے اور کم از کم شبہے کا فائدہ جو ہر ملزم کو دیا جاتا ہے یزید کو بھی دیا جائے تو اس کا کوئی کردار اس معاملے میں ثابت نہیں ہوتا۔ اور اس کی سب سے کھلی اور سامنے کی دلیل خود حضرت حسینؓ کی آخری وقت کی یہ کوشش اور خواہش ہے کہ آپ کو یزید کے پاس پہنچ جانے کا موقع مل جائے۔ اگر آپ کے لئے ذرا بھی اس خیال و گمان کی گنجائش ہوتی کہ کوفے کی سرکار (انتظامیہ) کی طرف سے جو کچھ آپ کے ساتھ معاندانہ اور سنگدلانہ رویہ اختیار کیا جارہا ہے اس میں یزید کی مرضی شامل ہے، تو آپ کی طرف سے اس سرکار کوفہ کے نمائندوں کو یہ پیش کش بالکل ناقابل قیاس تھی کہ میں یزید کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دینے کو تیار ہوں۔ ابن زیاد کے ہاتھ اور یزید کے ہاتھ میں یہ تفریق تو آپ اسی امر کی بنیاد پر کر سکتے تھے کہ آپ کی طرف سے مصالحانہ رویہ سامنے آنے کے بعد یزید کی طرف سے کسی غیر شریفانہ رویہ کا سوال نہیں ہے۔

۱۴۔اور یہی حقیقت ان روایتوں کو محض خرافات ثابت کرنے کے لئے بھی کافی ہے جو بتاتی ہیں کہ سانحۂ شہادت کے بعد حضرت حسینؓ کا سر مبارک اور آپ کے باقیات اہل بیت کو یزید کے پاس پہنچایا گیا تو اس نے توہین اور طعن و تشنیع کا رویہ اختیار کیا۔ ویسے یہ روایتیں فنی معیار پر بھی خرافات ہی ثابت ہوتی ہیں جیسا کہ متعلقہ باب میں ان پر کی گئی بحث سے بالکل صاف ظاہر ہو جاتا ہے۔

حرف آخر

کتاب کی تلخیص ختم ہوئی۔ لیکن چند باتیں اور اسی ضمن میں درج کر دینے کی ضرورت ہے۔

۱۔کربلا کے حادثے کے سلسلے میں ایک عام تصور یہ ہے کہ یہ حادثہ یزید کی مرضی سے پیش آیا اور اس کا کلیجہ اسکی خبر سے ٹھنڈا ہوا۔ آپ کے ہاتھ کی یہ کتاب، اسکے برعکس، جیسا کہ ابھی ذکر کیا گیا، یہ ظاہر کرتی ہے کہ واقعے کی ساری روایتوں کو، جو کہ بہت متضاد ہیں، اگر خالی الذہن ہو کر

(یعنی پہلے سے کوئی بات طے نہ کرکے) پڑھا جائے تو ایسا ثابت نہیں ہوتا۔ بلکہ بعض قرائن سے اس کے رنجیدہ ہونے کا اظہار بھی ہوتا ہے۔

متضاد روایتوں والے اس واقعے کی اصل حقیقت تو اللہ ہی جانتا ہے، ہمارا کہنا صرف اپنے مطالعے کے نتیجے کے طور پر ہے، جس کا اظہار اس واقعے پر گفتگو کرتے ہوئے ایک علمی اور اخلاقی ذمہ داری تھی۔ ورنہ ظاہر ہے کہ یزید سے ہمارا کوئی رشتہ ناتہ نہیں کہ اس کو بے قصور بنانے کی فکر کریں اور ان بہت سے لوگوں کی ناراضگی مول لیں جو ایک روایتی تصور کے خلاف بات نہیں سن سکتے۔ بلکہ اسے حسینؓ دشمنی (معاذ اللہ) گردانتے ہیں۔

۲۔ دوسرا یہ ایک تصور بھی اس قصے میں اتنا ہی عام ہے کہ یزید سخت فاجر و فاسق قسم کا انسان تھا۔ اور یہی ایک بڑی بنیادی بات تھی کہ حضرت حسینؓ اور ان کے دوسرے ہم خیال اس کی خلافت تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے۔ ہمیں اپنے مطالعے میں اس کی کوئی ادنیٰ شہادت نہیں مل سکی کہ ایسی کوئی بات تھی جو اختلاف کی بنیاد بنی۔ اس لئے اس نتیجے کا اظہار بھی نہ صرف ایک علمی اور اخلاقی ذمہ داری تھی بلکہ اس ذمہ داری کا ایک دینی پہلو بھی تھا۔ جس کی بنا پر نہ صرف اس کا اظہار کرنا بلکہ زور دے کر اظہار کرنا ہمیں لازم تھا۔ اور وہ پہلو یہ تھا کہ اہل سنت وجماعت نے اصحاب نبی ﷺ کو ان کے مرتبوں کے ساتھ ساتھ عادل اور راست باز بلا تفریق مانا ہے اور یزید کو منصب خلافت کے لئے ولی عہد نامزد کرنے والے حضرت امیر معاویہؓ بلا اختلاف اصحاب نبی ﷺ میں شامل ہیں۔ اس لئے اگر ہمارا مطالعۂ تاریخ ہمیں اس نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ کم از کم حضرت معاویہؓ کی زندگی تک بلکہ حضرت حسینؓ کی زندگی تک بھی جو حضرت معاویہؓ کے بعد بس چھ مہینے اور تھی، یزید کے اندر فسق وفجور کہلانے والی بات کی شہادت نہیں ملتی(1)۔ تب ہماری یہ ایک دینی ذمہ داری بھی ہے کہ اپنے مطالعے کے اس نتیجے کو پورے زور سے بیان کریں، جبکہ ایک صحابیٔ رسول کی عدالت اور راست بازی پر جو یہ حرف آرہا تھا کہ انہوں نے ایسے نالائق شخص کو منصب خلافت کے لائق ٹھیرایا، اس سے ان کا دامن صاف ہوجائے اور اصحاب نبی کا جو مقام اہل سنت کے دل میں ہے اس میں بال نہ آنے پائے۔ کیونکہ ان کا یہ مقام ہی ہمارے دین کا پشتہ ہے۔ رہی یہ بات کہ حضرت معاویہؓ کا انتخاب عمومی مصلحت کے لحاظ سے کیسا تھا؟ اس میں گفتگو ہوسکتی ہے اور ہم نے بھی اس میں گفتگو کی

---

(1) ہماری یہ ساری گفتگو اس وقت کے بارے میں ہے۔ اس کے بعد کا دور ہماری کتاب کے موضوع سے خارج ہے۔

ضرورت بھی ہے۔

۳- کتاب کی اولین اشاعت (۱۹۹۲ء) ہی پر مصنف کے وہم و گمان سے بھی بالاتر جو اہمیت اس کو بفضل خدا ملی اس کے پہلو بہ پہلو اس طرح کے تبصرے بھی، جو غیر متوقع ہرگز نہیں تھے، سامنے آئے کہ: اس میں یزید اور حضرت معاویہؓ کی طرفداری زیادہ ہو گئی ہے۔ ایسے تبصروں والے حضرات سے اگرچہ ہم باوجود خواہش کے یہ نہیں معلوم کر سکے کہ ان کا اشارہ کن باتوں کی طرف ہے، لیکن بظاہر انکا اشارہ کتاب کے انہی دو پہلوؤں کی طرف تھا اور ان کے بارے میں ہماری پوزیشن یہی ہے جس کا اوپر اظہار کیا گیا، اسکو ہماری وضاحت سمجھا جائے یا ہماری معذرت!

۴- ایک بالکل غیر متوقع بات بھی سامنے آئی۔ اور وہ یہ کہ متعدد اصحاب نے یزید کے ذکر میں بے احترامی کا شکوہ کیا۔ یعنی یہ کہ واحد غائب کے صیغوں اور ضمیروں (تھا۔ نہیں تھا۔ اس اور جس) کا استعمال کیا گیا ہے۔ بلکہ ایک صاحب نے تو اس سے بھی بڑھ کر گرفت کی آپ نے یزید کے اولین خطبے کے حوالے سے جو یہ لکھا ہے کہ:

> "رہا یہ کہ وہ کوئی بڑا متقی، پرہیزگار ہو، یہ اس خطبے سے نہیں نکالا جا سکتا۔ ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی ہو سکتا۔ اور غالب گمان یہ ہے کہ ایسا نہیں تھا۔"(۱) تو اس "غالب گمان" کی کوئی دلیل دیئے بغیر آپ نے اس بدگمانی کا اظہار کیسے جائز سمجھا؟"۔(۲)

میرے پاس واقعی دلیل نہیں تھی۔ اسلئے اس (تازہ) ایڈیشن میں یہ غالب گمان والے الفاظ نکالنا اپنا فرض سمجھا اور اس ترمیم کا اظہار یہاں اس لئے ضروری معلوم ہوا کہ یزید کی طرفداری کا احساس کرنے والے حضرات اس ترمیم کے پس منظر سے واقف ہو جائیں۔

۵- طرفداری کا احساس کرنے والے ایک صاحب نے نشاندہی کی کہ یزید کے ایک نائب حاکم مکہ عمرو بن سعید العاص الاشدق کی طرف سے حضرت حسینؓ کے ساتھ نرمی اور بھلائی کا سلوک دکھا کر (ص ۱۷۰) تو آپ نے نتیجہ نکالا ہے کہ یہ بغیر یزید کی رضا کے نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر جب عبید اللہ بن زیاد حاکم کوفہ وہ سنگدلی اور سفاکی کرتا ہے جس سے آپ کو بھی انکار نہیں تو آپ کہتے ہیں کہ اس میں یزید کی رضا شامل نہیں تھی۔ ایسا کیسے؟(۳) سوال بظاہر معقول تھا مگر مجھے یہ بھی

---

(۱) طبع اول ص ۱۳

(۲) یہ خط بھی اور اس سے قبل والے اعتراض کے خطوط بھی الفرقان کی جلد ۱۹۹۳ء کے بعض شماروں میں شائع ہو چکے ہیں۔

(۳) یہ اودھ کے ایک خاندانِ سادات سے تعلق رکھنے والے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے شعبۂ انگریزی کے ایک استاذ ہیں۔

اطمینان تھا کہ میں نے کہیں دوہرا معیار نہیں برتا ہے۔ کہیں دانستہ ناانصافی نہیں کی ہے۔ اس لئے عرض کیا کہ سوال تو آپ کا معقول ہے مگر جواب میں کتاب دیکھ کر دے سکتا ہوں، میرے ذہن میں موقع کی پوری عبارت نہیں ہے۔ کتاب دیکھنے کا موقع ملا تو میں نے محسوس کیا کہ نہ ان صاحب نے غلط کہا نہ مجھ سے بے انصافی ہوئی۔ میرا قلم کوتاہی کر گیا۔ یعنی حاکم مکہ کے رویے سے متعلق عبارت میں چند الفاظ کی کمی رہ گئی جس کے نتیجے میں یہ سوال کسی بھی ناقدانہ ذہن والے قاری کے دل میں پیدا ہو سکتا تھا۔ چنانچہ اب یہ عبارت بریکٹ والے الفاظ بڑھا کر اس طرح کر دی گئی ہے:

> "ہمارے خیال میں (یزید کے بارے میں حضرت حسینؓ کے سخت مخالفانہ رویے کے پس منظر میں) یہ بات نہیں سوچی جا سکتی تھی کہ مقامی حکام احترام، نرمی اور چشم پوشی کا رویہ مرکزی حکومت اور دار الخلافہ دمشق کی مرضی کے بغیر کر رہے ہوں۔"

اس ترمیم کے بعد امید ہے کہ کسی کو بھی ان دونوں جگہوں کا فرق سمجھنا مشکل نہ رہے گا اور وہ فرق یہ ہے کہ یزید کی بابت حضرت حسینؓ کے سخت مخالفانہ رویے کو، جو اس کی نامزدگی کے وقت سے چلا تھا، سامنے رکھا جائے تو یہ ممکن نہیں معلوم ہوتا کہ یزید کی حکومت کا کوئی حاکم بغیر اس کی مرضی جانے کوئی ایسا کام کھلے طور پر اور بمدت دراز تک کرے گا جس سے حضرت والا کے بارے میں اس کی نرمی اور چشم پوشی کا اظہار ہوتا ہو۔ لیکن سختی کا کوئی قدم ایسے حالات میں کوئی حاکم اٹھاتا ہے تو اس کے بارے میں یہ سمجھنا بالکل بھی ضروری نہیں ہوگا کہ اس خاص قدم کی بھی اوپر سے ہدایت ملی ہے۔ جبکہ وہ حاکم خاص طور سے حضرت حسینؓ کے خطرے سے نپٹنے ہی کے لئے مقرر بھی کیا گیا ہو۔ جیسا کہ ابن زیاد کا تقرر برائے کوفہ خاص اسی مقصد سے ہوا تھا۔ اس کے علاوہ حضرت حسینؓ کا ابن زیاد کے ہاتھ میں ہاتھ دینے سے انکار کرنا اور یزید کے ہاتھ میں ہاتھ دینے کے لئے بخوشی تیار ہونا یہ خود اس بات کی کھلی علامت ہے کہ آپ ابن زیاد کے سخت رویہ میں یزید کی مرضی کا عکس نہیں دیکھتے تھے۔

۲- مذکورہ بالا اعتراض ایک درجہ میں معقول اعتراض تھا اور اس کا ذکر اسلئے مناسب سمجھا گیا کہ کسی اور کو بھی متعلقہ مقام پر یہ خیال گزرے تو اس کا دفعیہ ہو جائے۔ لیکن ایک اعتراض اور بھی تھا جو کتاب نکلتے ہی ایک ایسے صاحب کے قلم سے سامنے آیا جو نہ صرف خوب عالم وفاضل بلکہ ہماری ایک نامور علمی و دینی درسگاہ کے نظام تعلیم کے نگراں ہیں۔ جن کا ذکر عبرت کے لئے کرتا

مقصود ہے کہ شیعیت نے ہمارے اچھے اچھوں کے دل و دماغ پر کیسا جادو کر رکھا ہے، کہ جب کربلا کے موضوع میں کوئی بات اس کے پھیلائے ہوئے تصورات کے برعکس آ جائے تو ایسے لوگ بھی اپنی حیثیت اور اپنے منصب کے تقاضے بھول کر کیا کیا باتیں کرنے پر آ جاتے ہیں ایک کتاب جس کے بارے میں ابھی آپ نے پڑھا کہ اس پر ایک صاحب کو اعتراض ہوا کہ اس میں یہ کیسے لکھ دیا گیا کہ "غالب گمان یہ ہے کہ وہ (یزید) کوئی بڑا متقی، پرہیزگار نہیں تھا" اور یہی کتاب جس میں مصنف حضرت حسینؓ کے عزیزوں، ہمدردوں اور خیر خواہوں کی وہ منتیں، سماجتیں، وہ فہمائشیں اور گزارشیں دیکھتے ہوئے جو آپ کے قصد کوفہ پر نظر ثانی کی طالب ہو رہی تھیں اور پھر یہ دیکھتے ہوئے کہ آپ اس وقت اگرچہ نہیں رکتے مگر ایک منزل پر راستے سے پلٹنے کا ارادہ فرماتے ہیں تو عجیب عجیب قسم کی رکاوٹیں حائل ہو جاتی ہیں اور پھر یہ دیکھتے ہوئے کہ آپ قضیہ ختم کرنے کے لئے از خود ایک مصالحانہ انداز میں یزید کے پاس چلے جانا چاہتے ہیں تو ابن زیاد کی بیجا ضد سد راہ ہو جاتی ہے (یہ سب دیکھتے ہوئے) اپنے آپ کو حیران و پریشان پاتا ہے کہ آخر ان تمام باتوں کی جو بظاہر نہیں ہونی چاہئے تھیں کیا توجیہ کرے، اور پھر اس وقت جا کر اسے اطمینان کا سانس نصیب ہوتا ہے جب امام ابن تیمیہؒ کے یہاں اس کی توجیہ اسے نظر پڑتی ہے، جو قارئین نے سب سے آخری باب (۱۲) میں پڑھی ہوگی (کہ یہ سب اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے انہیں شہادت کا مرتبہ بلند دینے کی غیبی تدبیر تھی) اسی کتاب کے بارے میں مذکورہ تبصرہ نگار نے لکھا کہ:

"کتاب کا مفروضہ تحقیقی نتیجۂ بحث (HYPOTHESIS) یہ ہے کہ یزید ایک مسلمان، خدا ترس، پاک سیرت، خلیفۂ برحق تھا...... اور اس کے مقابلے میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ ایک ناعاقبت اندیش، شہنشاہیت کے طالب، بلا وجہ اپنے جان گنوانے والے شخص تھے۔"

کتاب کے کسی ایک جملے کا بھی سہارا لئے بغیر، کسی ایک حسب مطلب فقرہ کی بھی نشاندہی کے بغیر، یہ خالص افترا پردازانہ "نتیجۂ بحث" اس کے ذمے ڈالنے پر بھی تبصرہ نگار کی رگ شیعیت سکون نہیں پا سکی۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر اس نے یہ بھی کہہ ڈالا کہ یہ حضرت حسینؓ کی مخالفت کے پردے میں دراصل رسول اللہ ﷺ سے عناد و عداوت کا اظہار ہے:

"وہ لوگ جو رسول اللہ ﷺ سے دل صاف نہیں رکھتے اور نہ ہی آپؐ سے بیزاری و کراہیت ظاہر کرنے کی جرأت رکھتے ہیں۔ وہ اس راستے سے اپنے دل کا بخار

نکالتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب مصطفیٰ ﷺ سے فرمایا:

قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِیْ	ہم کو معلوم ہے کہ ان کی باتیں تم کو رنج
يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ	پہنچاتی ہیں۔ مگر یہ تمہاری تکذیب نہیں کرتے
الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ	بلکہ ظالم خدا کی آیتوں سے انکار کرتے ہیں۔

اسی طرح یہ لوگ سیدنا حسینؓ سے نہیں رسول اللہ ﷺ سے عناد کا اظہار کرتے ہیں۔"

یہ عبارت جو کبھی ایک دوسرے تنقید نگار نے ایک ایسے مصنف کے حق میں، اپنے برہم جذبات کے ماتحت لکھی تھی جس نے حضرت حسینؓ کی شہادت کو شہادت ماننے کے بجائے بغاوت کی شرعی سزا بتاتے ہوئے "قُتِلَ بِسَیْفِ جَدِّہٖ" (وہ تو اپنے نانا ہی کی تلوار سے قتل ہوئے) کے الفاظ استعمال کئے تھے۔ اسی عبارت کو یہ ہمارا تبصرہ نگار اس کتاب اور اس کے مصنف کے حق میں دوہرا رہا ہے جس میں کسی ایک لفظ تک کی نشاندہی بھی آج تک کسی ناقد کی طرف سے نہیں ہو سکی جو حضرت حسینؓ کی علوئے شان کے بھی خلاف پڑتا ہو چہ جائیکہ (معاذ اللہ) ان سے عناد کا اظہار!(۱)

ہمیں یہ سمجھنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ کتاب کے بارے میں جو افترا پردازانہ باتیں تبصرے کے پہلے اقتباس میں ملتی ہے وہ افترا پردازی کی نیت ہی سے لکھی گئی ہے اور نہ ہی اس کے بعد والے مذکورہ بالا اقتباس کے حق میں یہ خیال ہے کہ یہ دانستہ طور سے محض مصنف کو بدنام کرنے کی ایک کوشش ہو۔ بلکہ یہ محض اس شیعیت کے جراثیم کی کارپردازی فی الواقع ہے جس کی رو سے حضرت حسینؓ وہ امام مامور من اللہ ہیں کہ ان کا قول وارشاد اللہ ورسول کا ارشاد ہے اور اس سے اختلاف اللہ ورسول سے جنگ وعناد۔ اور اس کتاب میں ظاہر ہے کہ حضرت حسینؓ کے حضرت معاویہؓ سے اختلاف اور پھر یزید سے اختلاف کا بیان اس شیعی عقیدے کی رعایت سے الحمد للہ بالکل خالی تھا۔ دوسرے فریق کی بات کو بھی سمجھنے کی کوشش کی گئی تھی اور حضرت حسینؓ کے اپنوں اور ہمدردوں نے آپ کی رائے سے جو اختلاف آپ کی خیر خواہی میں ظاہر کیا اسے بھی بیان میں لایا گیا تھا اس لئے شیعیت کے جراثیم جس دل ودماغ میں پیوست ہوں اس کا رد عمل ایمانداری سے یہی ہونا چاہئے جو اوپر کے اقتباسات میں نظر آتا ہے۔ بلکہ اگر جرأت سے محرومی نہ ہوتی تو اس تبصرہ نگار نے کتاب کے مصنف سے بھی پہلے حضرت امام ابن تیمیہؒ کو ان تیروں کا نشانہ بنایا ہوتا۔ اس لئے کہ مصنف نے

---

(۱) ہمارا روئے سخن یہ ہے کہ اصلاً جس مصنف کے حق میں یہ عبارت کسی نے لکھی تھی اس کی رائے تو اس مصنف کے خلاف جاتی تھی مگر ان الفاظ میں اس پر بھی کچھ کہنا قطعاً اور صد درجہ شرعی سے قطعی تجاوز تھا اللہ دونوں کو معاف فرمائے۔

تو کہیں نہیں لکھا کہ اس قضیے میں کون صحیح تھا کون غلط تھا۔ بلکہ فیصلہ قارئین پر چھوڑا۔ مگر امام ابن تیمیہ کا ایک اقتباس جو کتاب میں ضمناً آیا ہے اس میں انہوں نے حضرت حسینؓ کے موقف سے شرعاً اختلاف کا اظہار بھی ان کو شہید برحق ماننے کے ساتھ ساتھ کیا ہے۔ الغرض یہ حبِ حسینؓ کے قابل احترام پردے میں شیعیت ہے جو اس طرح کے رد عمل کو عین دین و ایمان سمجھتی ہے۔

۷۔ اور اسی ضمن میں ایک خیال آتا ہے جس کے حوالے سے یہ مذکورہ بالا حقیقت اور بھی روشن ہوتی ہے۔ وہ خیال یہ ہے کہ واقعۂ کربلا کو عام طور پر ہم سنیوں کے یہاں بھی ہر سال اس تصور کے تحت بطور ایک معرکۂ حق و باطل یاد کیا جاتا ہے کہ ایک فاسق و فاجر نے اسلامی تخت خلافت پر قبضہ کر لیا تھا جس سے اسے آزاد کرانے کی خاطر حضرت حسینؓ نے تلوار اٹھانے کی ٹھانی۔ مگر اسی میدان کا ایک اور مرد بھی، جس کا نام عبداللہ بن زبیرؓ ہے۔ جس نے یزید سے لیکر عبدالملک بن مروان تک کے اموی حکمرانوں کے خلاف بارہ برس تک تلوار چلائی۔ اور جب تک سر تن سے جدا نہ ہو گیا تلوار اس کے ہاتھ سے نہ چھوٹی۔ پر اس کی شہادت (جمادی الاولیٰ ۷۳ھ) کا دن آنے پر اسے اور اس کی معرکہ آرائیوں کو یاد کرنے کا دستور ہم نے کہیں نہیں دیکھا! اور پھر اسی کی معرکہ آرائیوں کے دور میں واقعۂ کربلا کے تین سال بعد وہ واقعۂ حرہ پیش آتا ہے جس میں بلا کسی اختلاف روایت کے یزید ہی کے حکم سے مدینہ منورہ (زادھا اللّٰہ تشریفاً و تکریماً) تاراج ہوا اور ساکنانِ مدینہ پر تین دن مسلسل قیامت ٹوٹی۔ مگر ہم نے نہیں دیکھا کہ جب وہ دن سال میں، عشرۂ محرم کی طرح، لوٹ کر آتے ہوں تو ان کی یاد میں بھی کوئی روتا ہو۔ اور ان دونوں کے حوالے سے بھی یزید کو فاسق و فاجر اور ملعون و مردود بتانے کے لیے جلسوں اور مجلسوں کا اہتمام ہوتا ہو! حالانکہ یہی وہ موقع تھا کہ اس کے حوالے سے یزید کو فاسق و فاجر وغیرہ کچھ بھی کہا جاتا تو اس کا جواز فراہم تھا۔ مگر وہ دن تو کسی کو بھی بھول کر یاد نہیں آتے۔ رہے شیعہ تو وہ کہاں اس کے یاد کرنے والے۔ اس سے تو ان کا کام بگڑتا۔ ہاں اگر حضرت علی بن الحسینؓ (زین العابدینؒ) کو خدانخواستہ اس قصے میں کچھ ہو جاتا تو بے شک یہ دن بھی محرم والا مقام پا لیتے مگر ان کے بارے میں یزید کی اپنے کمانڈر کو سخت ہدایت تھی کہ کسی طرح کا گزند نہ پہنچے۔ سو الحمدللہ آپ عافیت سے رہے۔

۸۔ تبھی ہم میں سے کتنے ہوں جو اس بہتر سالہ جواں مرد (عبداللہ بن زبیرؓ) کو کچھ ٹھیک سے جانتے بھی ہوں۔ وہ بذات خود کچھ کم صاحب فضائل آدمی نہ تھے۔ جہادی معرکوں سے تو کتاب

زندگی بھری ہوئی تھی ہی۔ ذوق عبادت کا بھی عالم یہ تھا کہ شہادت کی خبر پر حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے بھی، جو ان کی یزید وغیرہ کے خلاف معرکہ آرائی کو پسند نہیں کرتے تھے "صوام و قوام" (شب زندہ دار اور دن کے روزہ دار) کے حوالے سے اظہار افسوس کیا ہے۔ رہا حسب و نسب تو باپ کی طرف سے آپ بیٹے تھے آنحضرت ﷺ کے پھوپھی زاد حضرت زبیر بن العوامؓ کے، جو حواری رسول کا لقب رکھتے تھے اور ان دس صحابہ میں سے ایک تھے جنھیں جنت کی بشارت ملی۔ اور ان کی طرف سے حضرت اسماء بنت ابی بکر الصدیقؓ کی اولاد، جو بنت صدیق ہونے کے علاوہ "ذات النطاقین" کا وہ لقب بھی رکھتی تھیں جس سے آنحضرت ﷺ کے سفر ہجرت کی ایک خاص یاد وابستہ ہے۔ مرد میدان ہونے کا عالم یہ تھا کہ بہتر سال کی عمر میں بھی بالکل اکیلے رہ جانے کے باوجود دشمن کی فوج قابو پانے سے عاجز تھی۔ اور اس لئے جب یہ شیر مرد پتھروں کی چوٹ کھا کر گرا اور پھر دشمن قابو پاسکا تو یہ اتنی بڑی کامیابی دشمن کو لگی کہ نعرۂ تکبیر بلند ہوا۔ یاد آتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے جب یہ تکبیر سنی اور وجہ معلوم ہوئی تو فرمایا کہ یہی وہ تھا جس کی پیدائش پر بھی مدینے میں تکبیر بلند ہوئی تھی۔ کیونکہ مہاجرین کے گھر میں یہ پہلی پیدائش تھی۔ اور غیر معمولی خوشی کا سبب یہ تھا کہ یہود مدینہ نے یہ شہرت دے رکھی تھی کہ ان کے عاملوں نے مہاجروں کے رحم بند کر دیے ہیں۔

الغرض یہ تھے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہما جو ہمیں یزید دشمنی کے حوالے سے بھی کبھی یاد نہیں آتے۔ پھر بھی خبردار جو ہمیں شیعیت کا عیب لگایا، خبردار جو قصے کہانیوں سے پردہ اٹھایا۔

ع طائروں پر سحر ہے صیاد کے اقبال کا

☆☆☆

اشاریہ

(INDEX)

موضوعات	صفحات
۱۔ اسمِ شناس	از ۲۹۶ تا ۳۰۲
۲۔ مقامات و ممالک	" ۳۰۲ " ۳۰۳
۳۔ اقوام، طبقات، قبائل، مسالک، فرق	" ۳۰۴ " ۳۰۶
۴۔ متفرقات	" ۳۰۶ " ۳۰۷

نوٹ

یہ اشاریہ ہمارے محب و مہربان جناب قطب الدین ظفر صاحب (بیلگاں) کی محنت شاقہ کا نتیجہ ہے۔ موصوف نے تو مذکورہ بالا عنوانات سے کہیں زیادہ عنوانات کے ماتحت مواد مرتب کیا تھا مگر ہمیں بس نہایت ضروری پر اکتفا کرنا پڑا۔

اشخاص

(۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم: ۵، ۵، ۲۱، ۲۵، ۲۸، ۴۹، ۵۲، ۵۱، ۷۲، ۷۷، ۸۰، ۹۹، ۱۱۲، ۱۱۴، ۱۱۸، ۱۲۷، ۲۱۲، ۲۱۸، ۲۲۲، ۲۳۵ (حاشیہ) ۲۳۸، ۲۶۰، ۲۶۹، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۹، ۲۸۱، ۲۹۳
۲۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام: ۲۳۴ (حاشیہ)
۳۔ حضرت ابراہیم بن محمد صلی اللہ علیہ وسلم: ۲۰۸
۴۔ ابن اثیر: ۳۳ (حاشیہ) ۳۴، ۵۷، ۵۸، ۶۹، ۷۸، ۸۰، ۸۱، ۸۴، ۹۶ (حاشیہ) ۱۷۵
۵۔ ابن الاشعث (عبد الرحمن) ۲۷۰، ۲۷۴
۶۔ ابن المہلب (یزید) ۲۷۰
۷۔ (شیخ الاسلام) ابن تیمیہ: ۱۸، ۲۴۳، ۲۶۸، ۲۷۴، ۲۸۷، ۲۹۲، ۲۹۳
۸۔ ابن جریر طبری: ۱۵۹، ۱۶۱ (حاشیہ) ۱۶۹، ۱۷۵
۹۔ (حافظ) ابن حجر (عسقلانی) ۴۳ (حاشیہ) ۹۶، ۱۲۰، ۱۳۱
۱۰۔ ابن خلدون: ۳۳، ۳۶، ۴۷، ۴۸، ۱۲۲، ۱۳۳، ۷۷
۱۱۔ ابن زبیر (دیکھئے عبداللہ بن زبیرؓ)
۱۲۔ ابن زیاد: ۲۰، ۲۸، ۲۹، ۱۰۴ (حاشیہ) ۱۱۵، ۱۲۶، ۱۷۲، ۱۷۹، ۱۸۲، ۱۸۵، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۵، ۲۲۱، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۶، ۲۳۹، ۲۳۱، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۴۸، ۲۵۲، ۲۵۶، ۲۵۸، ۲۷۲، ۲۶۲، ۲۶۶، ۲۶۸، ۲۷۳، ۲۷۹، ۲۸۵، ۲۸۸، ۲۹۱، ۲۹۲
۱۳۔ ابن سبا: دیکھئے عبداللہ بن سبا
۱۴۔ ابن سعد دیکھئے محمد بن سعد
۱۵۔ ابن سعد (سپہ سالار) دیکھئے عمر بن سعد
۱۶۔ ابن سمعان: دیکھئے عقبہ بن سمعان
۱۷۔ ابن سمیہ دیکھئے ابن زیاد
۱۸۔ حضرت ابن عباسؓ دیکھئے عبداللہ بن عباسؓ
۱۹۔ ابن عمرؓ: دیکھئے عبداللہ بن عمرؓ
۲۰۔ ابن عون (راوی) ۹۳، ۲۰۰
۲۱۔ ابن قتیبہ (عبداللہ بن مسلم) ۹۵
۲۲۔ ابن کثیر: ۵۰، ۵۳، ۵۷، ۵۹، ۶۰، ۶۵، ۶۹، ۸۱، ۸۳، ۸۴، ۸۸، ۸۹، ۹۳، ۹۷، ۹۸، ۱۰۵ (حاشیہ) ۱۱۲، ۱۱۸، ۱۲۵، ۱۲۹، ۱۲۸، ۱۳۲، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۴۲، ۱۶۱ (حاشیہ) ۱۸۵، ۲۴۸، ۲۵۱
۲۳۔ ابن مرجانہ: دیکھئے ابن زیاد
۲۴۔ ابن معین ۸۹
۲۵۔ ابن مغیرہ (بن شعبہ) ۱۴
۲۶۔ (سید) ابو الاعلیٰ مودودی ۳۱
۲۷۔ ابو الاعور (عمرو بن سفیان سلمی) ۲۴
۲۸۔ (مولانا) ابو الکلام آزاد ۱۵
۲۹۔ (حضرت) ابو ایوب انصاریؓ ۹۸
۳۰۔ حضرت ابو بحر: دیکھئے احنف بن قیس
۳۱۔ حضرت ابو برزہ اسلمیؓ ۲۹۰
۳۲۔ ابو بکر بن العربی: ۱۳۳ (حاشیہ)
۳۳۔ حضرت ابو بکر بن عبد الرحمن بن حارث بن ہشام: ۱۸۹، ۲۶۵، ۲۷۱
۳۴۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ ۲۰، ۲۲، ۲۴، ۲۶، ۲۷ (حاشیہ) ۷۷، ۹۸، ۱۲۸، ۱۴۹، ۲۸۲، ۲۹۲
۳۵۔ ابو بکر عبد الرزاق صنعانی (حاشیہ) ۱۲۲

۳۶۔ ابو جعفر: دیکھئے حضرت محمد باقرؑ

۳۷۔ امام اعظم ابو حنیفہؒ ۱۳۲

۳۸۔ ابو جناب الکلبی ۱۵۱

۳۹۔ (حضرت) ابو سعید الخدریؓ ۸۷، ۲۱۸، ۲۶۵

۴۰۔ ابو سفیان ۴، ۷۳

۴۱۔ ابو عبد اللہ: دیکھئے حضرت امام حسینؑ

۴۲۔ ابو عبید: ۹۵

۴۳۔ ابو مخنف: ۲۴، ۲۷، ۲۹، ۱۵۰

۴۴۔ ابو مسلم خراسانی ۲۷۰

۴۵۔ (حضرت) ابو موسیٰ اشعری ۸۰، ۸۱، ۱۰۴، ۱۲۷، ۱۳۳، ۱۳۵، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۴۹، ۱۸۱

۴۶۔ (حضرت) احنف بن قیس ۱۰۲، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸

۴۷۔ امام احمد بن حنبل ۸۲، ۱۳۰

۴۸۔ (حکیم) احمد حسین الہ آبادی (حاشیہ) ۱۵

۴۹۔ (شیخ) احمد زینی دحلان: ۱۲

۵۰۔ (حضرت) اسامہ بن زید ۲۰۸

۵۱۔ (حضرت) اسمٰعیل نبی ۳۰ (حاشیہ) ۲۲۵

۵۲۔ (حضرت) اسماء بنت ابو بکر صدیقؓ ۲۵۶

۵۳۔ اشتر (مالک بن اشتر) ۲۰۳

۵۴۔ اشعث بن قیس ۱۸۱

۵۵۔ علامہ آلوسی (حاشیہ) ۱۱

۵۶۔ المنذر بن مشمعل ۱۹۶

۵۷۔ (مسٹر) امیر علی: ۲۸، ۲۳۸

۵۸۔ (حضرت) انس بن مالک ۲۱۸

۵۹۔ انوار حسین (قمر) ۱۲

۶۰۔ انور الدہلوی (حاشیہ) ۲۳۳

(ب)

۶۱۔ بن قریب القرشی ۵۶، ۹۵، ۱۸۳

۶۲۔ امام بخاری: (حاشیہ) ۱۳۴

۶۳۔ امام عبد اللہ بن حنبل: ۳۱

(ت)

۶۴۔ مولانا محمد تقی عثمانی: (حاشیہ) ۱۲۷

(ج)

۶۵۔ حضرت جابر بن عبد اللہ ۹۷، ۲۱۸، ۲۶۵

۶۶۔ جعفر بن زبیر ۱۹۱

۶۷۔ (حضرت) جعفر طیار ۱۸۰، ۲۱۸، ۲۴۲، ۲۴۲

۶۸۔ جریر بن یزید تمیمی: ۲۱۳

(ح)

۶۹۔ (حضرت) حبیب: دیکھئے حبیب بن مسلمہ

۷۰۔ (مولانا) حبیب الرحمٰن عثمانی: ۱۳۳

۷۱۔ (حضرت) حبیب بن مسلمہ: ۱۳۳، ۱۳۰

۷۲۔ حبیب بن مظاہر ۱۹۹، ۲۱۸

۷۳۔ حجاج: دیکھئے حجاج بن یوسف

۷۴۔ حجاج بن یوسف ۱۱۷، ۲۳۳

۷۵۔ حجر بن ابجر عجلی ۱۸۳، ۱۹۱ (حاشیہ)، ۲۲۲

۷۶۔ حجر بن عدی ۱۳۳ (حاشیہ) ۱۷۷ (حاشیہ) ۲۲۵

۷۷۔ حر بن یزید تمیمی: ۲۰۲

۷۸۔ حر بن یزید حنظلی ۲۰۷، ۲۱۲، ۲۱۴، ۲۲۰، ۲۲۳، ۲۲۸، ۲۲۹

۷۹۔ (حضرت) حسن البصری ۲۳۶، ۲۷۹

۸۰۔ (حضرت) حسن بن علیؓ ۴، ۱۳، ۲۲، ۳۲، ۴۷، ۴۹، ۶۰، ۶۴، ۶۵، ۶۸، ۸۷ (حاشیہ) ۱۲۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۷۳، ۲۲۱، ۲۳۹، ۲۴۲، ۲۸۱، ۲۸۳، ۲۸۷

۸۱۔ حسن مجتبیٰ: دیکھئے حضرت حسنؓ

۸۲۔ (حضرت) حسنینؓ: ۵۳، ۵۵، ۹۰، ۹۳، ۱۷۳

۸۳۔ (حضرت) حسینؓ ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۷، ۱۸، ۲۰، ۲۶

۲۴۲، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۵۵ (حاشیہ) ۲۵۸، ۲۶۱، ۲۶۳ تا ۲۷۰
۸۵، ۹۳، ۹۸، ۹۹، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۳ تا ۱۱۸،
۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۴، ۱۵۴، ۱۵۶، ۱۶۱، ۱۶۷،
۱۷۶، ۱۷۷، ۱۸۲، ۱۸۴ تا ۱۹۲، ۲۰۱، ۲۰۳، ۲۰۷، ۲۰۹ تا ۲۱۸، ۲۲۰،
۲۲۴، ۲۲۸، ۲۳۹، ۲۴۳ تا ۲۴۹، ۲۶۳، ۲۶۸،
۲۷۱، ۲۷۴، ۲۸۰ تا ۲۸۱، ۲۸۹، ۲۹۰ تا ۲۹۵۔
۸۴۔ (حضرت مولانا) حسین احمد مدنی: ۱۹
۸۵۔ حصین بن عبدالرحمن: ۲۰۳، ۲۰۷، ۲۰۸،
۲۱۰، ۲۱۳
۸۶۔ حصین بن نمیر ۲۰۵، ۲۰۷
۸۷۔ (حضرت) حُر: ۲۱۹، ۲۲۲، ۲۲۳
۸۸۔ حمید: دیکھئے حمید بن مسلم
۸۹۔ حمید بن مسلم: ۲۲۳، ۲۴۳، ۲۵۲، ۲۵۴، ۲۵۶،
۲۵۷
۹۰۔ (ڈاکٹر) حمید اختر (محمد حمید اللہ) ۸۱، ۸۲

(خ)

۹۱۔ خلیل الرحمن سجاد نعمانی: ۳۱

(ذ)

۹۲۔ (حافظ) ذہبی ۷۲

(ر)

۹۳۔ (حضرت مولانا) رشید احمد گنگوہی: ۱۳۵
۹۴۔ رفاعہ بن شداد: ۲۹۳

(ز)

۹۵۔ (حضرت) زبیر بن العوامؓ ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۵۰، ۵۱،
۲۶۲، ۲۶۷، ۲۷۰
۹۶۔ زحر بن قیس ۲۲۹
۹۷۔ زہیر بن قین: ۲۲۳ تا ۲۲۷، ۲۳۶
۹۸۔ زیاد۔ ۷، ۳۷، ۸۷ تا ۹۱، ۹۲، (حاشیہ) ۱۰۰، ۱۰۳،
(حاشیہ) ۱۷۷، ۱۷۸، ۲۰۲ (حاشیہ) ۲۷۷
۹۹۔ زیاد بن ابی سفیان
۱۰۰۔ زیاد بن ابیہ دیکھئے
۱۰۱۔ زیاد بن سمیہ
دیکھئے زیاد
۱۰۲۔ (حضرت) زید بن ارقم: ۲۱۸
۱۰۳۔ (حضرت) زین العابدین (علی بن الحسینؓ) ۱۹۵،
۲۰۸، ۲۲۳، ۲۲۷، ۲۳۳ (حاشیہ) ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۶۲،
۲۷۵، ۲۹۵
۱۰۴۔ زینب الکبریٰ: ۱۸۸، ۲۲۳، ۲۲۷، ۲۲۹، ۲۳۳، ۲۷۰

(س)

۱۰۵۔ سعد بن عبیدہ: ۲۳۱
۱۰۶۔ سعد بن مسعود ثقفی: ۱۲۳
۱۰۷۔ (حضرت) سعد بن ابی وقاصؓ: ۱۹، ۲۸
۱۰۸۔ (شیخ) سعدی (شیرازی): ۴۳
۱۰۹۔ (مولانا) سعید احمد: ۹۴
۱۱۰۔ سعید بن العاصؓ ۳۴، ۷۶، ۸۲، ۸۳، ۸۴، حاشیہ ۱۰۵
۱۱۱۔ سعید بن قیسؓ ۱۳۲
۱۱۲۔ (حضرت) سعید بن المسیب: ۲۷۱
۱۱۳۔ سکینہ: ۲۳۵
۱۱۴۔ سلیمان بن صرد: ۲۹۱
۱۱۵۔ سمیہ: ۱۲۵
۱۱۶۔ (حضرت) سہل بن سعد ساعدی: ۲۰۹

(ش)

۱۱۷۔ شبث بن ربعی: ۱۹۱، ۱۹۲، ۲۰۹، ۲۲۲
۱۱۸۔ (علامہ) شبلی نعمانی۔ (حاشیہ) ۵۹
۱۱۹۔ (امام) شعبی۔ ۲۰۹
۱۲۰۔ شمر بن ذی الجوشن: ۲۰۵، ۲۰۷، ۲۱۰، ۲۱۳، ۲۱۶،
۲۱۹، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۸، ۲۳۳

۱۲۱۔ شیخ الہند (مولانا محمود الحسن): ۴۳

(ص ض)

۱۲۲۔ مصعب بن زبیر: ۲۹

۱۲۳۔ ضحاک بن قیس (فہری) ۲۳، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۴۲، ۱۵۵

(ط)

۱۲۴۔ طبری: دیکھئے ابن جریر طبری:

۱۲۵۔ (حضرت) طلحہ (بن عبیداللہ) ۳۳، ۳۵، ۳۶، ۵۰، ۵۱، ۲۷۰

۱۲۶۔ (ڈاکٹر) طٰہٰ حسین ۲۴۴

(ع)

۱۲۷۔ (حضرت) عائشہ: ۳۴، ۴۵، ۵۰، ۵۱، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۱۱۰، ۱۴۳، ۹۲ (حاشیہ) ۲۲۴، ۲۷۰

۱۲۸۔ (حضرت) عباس (برادر حضرت حسین) ۲۱۷

۱۲۹۔ عبدالرزاق المقرم: (حاشیہ) ۱۵۳ (حاشیہ) ۱۶۲

۱۳۰۔ (حضرت) عبدالرحمن بن ابی بکر: ۹۳، ۹۶، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۱۰، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۸، ۱۲۰، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۵۳، ۱۵۴، ۲۸۰، ۲۸۲

۱۳۱۔ عبدالرحمن بن الحرث بن ہشام: ۱۹۲

۱۳۲۔ عبدالرحمن بن خالد بن ولید: ۲۳، ۹۱

۱۳۳۔ (حضرت) عبدالرحمن بن عوف: ۱۳۰

۱۳۴۔ (مرزا) عبدالقادر روحی: (حاشیہ) ۲۰۲

۱۳۵۔ عبداللہ بن نجی الحضرمی: ۲۰۶، ۲۴۴

۱۳۶۔ عبداللہ بن وہب مصری: ۱۵۷

۱۳۷۔ (حضرت) عبداللہ بن بدیل (حاشیہ) ۵۲

۱۳۸۔ (حضرت) عبداللہ بن جعفر: ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، (حاشیہ) ۲۹۴، ۲۹۵

۱۳۹۔ (حضرت) عبداللہ بن زبیر: ۹۴، ۹۵، ۹۸، ۹۹، ۹۱، ۱۰۱، ۱۰۳ (حاشیہ) ۱۰۸، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۲۰، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۳۶، ۱۴۷، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۷، ۱۵۹، ۱۶۱، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۷۲، ۱۷۴ (حاشیہ) ۱۸۹، ۱۹۱، ۲۴۳، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۹۵

۱۴۰۔ عبداللہ بن سبا (منافق) ۷، ۱۲، ۲۱ (حاشیہ) ۲۲۲ (حاشیہ) ۲۸۲، ۲۸۵

۱۴۱۔ (حضرت) عبداللہ بن خازم ۴۴

۱۴۲۔ عبداللہ بن سلیم ۱۹۶

۱۴۳۔ عبداللہ بن شریک عامری ۲۰۰

۱۴۴۔ (حضرت) عبداللہ بن عباس: ۲۳، ۳۰ (حاشیہ) ۳۶، ۹۳، ۹۷، ۹۹، ۱۱۰ (حاشیہ) ۱۳، ۱۷۰، ۱۷۹، ۱۸۳، ۱۸۵، ۱۸۸، ۱۹۱، ۲۶۵، ۲۷۱

۱۴۵۔ (حضرت) عبداللہ بن عمر: ۲۸، ۲۹، ۳۵، ۹۰، ۹۳، ۹۸، ۱۰۱، ۱۰۲، (حاشیہ) ۱۰۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۶، ۱۳۳، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۴۲، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۵، ۱۶۷، ۱۶۹، ۱۸۳، ۱۹۵، ۲۷۰، ۲۹۲، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۹۵، ۲۹۶

۱۴۶۔ عبداللہ بن اعلم عفری ۲۰۱

۱۴۷۔ (حضرت) عبداللہ بن مطیع ۱۶۷، ۱۷۰، ۱۸۳، ۲۹۵

۱۴۸۔ عبداللہ بن یقطر: ۱۹۹

۱۴۹۔ عبدالملک بن مروان: ۲۷۰، ۲۹۵

۱۵۰۔ عبیداللہ بن زیاد دیکھئے ابن زیاد

۱۵۱۔ عتبہ بن ابی سفیان ۸۰

۱۵۲۔ (مولانا) عتیق احمد [illegible] ۲۱

۱۵۳۔ (حضرت) عثمان بن عفان ۲۴، ۳۴، ۳۷، ۴۳، ۴۴، ۹۲، ۱۰۵ (حاشیہ) ۱۲۴، ۱۲۹، ۱۳۷، ۱۴۵، ۲۸۳، ۲۹۴، ۲۸۵

۱۵۶۔ عمرو (بن سعد الاموی): ۱۷۷

۱۵۵۔ عروہ بن مسعود ثقفی: ۱۷
۱۵۶۔ عقبہ بن سمعان ۲۰۷، ۲۰۹، ۲۴۸، ۲۴۰
۱۵۷۔ (حضرت) علی اکبر (صاحبزادہ) ۲۱۷
۱۵۸۔ (حضرت) علیؓ بن ابی طالب ۱۰، ۱۳، ۳۲، ۳۷، ۴۳
۳۸، ۳۵، ۳۶، ۴۷، ۴۹، ۵۳، ۵۹، ۵۸، ۶۰، ۶۳، ۶۴،
۸۰، ۸۲، ۸۶ (حاشیہ) ۱۰۹ (حاشیہ) ۱۱۱، ۱۲۹، ۱۳۳، ۱۳۵،
۱۲۶، ۱۳۰، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۴۹، ۱۶۳ (حاشیہ) ۱۶۴، ۱۷۴،
۱۸۲، ۱۸۷، ۱۹۵، ۲۳۵، ۲۳۳، ۲۳۸، ۲۶۶، ۲۵۰، ۲۶۷، ۲۷۴،
۲۷۴، ۲۷۶، ۲۸۱، ۲۸۲
۱۵۹۔ (حضرت) علی بن الحسینؒ: دیکھئے زین العابدین
۱۶۰۔ علی بن مجاہد ۸۶
۱۶۱۔ (حضرت) علی بن موسیٰ بن جعفر الصادقؒ ۱۳۱
۱۶۲۔ (امام) علی نقی (المعروف نقی صاحب) ۵۳،
۵۷، ۵۸، ۱۰۷، ۱۱۰ (حاشیہ) ۱۱۲ (حاشیہ) ۲۲۰ (حاشیہ)
۲۳۲، ۲۵۷
۱۶۳۔ (حضرت) عمار بن یاسرؓ: ۴۷
۱۶۴۔ عمارہ حنفی ۱۱۰
۱۶۵۔ (حضرت) عمر بن الخطابؓ ۱۰، ۴۳، ۷۷، ۸۷
(حاشیہ) ۱۱۳، ۱۲۸، ۲۸۳
۱۶۶۔ (حضرت) عمر بن سعد بن ابی وقاص ۷۵، ۲۰۰، ۲۱۰،
۲۲، ۶۸، ۸۷، ۹۱، ۱۷۳، ۲۰۳، ۲۱۹، ۲۲۲، ۲۲۷، ۲۲۸،
۲۲۶، ۲۳۳، ۲۳۸، ۲۴۱، ۲۴۵، ۲۴۸، ۲۵۰، ۲۵۲، ۲۶۱،
۲۷۰، ۲۷۴، ۲۸۵، ۲۸۶
۱۶۷۔ (حضرت) عمرو: دیکھئے عمرو بن العاصؓ
۱۶۸۔ عمرو بن الحجاج: ۲۱۹، ۲۳۲
۱۶۹۔ (حضرت) عمرو بن العاصؓ ۳۲، ۵۲ (حاشیہ)
۱۳۳، ۱۳۵، ۱۳۷، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱
۱۷۰۔ عمرو بن سعید (اشدق) ۲۸، ۱۸۹، ۲۹۱
۱۷۱۔ (حضرت) عیسیٰ علیہ السلام ۲۲۱، ۲۲۵

(ف)

۱۷۲۔ (حضرت) فاطمہ (بنت رسول) ۱۳، ۳۲، ۱۹۲
(حاشیہ) ۲۲۳، ۲۲۵، ۲۳۴، ۲۴۲
۱۷۳۔ فرزدق۔ ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۹
۱۷۴۔ فقرو: دیکھئے زہیر حسین

(ق)

۱۷۵۔ (سید) قطب: ۳
۱۷۶۔ قاسم (بن حسینؑ): ۲۲۰، ۲۳۳
۱۷۷۔ قیس بن اشعث: ۲۱۸، ۲۱۹ (حاشیہ) ۲۲۲، ۲۲۵
۱۷۸۔ (حضرت) قیس بن سعدؓ: ۵۲ (حاشیہ)
۱۷۹۔ قیصر روم ۲۸۲

(ک)

۱۸۰۔ (مسٹر) کریم کامل شیخل۔ ۱۳
۱۸۱۔ کسریٰ ۲۸۲

(م)

۱۸۲۔ مالک: دیکھئے مالک بن انس
۱۸۳۔ (امام) مالک بن انسؒ۔ ۳۵، ۱۲۲
۱۸۴۔ مامون الرشید ۱۳۱
۱۸۵۔ مجاہد بن سعید ۴۶
۱۸۶۔ مجاہد ۲۷۱
۱۸۷۔ محفز بن ثعلبہ: ۲۵۸، ۲۵۹
۱۸۸۔ (حضرت) محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ دیکھئے
آنحضرت ﷺ
۱۸۹۔ (حضرت) محمد الباقر: ۱۵۸، ۱۷۰، ۲۰۰، ۲۰۲، ۲۰۴،
۲۰۶، ۲۰۷ (حاشیہ) ۲۳۲، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۶، ۲۴۸،
۲۵۵
۱۹۰۔ محمد بن ابی بکر صدیقؓ: ۷

۱۹۱۔ محمد بن اشعث: ۱۸۲، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۹، ۲۰۹

۱۹۲۔ (حضرت) محمد بن حنفیہؒ: ۱۳۲، ۱۱۱، [illegible] ۱۷۰، ۲۱۳، ۲۲۴، ۲۹۵

۱۹۳۔ محمد بن سعد صاحب طبقات: ۹۵، ۹۶، ۱۵۲، ۱۵۹، ۲۱۷

۱۹۴۔ (شیخ) محمد بن عبدالوہاب نجدی: ۲۶

۱۹۵۔ محمد بن عمرو بن حزم: ۱۰۸

۱۹۶۔ محمد حسان لبنانی: ۴۲

۱۹۷۔ (مولوی) محمد حسن سنبھلی: ۱۵

۱۹۸۔ (مولانا) محمد منظور نعمانی: ۱۱، ۱۴

۱۹۹۔ محمد ہادی حسن: ۲۳۹ (حاشیہ)

۲۰۰۔ محمود احمد عباسی: ۱۵۲ (حاشیہ)، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴

۲۰۱۔ مختار بن عبید ثقفی: ۱۷۳، ۱۷۵، ۱۷۷، ۲۴۳

۲۰۲۔ مختار: دیکھئے مختار بن ابی عبید ثقفی

۲۰۳۔ (مولانا) سید محمد مرتضیٰ: ۳۱

۲۰۴۔ مروان: دیکھئے مروان بن حکم

۲۰۵۔ مروان بن حکم: ۹۰، ۱۰۱، ۱۰۲ (حاشیہ) ۱۰۷، ۱۳۸، ۱۵۵ تا ۱۵۸

۲۰۶۔ مسعودی (مورخ) ۱۸۹

۲۰۷۔ مسلم بن عقبہ المری: ۱۵۳

۲۰۸۔ مسلم بن عقیل: ۱۸، ۱۳۲، ۱۳۹ تا ۱۸۳، ۱۸۵، ۱۸۷، ۱۹۲، ۱۹۸، ۲۰۰، ۲۱۸، ۲۴۶، ۲۷۸، ۲۸۵

۲۰۹۔ مسلم بن عوسجہ: ۱۷۵ (حاشیہ)

۲۱۰۔ (حضرت) مسور بن مخرمہ: ۱۸۷، ۱۸۸، ۲۹۵

۲۱۱۔ مسیب بن عتبہ فزاری: ۹۳

۲۱۲۔ مسیب بن نجبہ: ۲۲۹

۲۱۳۔ مسیلمہ کذاب: ۱۷ (حاشیہ)

۲۱۴۔ مسکین: (شاعر) ۱۹

۲۱۵۔ (حضرت) معاویہؓ (بن ابی سفیان) ۳، ۴، ۲۳، ۲۴، ۳۳ (حاشیہ) ۳۴، ۳۵ تا ۵۰، ۵۲ تا ۵۳، ۶۲، ۶۳، ۶۵، ۶۷، ۶۸، ۶۹، [illegible] ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۸، ۸۹، [illegible] ۱۲۲، [illegible] ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۵۵ تا ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۶۰، ۱۶۲، ۱۶۹ (حاشیہ) ۱۷۱، (حاشیہ) ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۸۶، ۱۸۸، ۱۹۱، ۲۶۳، ۲۶۷، ۲۷۴، [illegible] ۲۹۰، ۲۹۳

۲۱۶۔ (حضرت) مغیرہ بن شعبہؓ: ۳۰، ۳۱، ۳۲ (حاشیہ) ۳۹ تا ۶۷، ۶۸ تا ۸۷، ۸۸ (حاشیہ) ۹۱، ۱۳۲، ۱۷۷، ۲۸۳

۲۱۷۔ منصور: (عباسی خلیفہ) ۲۷۰

ن

۲۱۸۔ (حضرت) نعمان بن بشیرؓ: ۱۷۰، ۱۷۲

و

۲۱۹۔ (حضرت) واثلہ بن الاسقع اللیثی: ۸۶، ۸۷، ۲۶۵

۲۲۰۔ واقدی: (مورخ) ۹۵

۲۲۱۔ ولید (۱) ۳۳

۲۲۲۔ ولید بن عتبہ بن ابی سفیان: ۱۵۵ تا ۱۵۸، ۱۹۰، ۱۹۳

ہ

۲۲۳۔ ہانی بن حیہ: ۲۷

۲۲۴۔ ہانی بن عروہ: ۱۷۳، ۱۷۵، ۱۷۶ تا ۱۷۷، ۱۹۲، ۱۹۷، ۲۳۲، ۲۷۸

۲۲۵۔ ہرقل: ۱۰۱

۲۲۶۔ ہند (والدہ حضرت معاویہؓ) ۳

ی

۲۲۷۔ یحییٰ بن سعید: ۱۸۸

---

(۱) ان کے بارے میں تحقیق نہیں ہو سکی۔ بعض قرائن سے گمان ہے کہ شاید یہ ولید بن عتبہ بن ابی سفیان ہیں۔ قرائن کے لئے دیکھئے صفحہ ۳۳۔ (محمد تقی)

۲۲۸۔ حجاج بن حارث: ۲۱۹، ۲۲۲
۲۲۹۔ حجاج بن معاویہ: ۲، ۳، ۴، ۱۳، ۸۷، ۲۰، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۳۳، ۳۴، ۳۶، ۴۷، ۴۸، ۵۸، ۶۳، ۶۸، ۶۹، ۷۸، ۷۹، ۸۱، ۸۲، ۸۴، ۸۵، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۱، ۹۴، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۱۲۲، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۳۰، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۲، ۱۴۵، ۱۴۸، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۶۰، ۱۶۵، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۷، ۱۸۲، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۸، ۱۹۱، ۱۹۲، ۲۰۵، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۹، ۲۴۲، ۲۴۵، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۷، ۲۶۳، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۷۰، ۲۷۲، ۲۷۶، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۱، ۲۹۲، ۲۹۹
۲۳۰۔ حجاج بن علقمہ عذری: ۱۰۶

مقامات و ممالک

(ا)، (ب)، (پ)، (ت)، (ث)

۱۔ اچین: ۴۱
۲۔ اہواز: ۲۳۴
۳۔ آذربیج: ۳۳۴
۴۔ بحرین: ۷۴
۵۔ بدلی: ۱۵، ۱۶
۶۔ بصرہ: ۲۷، ۳۵، ۳۶، ۵۷، ۵۹، ۶۲، ۷۳، ۷۴، ۷۹، ۸۷، ۸۸، ۸۷، ۱۷۰، ۲۷۰، ۲۷۷، ۲۷۸
۷۔ بن ملیح: ۱۹۹
۸۔ بطن مرو: (مراکیش) ۱۱۱
۹۔ بخارا: ۴۳۱
۱۰۔ پاکستان: ۱
۱۱۔ ترکی: ۶
۱۲۔ تبوک: ۷۲، ۷۶، ۷۱
۱۳۔ حکیم: ۱۹۲، ۱۹۳
۱۴۔ تہران: ۲۰۳ (حاشیہ)
۱۵۔ ثعلبیہ: ۲۱۶

(ج)، (ح)، (خ)

۱۶۔ جیحون: ۲۳۳
۱۷۔ حاجر: ۱۹۷
۱۸۔ حجاز: ۹۰، ۹۷، ۱۰۲، ۱۰۵ (حاشیہ) ۱۰۸، ۱۰۹، ۹۷، ۱۱۸، ۲۳۵
۱۹۔ حدیبیہ: ۷۰، ۷۵، ۷۶
۲۰۔ حمص: ۳۲
۲۱۔ خارین: ۱۴۲
۲۲۔ خیبر: ۷۳ (حاشیہ)
۲۳۔ خراسان: ۲۲۶، ۲۳۱، ۲۴۷

(د)، (ذ)، (ر)، (ز)

۲۴۔ دارابگرد: ۵۶، ۵۷، ۵۸
۲۵۔ دارالحرب: (شام) ۱۹۷
۲۶۔ دمشق: ۵۴، ۵۷، ۷۸، ۷۸، ۸۴، ۹۵، ۱۰۲، ۱۰۳ (حاشیہ) ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۵۵، ۱۹۳، ۲۰۹، ۲۳۰، ۲۵۷، ۲۶۲، ۲۶۷، ۲۸۵، ۲۸۹، ۲۹۳
۲۷۔ دیوبند: ۱۳
۲۸۔ رام ہرمز (پہاڑ) ۲۰۷
۲۹۔ ربذہ: ۵۰، ۵۱
۳۰۔ رے: ۲۰۳
۳۱۔ زابل: ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۶۶

۳۲۔ زوراء: ۱۹۵

(س)،(ش)،(ص)،(ط)،(ع)

۳۳۔ سجل ۱۱، ۲۱۸، ۳

۳۴۔ شام: ۳۶، ۵۰، ۱۱۳، ۱۶۹، ۱۳۳(حاشیہ)
۳۴(حاشیہ)، ۱۷۰، ۲۰۵، ۲۰۹، ۲۴۳

۳۵۔ شحر: ۱۹۵، ۱۹۶

۳۶۔ سقی: ۳۶

۳۷۔ طائف: ۷۱، ۷۳

۳۸۔ عراق: ۳۴، ۳۶، ۶۸، ۶۹، ۷۳(حاشیہ)
۱۸۴، ۱۸۵، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۲۳۴، ۲۴۵، ۲۷۰

۳۹۔ عرب: ۵۱، ۵۳، ۵۴

۴۰۔ عرفات: ۲۴۳

۴۱۔ غوطہ دمشق: ۱۳۷

(ف)،(ق)،(ک)،(گ)،(ل)

۴۲۔ فارس: ۲۰۳(حاشیہ)

۴۳۔ قادسیہ: ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۵، ۲۰۸، ۲۱۲

۴۴۔ کربلا: دیکھئے مستقل تالیف میں واقعہ کربلا۔

۴۵۔ کوفہ: ۳۷، ۴۰، ۴۳، ۵۴، ۵۸، ۶۳، ۶۴، ۹۵، ۹۶،
۷۳، ۷۶، ۷۷، ۸۰، ۸۱، ۸۳، ۸۴، ۸۷، ۸۸،
(حاشیہ)۱۰۵، ۱۳۰، ۱۳۹، ۱۵۱، ۱۶۵، ۱۷۷، ۱۸۲، ۱۸۴،
۱۸۷، ۱۹۰، ۱۹۳، ۱۹۵، ۱۹۷، ۱۹۹، ۲۰۱، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۹،
۲۱۳(حاشیہ)، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۳، ۲۲۶، ۲۴۲، ۲۴۳،
۲۵۸، ۲۸۵، ۲۸۸، ۳۰۲

۴۶۔ کلکتہ: ۱۹، ۲۱، ۲۲، ۲۳

۴۷۔ لندن: ۲۰، ۳۴، ۴۰

(م)،(ن)،(و)،(ہ)،(ی)

۴۸۔ مدائن: ۹۳

۴۹۔ مدینہ: ۳۴، ۳۵، ۴۰، ۵۰، ۵۱، ۹۰، ۹۸، ۹۹، ۱۰۵(حاشیہ)
۱۰۸(حاشیہ)، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۲، ۱۱۸، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۳، ۱۵۹،
۱۶۲، ۱۶۵، ۱۶۷، ۱۸۲، ۱۸۴، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰(حاشیہ)
۲۳۴، ۲۳۶، ۲۷۰، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۹۵

۵۰۔ مرج آج: ۸

۵۱۔ [illegible] ۱۹۳

۵۲۔ مصر: ۷، ۴۳

۵۳۔ مکہ: ۱۶، ۳۴، ۵۰، ۷۵، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۹(حاشیہ)
۱۰۰، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۳، ۱۲۰، ۱۵۴، ۱۶۳، ۱۶۵، ۱۶۹، ۱۷۷،
۱۸۴، ۱۸۳، ۱۸۵، ۱۸۹، ۱۹۱، ۱۹۳، ۱۹۵، ۱۹۸،
۲۴۹، ۲۸۳، ۲۸۷

۵۴۔ منیٰ: ۱۸۴، ۱۸۷، ۱۹۳

۵۵۔ موصل: ۲۰۶

۵۶۔ نجف: ۹۳، ۹۷، ۱۰۹

۵۷۔ نخلۂ شامیہ: ۹۶

۵۸۔ نخلۂ محمود: ۹۹(حاشیہ)

۵۹۔ نخیل: ۲۰۹

۶۰۔ وادی الطف: ۹

۶۱۔ نئی دہلی: ۹

۶۲۔ ہندوستان: ۲۰، ۲۱۲

۶۳۔ یمن: ۹۰(حاشیہ)، ۱۹۱

۶۴۔ یورپ: ۱۰

۳۔ اقوام۔ طبقات۔ قبائل مسالک۔ فرق

(ا)

۱۔ ازواج مطہرات: ۹۶
۲۔ اعرابی: ۲۰۳، ۲۷۷
۳۔ آل ثمود: ۱۹
۴۔ امام (ائمہ) ۳۳، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۲۹ (حاشیہ) ۱۳۹،
۱۷۰، ۱۷۱، ۲۶۵، ۲۷۷، ۲۷۲
۵۔ امت، امت محمدیہ، امت مسلمہ: ۳۹، ۴۱، ۶۴، ۷۶،
۷۷، ۸۹، ۹۰، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۷، ۱۲۸، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۳، ۱۳۳،
۱۳۵، ۱۳۵، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۳
۶۔ اموی: ۸۱، ۸۸، ۱۵۵، ۱۷۰، ۲۳۹
۷۔ انبیاء علیہم السلام: ۲۱۵، ۳۰۳
پیغمبر: ۲۲۱
نبی: ۲۳۳ (۲۹۳)
۸۔ انصار: ۷۲، ۷۴
۹۔ انگریز: ۵
۱۰۔ اولوالامر: ۱۰۴
۱۱۔ اہل انجیل: ۲۲۱
۱۲۔ اہل بصرہ، بصری، بصرے والے ۳۳، ۵۸، ۶۲،
۷۲
۱۳۔ اہل بیت: ۱۶۲، ۱۶۵، ۲۱۱، ۲۲۳، ۲۴۳، ۲۵۱، ۲۵۳،
۲۵۴، ۲۵۸، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۸۷
۱۴۔ اہل تاریخ، مورخین: ۹۰، ۱۴۲، ۲۵۱
۱۵۔ اہل حج: ۱۵۳
۱۶۔ اہل حل و عقد: ۲۳۰

۱۷۔ اہل سنت: ۱۵، ۲۲، ۲۳، ۲۲۷، ۲۳۱، ۲۷۰، ۲۷۲، ۲۸۷،
۲۸۹
۱۸۔ اہل شام، شامی، شام والے: ۵۰، ۵۱، ۷۰، ۱۰۷، ۱۰۹،
۱۵۳، ۱۶۹، ۲۶۳
۱۹۔ اہل شوریٰ (شوریٰ) ۷۵، ۷۶، ۲۳
۲۰۔ اہل عراق، عراقی، عراق والے: ۶۶، ۱۰۷، ۱۰۹،
۱۵۳، ۱۵۳، ۱۶۷
۲۱۔ اہل عرب: ۲۵۶
۲۲۔ اہل علم: ۲۱، ۳۹، ۵۶، ۲۷۶، ۲۷۲
۲۳۔ اہل علم و دین: ۲۶۵، ۲۷۶، ۲۷۱
۲۴۔ اہل قبلہ: ۳۹
۲۵۔ اہل کوفہ، کوفی، کوفے والے: ۳۳، ۶۱، ۶۵، ۶۷،
۷۵، ۱۴۹، ۱۶۰، ۱۷۶، ۱۷۸، ۱۸۳، ۱۸۵، ۱۸۷، ۱۹۰، ۱۹۵،
۱۹۸، ۲۱۶، ۲۳۳، ۲۶۹، ۲۸۲، ۲۸۴، ۲۸۵
۲۶۔ اہل مدینہ، مدنی، مدینہ والے: ۳۹، ۹۰، ۹۱، ۱۰۳،
۱۱۳، ۱۲۱، ۱۲۴، ۱۲۸، ۱۳۸، ۱۴۲، ۱۶۰، ۱۹۵، ۲۳۳،
۲۷۰، ۲۷۵
۲۷۔ اہل مصر، مصری: ۳۲
۲۸۔ اہل مکہ، مکی، مکہ والے: ۱۱۳، ۱۹۳

(ب)

۲۹۔ بدری صحابہ: ۳۸
۳۰۔ بنو امیہ، بنی امیہ: ۳، ۲۱، ۳۲، ۷۱، ۸۲، ۱۹۷،
۲۳۳، ۲۳۶، ۲۶۳، ۲۷۰
۳۱۔ بنو طے: ۲۵۶ (حاشیہ)
۳۲۔ بنو عقیل، برادران مسلم ۱۹۹، ۲۶۶، ۲۷۶، ۲۸۵
۳۳۔ بنو ہاشم، بنی ہاشم، ہاشمی: ۶۰، ۱۱۳، ۲۱۹، ۲۳۳، ۲۶۴

۳۴۔ بنی عبد المطلب: ۱۹۵
۳۵۔ بنی عبد مناف: ۱۵۷
۳۶۔ بنی کعب: ۱۲۷

(ت)، (ث)

۳۷۔ تابعین: ۱۰۵، ۱۰۶، ۲۹۹
۳۸۔ ترک: ۲۰۷
۳۹۔ ثقیف: ۲۹۳

(ح)، (خ)

۴۰۔ حبشی: ۱۰۰
۴۱۔ حنفی: ۱۱
۴۲۔ خاندان سادات: ۲۴۷
۴۳۔ خاندان تیموریہ: ۲۳۸، ۲۵۷، ۲۹۳
۴۴۔ خلفائے اربعہ: ۳۰
۴۵۔ خلفائے راشدین: ۵۸، ۱۳۷، ۲۹۳
۴۶۔ خارجی، خوارج: ۲۷، ۴۳، ۱۶۳، ۲۶۳

(د)، (ر)، (س)، (ش)

۴۷۔ دیلم: ۲۰۷
۴۸۔ رافضی، رافضیہ: ۴۳، ۸۰
۴۹۔ رہبان، احبار: ۳۵
۵۰۔ سابقین اولین: ۳۷، ۷۷، ۱۳۲
۵۱۔ سبائی: ۲۲۱، ۲۲۲
۵۲۔ سپاہ رسولؐ: ۲۳۵، ۲۶۲
۵۳۔ سرداران قبائل: ۱۷۹
۵۴۔ سنی: ۱۴، ۲۰، ۲۳۸، ۲۵۵، ۲۹۵
۵۵۔ شیخین: ۱۲۹، ۱۳۰
۵۶۔ شہدائے کربلا: ۲۵۷
۵۷۔ شیعان علیؓ، شیعان عراق: ۴۳، ۸۸، ۱۹۹، ۱۷۹
۵۸۔ شیعہ، کامل تشیع: ۱۱، ۳۲، ۳۳، ۵۳، ۵۶، ۵۷، ۷۷،
۱۹۳، ۱۹۶، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۲۹، ۲۳۶، ۲۳۹، ۲۴۷، ۲۴۸،
۲۵۳، ۲۵۵، ۲۵۹، ۲۹۰
۵۹۔ شیعی (جنبہ، نقطۂ نظر وغیرہ) ۲۴۴، ۱۳۹، ۲۴۷
۶۰۔ شیعیت: ۳، ۵، ۶، ۲۳، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳،
۳۵، ۸۱، ۲۲۷، ۲۴۲ (حاشیہ) ۲۴۴، ۲۴۳، ۲۴۳، ۲۴۹

(ص)

۶۱۔ صحابہ، صحابی، اصحاب کرام: ۵، ۱۰، ۳۱، ۳۳، ۴۹، ۷۰،
۷۳، ۷۵، ۷۷، ۷۸، ۹۹، ۱۰۳، ۱۰۵، ۱۲۶، ۱۲۸، ۱۲۹،
۱۳۷، ۱۳۸، ۱۴۳، ۱۶۷، ۱۷۱، ۱۸۷، ۲۳۳، ۲۶۹، ۲۷۳،
۲۷۸، ۲۸۲، ۲۹۹

(ع)

۶۲۔ عباسی (خاندان) ۴۳
۶۳۔ عثمانی، عثمانی الاصل: ۲۲۶، ۲۲۷
۶۴۔ عشرۂ مبشرہ: ۳۹، ۲۹۲
۶۵۔ عمائدین قریش: ۱۵۷

(ف)، (ق)

۶۶۔ فرق: ۸۷

۶۷۔ قتل روکنا: ۳۳، ۳۴، ۱۷۳، ۲۸۹، ۲۹۵
۶۸۔ قفقاز: ۳۰، ۱۸۶
۶۹۔ کاروانِ حسینیؑ: ۱۳۷، ۲۴۳، ۲۶۴
۷۰۔ کاروانِ حجاز: ۵۰، ۲۷۳
۷۱۔ قافلہ، قافلۂ حسینؑ: ۱۳۲، ۱۴۷، ۱۸۸، ۱۸۳، ۱۹۹، ۱۹۳، ۲۱۶، ۲۹۹، ۲۰۱ (حاشیہ) ۲۰۷، ۲۰۹، ۲۰۶، ۲۲۸، ۲۳۹، ۲۳۰
۷۲۔ قافلۂ حسینؑ کی باقیات: ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۷، ۲۶۲
۷۳۔ قبائل تابع کی تحمیلہ: ۹۱، ۱۷۳
۷۴۔ قبیلہ ثقیف: ۸۷
۷۵۔ قبیلہ مذحج: ۲۵۸
۷۶۔ قرآن: ۲۲۵
۷۷۔ قریش، قریش مکہ، قریشی: ۷۴، ۷۸، ۱۲۰، ۱۳۳، ۱۵۲، ۱۵۹، ۱۶۸، ۲۶۹

(م)

۷۸۔ متاولین: ۴۳
۷۹۔ مجوسی: ۲۱۱
۸۰۔ محدثین: ۲۲
۸۱۔ مرتد: ۳۸، ۷۷
۸۲۔ معتزلی: ۴۳
۸۳۔ مسعودی: ۳۱
۸۴۔ ملت، ملت اسلامیہ: ۷۰، ۱۳۰، ۱۳۴، ۲۱۵، ۲۷۹
۸۵۔ منافق: ۷۷، ۲۱۳
۸۶۔ مورخین: دیکھئے اہل تاریخ
۸۷۔ مومن: ۳۵
۸۸۔ مہاجرین: ۷۲

(ن)، (و)، (ی)

۸۹۔ نصاریٰ، نصرانی: ۳۷، ۲۱۱، ۲۳۵
۹۰۔ ورع و تمکین: ۲۷۳
۹۱۔ وفد، وفود: ۵۱، ۸۵، ۸۶، ۸۸، ۹۸، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۶۹
۹۲۔ یمنی: ۴۲
۹۳۔ یہود، یہودی: ۱۶، ۲۰۳، ۲۱۱

۴۔ اشاریہ متفرقات

بیعت، جنگیں، خروج، شرائط مصالحت، شہادت و قتل، صلح، ولیعہدی

الف — بیعت
۱۔ بیعت، بیعتوں: ۷۰، ۷۹
۲۔ بیعت عقبیٰ: ۳۹
۳۔ بیعت برائے حضرت حسینؑ: ۱۶۶، ۱۷۷، ۲۷۸
۴۔ بیعت برائے یزید: ۴۰، ۸۸، ۹۸، ۹۹، ۱۰۲، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۳، ۱۱۵، ۱۳۹

ب — جنگیں
۱۔ غزوۂ احد: ۵۳
۲۔ غزوۂ بدر: ۵۳، ۲۶۳
۳۔ غزوۂ تبوک: ۷۴، ۷۶، ۷۹
۴۔ جنگ جمل: ۲ (حاشیہ) ۲۲، ۲۶، ۴۸، ۹۳، ۱۳۴، ۲۷۲
۵۔ جنگ صفین: ۳ (حاشیہ) ۲۲، ۲۶، ۴۸، ۹۳، ۱۹۳، ۱۹۸، ۲۲۸، ۲۷۲

۹۔ جنگ یمامہ: ۷۳

خ — خروج

۱۔ مختلف حضرات کے خروج: ۶۷، ۶۸، ۸۵، ۸۷، ۹۸، ۱۹۳،
۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲

د — شرائط مصالحت

۱۔ شرائط حضرت حسن بن علیؓ: ۵۳، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۶۰
۲۔ حضرت حسینؓ کی سپردگی کا مطالبہ: ۱۷، ۲۰، ۲۶، ۲۷،
۲۸، ۲۹، ۲۰۴، ۲۳۵، ۲۴۹، ۲۶۳، ۲۷۰

ذ — شہادتیں اور قتل

۱۔ حضرت حسینؓ: ۱۳، ۳۱، ۱۳۸، ۱۴۵، ۱۵۹، ۱۹۳، ۲۰۷،
۲۰۲، ۲۳۶، ۲۷۰، ۲۷۵، ۲۸۹، ۲۹۳
۲۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ: ۲۹۵
۳۔ حضرت عبداللہ بن مطیعؓ: ۱۲۷
۴۔ حضرت عثمان بن عفانؓ: ۵، ۷، ۲۳، ۳۳، ۳۵، ۴۳،
۷۹، ۲۷۲، ۲۸۱
۵۔ حضرت علی بن ابی طالبؓ: ۷، ۴۳، ۵۲، ۸۰، ۱۷۳

ر — صلح

۱۔ صلح حدیبیہ: ۷۰، ۷۱، ۷۶
۲۔ صلح حضرت حسنؓ و معاویہؓ: ۳۳، ۴۷، ۵۳، ۵۶، ۵۷، ۸۷،
۲۶۷، ۲۷۲، ۲۷۳
۳۔ فتح مکہ: ۴

ز — ولیعہدی

۱۔ ولیعہدی علی بن موسیٰ بن جعفر الصادقؒ: ۱۳۳
۲۔ [illegible] یزید بن معاویہؓ: ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴ (حاشیہ)، ۴۳،
۴۸، ۶۱، ۷۰، ۷۸، ۸۲، ۸۹، ۸۷، ۸۸، ۹۰، ۹۳، ۹۶،
۹۷، ۹۸، ۱۰۴، ۱۰۵ (حاشیہ)، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۵، ۱۲۱،
۱۲۵، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۷، ۱۴۵، ۱۵۱، ۲۸۳، ۲۹۲

س — واقعات

۱۔ واقعہ تحکیم: ۳۲، ۳۷، ۱۳۳، ۱۳۰، ۱۴۱، ۱۸۱
۲۔ واقعہ حرہ: ۱۲۷، ۲۹۵
۳۔ واقعہ کربلا: ۳، ۴، ۱۵۵، ۱۶، ۱۴، ۲۰، ۲۴، ۲۳، ۲۵، ۲۹،
۹۱، ۹۵، ۱۰۶ (حاشیہ)، ۱۲۶، ۱۷۳، ۱۹۴، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۵، ۲۰۸،
۲۱۰، ۲۱۴، ۲۲۳، ۲۲۶، ۲۲۸، ۲۳۶، ۲۳۸، ۲۴۲،
۲۴۳، ۲۴۹، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۷، ۲۵۹، ۲۶۱،
۲۶۵، ۲۶۸، ۲۷۵، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۸، ۲۹۵

☆ ☆ ☆

کتابیات

وہ کتابیں جن کا کوئی حوالہ اس کتاب میں دیا گیا ہے

۱۔ القرآن المجید

الف

۲۔ الاصابہ فی تمییز الصحابہ (عربی) از ابن حجر عسقلانی
۳۔ اسپرٹ آف اسلام (انگریزی) از جسٹس امیر علی

ب

۴۔ البدایہ والنہایہ (عربی) از حافظ ابن کثیر دمشقی

ت

۵۔ تاریخ ابن خلدون (عربی) از عبدالرحمٰن بن محمد بن خلدون
۶۔ تاریخ طبری (عربی) از ابو جعفر بن جریر طبری
۷۔ تاریخ کامل (عربی) از ابن اثیر
۸۔ تقریب التہذیب (عربی) از حافظ ابن حجر عسقلانی

ج

۹۔ جامع ترمذی (عربی) از امام ابو عیسیٰ محمد ترمذی

ح

۱۰۔ حیات امام الحسینؓ از باقر شریف قرشی
۱۱۔ حضرت معاویہ اور تاریخی حقائق (اردو) از مولانا محمد تقی عثمانی

خ

۱۲۔ خصائص علیؓ (عربی) [illegible] ملتان
۱۳۔ خلافت و ملوکیت (اردو) سید ابوالاعلیٰ مودودی
۱۴۔ خلافت معاویہ و یزید (اردو) محمود احمد عباسی

د

۱۵۔ الدرر المنتخبہ (عربی) از [illegible] ملتان

ر

۱۶۔ روح اسلام (اردو) از محمد ہادی حسن
۱۷۔ رجوم المذنبین از مولانا سید حسین احمد مدنی

س

۱۸۔ سنن ابی داؤد (عربی) از امام ابو داؤد سجستانی
۱۹۔ سیر اعلام النبلاء (عربی) از حافظ ذہبی

ش

۲۰۔ شرح نہج البلاغہ (عربی) از ابن حدید
۲۱۔ شہید انسانیت (اردو) سید علی نقی صاحب مجتہد
۲۲۔ شیخ محمد بن عبدالوہاب اور ان کے خلاف پروپیگنڈہ (اردو) ـــــ از مولانا محمد منظور نعمانیؒ

ص

۲۳۔ صحیح بخاری (عربی) از امام محمد بن اسماعیل بخاری
۲۴۔ صحیح مسلم (عربی) از امام مسلم قشیری

ع

۲۵۔ العواصم من القواصم (عربی) از ابوبکر بن العربی

ف

۲۶۔ الفاروق (اردو) از مولانا شبلی نعمانی
۲۷۔ فتح الباری (عربی) از حافظ ابن حجر عسقلانی

ل

۲۸۔ لسان المیزان (عربی) از حافظ ابن حجر عسقلانی

م

۲۹۔ مروج الذہب (عربی) از المسعودی
۳۰۔ مشکوٰۃ المصابیح (عربی) از خطیب تبریزی
۳۱۔ مصنف عبدالرزاق (عربی) از ابوبکر بن عبدالرزاق
۳۲۔ المعارف (عربی) از ابن قتیبہ
۳۳۔ معجم البلدان (عربی) از احمد بن یعقوب
۳۴۔ مقتل الحسینؓ (عربی) از عبدالرزاق موسوی المقرم
۳۵۔ مقدمہ ابن خلدون (عربی) از ابن خلدون
۳۶۔ منہاج السنۃ (عربی) از امام ابن تیمیہؒ
۳۷۔ مؤطا (عربی) از امام مالکؒ
۳۸۔ میزان الاعتدال (عربی) از حافظ ذہبی
۳۹۔ نہج البلاغہ (عربی) از شریف الرضی

☆☆☆

یہ کتاب

ہندوستانی پاکستانی مبصرین کی نظر میں

''اردو تصنیفات میں تحقیق کی ہمیشہ شدید کمی محسوس کی گئی ہے۔ اور اگر اس تحقیق کا تعلق اسلامی تاریخ کے ایک ایسے المناک واقعہ سے ہو جس کے اندوہناک اثرات تنازع، اختلاف اور تشدد آمیز ردعمل کی صورت میں رونما ہوئے ہوں تو اس کی ضرورت اور اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ مولانا عتیق الرحمن نے اپنی اس تصنیف میں، جسے اُن کے وسیع مطالعہ کا شاہکار کہنا چاہئے، اس علمی ضرورت کو پورا کیا ہے۔'' ....

''مولانا عتیق الرحمن کی کتاب فکر انگیز، پُر از معلومات اور تاریخ پر مبنی ہے۔ کربلا کے واقعہ پر تحقیق کے لیے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔'' (یونیورسل میسج۔ کراچی۔ بابت جولائی ۹۳ء سے ترجمہ)

''اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اصحاب رسولؐ کے سلسلہ میں اُمت کے اجماع عقیدۂ احترام و اعتبار کو قارئین کے ذہنوں میں راسخ کرانے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے، اور یہی وہ ایک خدمت ہے جو انشاء اللہ اجر اُخروی سے خالی نہ ہوگی، کیونکہ واقعہ کربلا جیسے اہم نزاعی اور ہنگامہ خیز و ہنگامہ پرور عنوان پر قلم اٹھانے کے بعد ''سبائی اور خارجی'' دونوں فکروں سے دامن بچا کر اہلسنت کی معتدل فکر کو اپنا کر نباہ دینا، اور مقام صحابیت کے سلسلہ میں بنواُمیہ و بنوہاشم کے درمیان تفریق نہ برتنا، اور یک چشمی و کور باطنی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بنوہاشم سے اظہار عقیدت کے لیے بنواُمیہ کو، یا بنواُمیہ سے اظہار عقیدت کے لیے بنوہاشم کو مطعون کرنے کی غیر معتدل بلکہ غیر اسلامی فکر سے عافیت کے ساتھ دامن بچالے جانا ہی ایک بہت اہم اور لائق مبارک باد کارنامہ ہے''۔

(ماہنامہ البدر کاکوری، لکھنؤ۔ بابت اپریل و مئی ۹۳ء)

''واقعہ کربلا اسلامی تاریخ کا ہمیشہ ایک نازک مسئلہ بنا رہا اس لیے اس پر قلم اٹھانا بڑا نازک بلکہ تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف ہے۔ اس لیے کہ یہ مسئلہ دو انتہاؤں کے درمیان ایک راہ اعتدال قائم کرنے کے ہم معنی ہے، اور جب کسی مسئلہ کے سلسلے میں دو انتہاؤں کے ماننے والوں نے اپنی بات کو حقیقت سمجھ لیا ہو تو پھر درمیانی راہ اختیار کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے .... مولانا عتیق الرحمن صاحب نے اس کتاب میں تلوار کی دھار پر چلتے ہوئے بھی اپنے قلم کو بڑی حد تک انتہا پسندی سے بچائے رکھا ہے۔'' (ماہنامہ الرشاد اعظم گڑھ۔ بابت اپریل ۹۳ء)

''فاضل مصنف نے دو انتہاؤں کے درمیان ایک ایسی راہ اعتدال تک پہنچنے کی کوشش کی ہے جس سے نہ کسی صحابی رسولؐ کے کردار پر حرف آئے اور نہ بے جا تعصب سے کام لیا جائے۔ وہ یقیناً اس کوشش میں کامیاب رہے ہیں۔'' (ماہنامہ تدبر لاہور۔ بابت مئی ۹۳ء)

DESIGNED BY FAISAL WAQAR
PRINTED AT : KAKORI OFFSET PRESS, LKO. PH. : 2629616